صدائے جرس

خواجہ شمس الدین عظیمی

www.ksars.org

Khwaja Shamsuddin Azeemi Research Society

صدائے جرس

خواجہ شمس الدین عظیمیؔ

ماخوذ: ماہنامہ روحانی ڈائجسٹ کراچی

طباعت واشاعت: مراقبہ ہال ملتان

ترتیب وتدوین: مراقبہ ہال ڈگری (سندھ)

کمپوزنگ: حماد احمد عظیمی

ٹائٹل: نوشی عظیمی

تعداد اوّل اشاعت: 2000

قیمت فی جلد: 135روپے

پرنٹرز: اے۔جی۔حرمین پرنٹنگ پریس ملتان 061-588787

پتہ: مراقبہ ہال ملتان

947 /A ممتاز آباد نزد بی سی جی چوک ملتان پوسٹ کوڈ60600

فون نمبرز: 061-525330-529918

موبائل نمبر: 0300-9634428

ای میل: M-H-Multan@hotmail.com

اُس

گونج

کے نام جو

صدائے جرس

کے مطالعے سے انسان میں پیدا ہوتی ہے

عرضِ ناشر!

صدائے جرس کے عنوان سے شائع ہونے والی یہ کتاب ان مضامین پر مشتمل ہے جو ماہانہ روحانی ڈائجسٹ کے چیف ایڈیٹر حضرت خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب نے رسالے کے لئے خاص طور پر تحریر کیے۔ ان تحریروں کا نفسِ مضمون بے سکون نوع انسان کو سکون آشنا کرنے کی راہیں دکھاتا ہے۔ ان مضامین کے ذریعے انسان کی مخفی صلاحیتیں بیدار کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

صدائے جرس کا ہر مضمون نوع انسانی کو درپیش کسی نہ کسی مسئلہ کا حل ہے۔ عظیمی صاحب نے تاریخ کے دریچوں میں جھانک کر مختلف تہذیبوں پر گزرنے والے احوال کو آسان اور عام فہم انداز میں بیان کیا ہے۔ یہ تحریریں یقیناً آفاقی اہمیت کی حامل ہیں، ان کے مطالعہ سے عظیمی صاحب کے تدبر، تفکر اور مشاہدے کا اندازہ باآسانی ہو جاتا ہے۔ سائنسی، تکنیکی ترقی اور ایجادات نے انسانی شعور کو علم و آگاہی کی اس منزل پر پہنچا دیا ہے جہاں خیال اور تصور کا عملی مظاہرہ ہوتا ہے۔ آج کا انسان محض وعظ نصیحت سے متاثر نہیں ہوتا، وہ چیزوں کی حقیقت، ان کے وجود کی دلیل اور ان کا مظاہرہ بھی دیکھنا چاہتا ہے۔

محترم عظیمی صاحب بلاشبہ اس قحط الرجال کے دور میں روشنی کے ایک مینار ہیں، حضرت عظیمی صاحب مادہ پرست دنیا کو سکون اور فلاح کی راہ دکھانے میں ہمہ وقت کوشاں ہیں۔ صدائے جرس ایسے افراد اور تحریکوں کے لئے رہنما ہوگی جو نوع انسانی کی اصلاح اور روحانی علوم کو فروغ دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان مضامین کے مطالعے سے توحید و رسالت، تسخیر کائنات اور کہکشانی نظام کے عقدے کھلتے ہیں۔

عظیمی صاحب اپنی مخصوص شگفتہ بیانی سے نوع انسانی کو اس طرف توجہ دلاتے ہیں کہ ناپائیدار زندگی کے جھمیلوں میں گم انسان جسمانی نشوونما کے لئے تو سب کچھ کر رہا ہے لیکن روح جس کی عطا کردہ توانائی کی بدولت ہم اپنا جسم اٹھائے پھرتے ہیں اور ذہنی صلاحیتیں استعمال کرتے ہیں اس کے بارے میں غور کرنے کے لئے ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔ اس کتاب میں شامل شہ پارے روح کی بالیدگی اور اس کی حقیقت کو سمجھنے میں ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔

دعاؤں کا طالب

کنور محمد طارق عظیمی

15 جنوری 2003ء

فہرست مضامین

مضمون	صفحہ نمبر

حیات وموت

دن ماہ وسال پر محیط جس زمانی وقفے کو زندگی کا نام دیا جاتا ہے اس کا تعلق دراصل مادی مظاہر سے ہے جب یہ مادی وسائل مفقود ہو جاتے ہیں اور ہنستا بولتا، چلتا پھرتا گوشت پوست کا پتلا ساکت وبے حس ہو جاتا ہے اور زندگی کے آثار ختم ہو جاتے ہیں تو ہم اسے مردہ قرار دے دیتے ہیں حالانکہ اس مردہ جسم میں ہر عضو موجود ہے جو مرنے سے پہلے جسم میں موجود تھا۔ دل، دماغ، پھیپھڑے، گردے، خون ہونے کے باوجود جسم میں حرکت باقی نہیں رہتی۔اس حقیقت کے پیش نظر یہ ماننا پڑے گا کہ جسم میں ضرور کوئی تبدیلی ہوئی ہے جس کی وجہ سے جسم کے تقاضے ختم ہو گئے ہیں۔

مذہب بتاتا ہے کہ مرنے کے بعد قبر میں حساب وکتاب ہو گا جب کہ قبر کے اندر جسم مٹی کے ذرات میں تبدیل ہو کر مٹی بن جاتا ہے، مرنے کے بعد جس انسان سے احتساب ہو گا وہ یہ مادی جسم نہیں ہے بلکہ روشنیوں کا ایک اور وجود ہے جو ہمارے جسم کے اوپر روشنیوں کے ہالے کی صورت میں رہتا ہے مرنے کے بعد یہی جسم ہمارے کرہ ارضی میں زمین سے اوپر ایک زون (ZONE) میں چلا جاتا ہے، یہ روشنی کا جسم وہاں معینہ مدت تک زندگی گزارتا ہے اس زون کے تقاضے بھی ہمارے مادی جسم کے تقاضوں کی طرح ہیں۔

قرآن پاک میں جہاں اس مقام ’’ زون ‘‘ کا ذکر آیا ہے وہاں وہ مقام ’’بلندی اور پستی‘‘ کا ذکر بھی ملتا ہے ان دو مقامات کا ہماری مادی زندگی سے بھی گہرا تعلق ہے، مذہب ہمیں بتاتا ہے کہ زندگی اگر مذہبی اصولوں کے تحت گزاری جائے تو انسان اس کے اعلیٰ مقام میں رہتا ہے اور اگر مذہبی اصولوں سے روگردانی کی جائے تو انسان اسفل اور پست مقام پر زندگی گزارتا ہے۔

اعلیٰ مقام پر رہنے والے لوگ خوش رہتے ہیں انہیں کسی قسم کا خوف اور غم لاحق نہیں ہوتا جبکہ پست مقام پر رہنے والے لوگوں میں خوف، دہشت، بے یقینی اور اضطراب مسلط رہتا ہے، وہ پریشانی سے نجات حاصل کرنا بھی چاہیں تو نجات نہیں پاتے۔

ہر انسان کی یہ فطری مجبوری ہے کہ وہ کسی نہ کسی عقیدے پر اپنے مستقبل کی تعمیر کرتا ہے اس لئے کہ حالات اسے بتاتے ہیں کہ وہ حالات کے ہاتھ میں چابی دار ایک کھلونا ہے، حالات چابی بھر دیتے ہیں تو کھلونا چلتا ہے، دوڑتا ہے، آوازیں نکالتا ہے چابی ختم ہو جاتی ہے تو کھلونے میں کوئی حرکت نہیں رہتی۔ حالات کیا ہیں؟ چابی کہاں سے بھری جا رہی ہے؟ اس کے بارے میں انسان کوئی علم

نہیں رکھتا یہ لاعلمی اسے ان دیکھی طاقت کی طرف متوجہ کرتی ہے، ان دیکھی طاقت کے اوپر اس کا یقین اتنا ہی ہوتا ہے جیسے چشم دید چیزوں کے بارے میں ہوتا ہے، مذہب نے اس ان دیکھی طاقت کا ''خدا'' کے نام سے تعارف کرایا ہے، جو لوگ مذہب بیزار ہیں وہ بھی نادیدہ طاقت کو ماننے پر مجبور ہیں یہ اور بات ہے کہ وہ اس کا نام خدا کے بجائے نیچر یا کوئی اور نام رکھ لیتے ہیں۔

میرے پاس ایک صاحب تشریف لائے تعارف کرایا کہ:

''میں خدا کو نہیں مانتا، سب کچھ میں خود ہوں، دنیا میرے سامنے بازیچہ اطفال ہے۔''

میں نے پوچھا:

''اجی جناب! یہ تو بتایئے کہ یہ دنیا آخر کیسے بن گئی؟''

انہوں نے وہی گھسی پٹی تھیوری بیان کر دی:

''زمین ایک کرّہ ہے، خلاء میں آتش فشاں پھٹا تو لاوا بہہ نکلا اور لاوے سے دنیا بن گئی وغیرہ وغیرہ۔''

میں نے عرض کیا:

جناب! یہ سب صحیح مان لیا جائے تب بھی یہ سوال باقی رہتا ہے کہ دنیا میں توازن ہے، سورج اور چاند کے لئے منزلیں متعین ہیں، کائنات میں ہر موجود شئے کی ایک ڈیوٹی ہے اور ہر موجود شئے نے اپنی ڈیوٹی سے کبھی انحراف نہیں کیا، آخر یہ سب موجودات جب کسی نظام کے تحت سرگرم عمل ہیں تو کسی نہ کسی کے ہاتھ میں تو اس کی باگ دوڑ ہو گی۔

بولے:

''ہاں یہ نیچر کا کام ہے، نیچر سب کو سنبھالے ہوئے ہے، نیچر جانتی ہے کہ کائنات نظام کس طرح قائم رہ سکتا ہے۔''

میں نے سوال کیا:

''جناب! مسلمان نیچر کو خدا، ہندو بھگوان، پارسی تیروان، یہودی ایلیا، انگریز گاڈ کہتے ہیں آپ نے خدا نہیں کہا نیچر کہہ دیا یہ خود کو دھوکہ دینے والی بات نہیں ہو گی؟''

آدمی ہوشیار تھا کچھ دیر خاموش رہا پھر گفتگو کا رخ بدل کر گویا ہوئے:

''اگر آپ کی بات مان لی جائے کہ خدا موجود ہے تو خدا نظر کیوں نہیں آتا؟''

میں نے مودبانہ عرض کیا:

"جناب! آپ خود کو جانتے ہیں؟"

وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے پھر زوردار قہقہہ لگایا اور ہنستے ہوئے بولے:

"کیا اچھا سوال ہے۔ کیا تم خود کو جانتے ہو؟ میرے بھائی، میرے بزرگ، کون ہے جو خود کو نہیں جانتا؟"

میں نے ان کی بات سن کر کہا:

"کیا تم خود کو جانتے ہو تو کیا تم اس خون کو دیکھ رہے ہو جو تمہاری رگوں میں دوڑ رہا ہے؟ تمہارے اندر ایک کائنات آباد ہے کیا تم نے کبھی اس کا مشاہدہ کیا ہے؟"

میں نے ان سے پوچھا کہ:

"تم زندگی کی کسی بھی اسٹیج پر بوڑھا ہونا پسند کرتے ہو؟ کیا تم اس رنگ و نور کی دنیا سے کلیتاً آزاد ہونا چاہتے ہو؟ کیا زندگی کے کسی بھی دور میں پریشان حال، مصیبت زدہ رہنا چاہتے ہو؟"

سامنے بیٹھے ہوئے صاحب نے مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میں زندگی سے منحرف کوئی مایوس آدمی ہوں، جس کی زندگی میں امید کی کوئی رمق باقی نہیں رہ گئی، گلا صاف کر کے اور تھوڑا سا مسکرا کر کہنے لگے:

اگر دنیا میں عروج و زوال، ٹوٹ پھوٹ، نشوونما اور فنا و بقا نہ ہو تو پھر یہ دنیا نہیں رہے گی۔

میں نے کہا:

"میرے دوست! بات یہ نہیں کہ دنیا فنا و بقا کا ایک کھیل ہے یا شکست و ریخت سے ہی نئے نئے شگوفے پھوٹ رہے ہیں، میں نے آپ سے پوچھا ہے کہ کیا آپ مرنا چاہتے ہیں؟ اور جب آپ مرنا نہیں چاہتے تو کیوں مر جاتے ہیں؟ آپ خود کو بڑھاپے کے روپ میں نہیں دیکھنا چاہتے لیکن آپ کے سیاہ خوبصورت بال چاندی کے تاروں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔"

میرے مرشد کریم حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے ایک مجلس میں فرمایا:

زمانہ گزرا ایک آدم زاد اتنی بڑی عمر کو پہنچ گیا کہ اس کا دنیا میں کوئی بھی نہیں رہا، گزر بسر کے لئے جنگل سے لکڑیاں توڑ کر فروخت کرتے تھے، ایک روز لکڑیاں زیادہ جمع کر کے گٹھڑ تو باندھ لیا لیکن اٹھاتے وقت ہاتھوں میں لرزہ آ گیا، خون پانی بن کر آنکھوں سے بہہ نکلا بڑی ہی حسرت سے آہ بھری اور بولے:

''مجھ سے تو ملک الموت بھی روٹھ گیا ہے اس کو بھی میرے حال پر رحم نہیں آتا، میں اب کیوں زندہ ہوں، میرے سب مر کھپ گئے، مجھے موت کیوں نہیں آتی؟''

ابھی لمحہ کا کچھ حصہ ہی گزرا تھا کہ ایک خوبصورت نوجوان سیدھی طرف آ کر کھڑا ہو گیا سلام کیا اور پوچھا:

''بزرگو! میں آپ کی کیا خدمت کروں؟''

بزرگ نے پوچھا:

''تم کون ہو؟''

نوجوان نے کہا:

''میں ملک الموت ہوں، ابھی آپ نے یاد کیا تھا حاضر ہو گیا ہوں۔''

بزرگ فوراً بولے:

''لکڑی کا یہ گٹھڑ اٹھا کے میرے سر پر رکھ دے۔''

سامنے بیٹھے ہوئے یہ صاحب جن کا میں ذکر کر رہا ہوں ایک پروفیسر ہیں جو کمیونسٹ نظریہ پر عقیدہ رکھتے ہیں اور پکے اتنے ہیں کہ کمیونزم کے ستر (۷۰) سالہ عمارت کے ڈھیر ہو جانے کے باوجود بھی اپنے نظریہ عقیدت پر قائم ہیں، میں نے پروفیسر صاحب سے کہا:

''میرے محترم دوست! جس طرح آج کا دور پریشانی اور بے چینی کا دور ہے، اسی طرح پانچ ہزار سال پہلے بھی پریشانی اپنے عروج پر تھی، دنیا دو حصوں میں تقسیم ہو گئی تھی، جس کی لاٹھی اس کی بھینس والا ڈرامہ پوری دنیا توانائی کے ساتھ دیکھ رہی تھی، علم کی نشر و اشاعت عام تھی مگر عوام کو صرف وعدہ فرواسے دھوکہ دیا جا رہا تھا ایک گروہ نے اپنے مقصد مطلب تاویلات کو مذہب سمجھ لیا تھا، منافقت ان کا اوڑھنا بچھونا بن گیا تھا، عوام چکی کے دو پاٹوں میں پس رہے تھے، کوڑیوں کا ڈھیر ان کا مقدر بنا دیا گیا تھا، ایک گھر میں سینکڑوں قمقمے روشن ہوتے تھے تو دوسرے گھر میں اندھیرا تھا، مذہب کی اجارہ داری جب شیطان صفت لوگوں کے ہاتھوں میں آ

گئی اور عوام کو مذہب کے نام پر عزت نفس سے محروم کر دیا گیا تو قانون قدرت نے کروٹ بدلی فراعین کے گروہ نیست و نابود کرنے کے لئے ایک موسیٰؑ پیدا ہوا اور عصائے موسیٰؑ نے خود کو اژدھے کے روپ میں بدل کر فراعین کے تمام بت کدوں کو نگل لیا۔ اب پھر وہ گھڑی آگئی ہے کہ مذہب سے کھیلنے والے گروہوں کو عصائے موسیٰؑ نگل لے گا اور دنیا پھر سکھ اور چین کا سانس لے گی۔"

میری تقریر دل پذیر پروفیسر نے غور سے سنی اور کہا!

"سچ ہے تاریخ خود کو دہراتی ہے، جو آج ہے وہ کل ہو گا اور جو کل ہو چکا ہے وہ آج ہو رہا ہے، آج اور کل لمحات گزرنے کا ایک عمل ہے، لمحات کا گزر جانا ماضی ہے، ساری کائنات لمحات کی فلم ہے جو اربوں سال پہلے بن چکی ہے، مگر ہر زمانہ میں ایک ہی کردار کے مختلف ناموں سے زمین کی اسکرین پر ڈسپلے ہو رہی ہے۔"

تصوف

تصوف کیا ہے؟

تصوف کی تعریف یہ ہے کہ ماورائی دنیا کی تلاش میں صوفی جو کوشش اور ریاضت کرتا ہے اس کے نتائج صوفی کے سامنے آجائیں، دنیا میں ہر صوفی نے تصوف کی مختلف تعریف بیان کی ہے، کوئی کہتا ہے کہ تصوف یہ ہے کہ ذات خداوندی سے رابطہ اور تعلق پیدا کیا جائے اس کے لئے روحانی اور نفسیاتی گہرائیوں سے گزرنا ضروری ہے۔

کسی نے کہا کہ ذات خداوندی پر یقین نفس کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے اس کے لئے ریاضت اور ذہنی کاوش کی ضرورت نہیں ہے، صوفی کچھ بھی کرے اگر اس کے اندر اپنے انر(Inner) میں جھانکنے کا جذبہ اور خود کو تلاش کرنے کا ذوق ہے تو یہ تلاش اور ذوق اسے بہر حال خدا تک پہنچادے گا۔

تصوف میں یہ نظریہ بھی زیر بحث آتا رہا ہے کہ وحدانیت اور کثرت کسی بھی طرح ایک جگہ قائم نہیں ہو سکتی، فانی اور محدود انسان، لافانی اور لامحدود ہستی کا مشاہدہ کس طرح کر سکتا ہے؟ چونکہ انسان فانی ہے اس لئے لامحدود اور غیر متغیر ہستی کا مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ صوفی کے تجربات اور مشاہدات یقین کے کتنے ہی اعلیٰ درجہ پر ہوں لیکن جب انہیں بیان کیا جاتا ہے تو عقل اور استدلال ان تجربات اور مشاہدات کو واضح کرنے کی بجائے مبہم بنادیتی ہے۔

صوفی جب اپنی واردات اور کیفیات کے مطابق حقیقت مطالعہ کو بیان کرنے کے لئے الفاظ کا سہارا لیتا ہے تو بیان میں کوئی نہ کوئی ایسا پہلو شامل ہو جاتا ہے کہ صداقت میں کذب کی آمیزش نظر آتی ہے اور اس طرح شکوک و شبہات اور اختلاف کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

صوفیوں کی ایک جماعت یہ کہتی ہے کہ حقیقت مطلقہ (ذات خداوندی) کو سمجھنے کے لئے صوفی کو بہر حال لاشعور سے اتر کر شعوری سطح پر آنا پڑتا ہے اور وہ شعوری محدود وسعت میں رہ کر ہی کچھ بیان کر سکتا ہے۔

تاریخ شاہد ہے اب نشدون میں ماوراء ہستی کو ''نیتی نیتی'' اور شیخ اکبر ابن عربی اور عبدالکریم اور الجبلی نے الاعماء کے نام سے منسوب کیا ہے، سریانی زبان میں دیوہ، کالیوہ سے ماوراء ہستی کو پہچاننے کی کوشش کی، حضرت نوحؑ کے زمانے تک ماوراء ہستی کو

پہچاننے کے لئے جو نام لیا جاتا تھا وہ لفظ "اللہ" اور "لا اللہ" کے ہم معنی تھا۔ حضرت نوحؑ کے بعد تمحاہ اور تمخیا ماورائی ہستی کو پہچاننے کے لئے اپنا لیا گیا، پھر حضرت ابراہیمؑ کی پیدائش سے صدیوں پہلے "اللہ" اور الا اللہ" کو کلمہ حق قرار دے دیا گیا، اس تاریخی حقیقت کے پیش نظر بہر کیف ماورائی دنیا کا ہر مسافر یہ کہنے پر مجبور ہے کہ لا محدود اور لا متغیر ماوراء الماورائی ہستی کو سمجھنے اور اس ہستی کا تعارف کرانے کے لئے محدود شعوری حواس میں آنا ضروری ہے جبکہ یہ کیسے ممکن ہے کہ محدود کو لا محدودیت کا جامہ پہنا دیا جائے۔

صوفیوں کا ایک طبقہ اس حقیقت کو بھی تسلیم کرتا ہے کہ تصوف اور مذہب ہم رشتہ ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ بنیادی تصورات میں صوفی ایک دوسرے سے متفق ہیں لیکن اس کے باوجود یونانی تصوف، ہندو تصوف، چینی تصوف، یہودی تصوف، عیسائی تصوف اور اسلامی تصوف ایک دوسرے سے متضاد نظر آتے ہیں، یونانی تصوف کی ابتدا مغربی ایشیاء میں آر فیس سے ہوئی۔

فلسفیانہ افکار نے اقلیت پسند ذہنوں کو مروجہ مذاہب سے بدگمان کر دیا تھا، لوگوں نے جب یہ دیکھا کہ مذہبی دانشور مذہبی رسومات اور مذہبی علامات کو ادا کرنے پر زور دیتے ہیں لیکن خود محض ریاکاری اور دکھاوے کی زندگی بسر کر رہے ہیں، اس صورتحال میں حساس مخلص اور حکیمانہ ذہن رکھنے والے لوگوں میں ایک روحانی تڑپ پیدا ہوئی لوگ نیکی کو اختیار کرنے، شر کے اثرات سے محفوظ رہنے اور منافقانہ طرز عمل سے نجات پانے کے لئے راستے کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے یہی وہ ماحول تھا جس میں آر فیسی نظام فکر و عمل کی بنیاد پڑی، آر فیس وقت کے مطابق ایسے اخلاقی اقدار کے پیمانے سامنے لایا جن کی بنیاد ریاکاری اور دکھاوے سے آزاد تھی، اس نظام کی بنیاد تفکر، زاہدانہ زندگی، باہمی اخوت و محبت اور مراقبے پر مشتمل تھی اس نے کثیف ماحول، ریاکاری اور دکھاوے سے بچنے کے لئے علیحدہ عبادت گاہیں بنوائیں تا کہ لوگ ریاکاری کی زندگی سے دور ہو کر نیکی کے نور کو تلاش کریں۔

یہودیوں کے ہاں ظاہری رسوم کی پابندی عام سمجھی جاتی تھی خیال کیا جاتا ہے کہ تصوف جو اپنی روح کے حساب سے ریاکاری اور دکھاوے کا دشمن ہے یہودیوں میں نہیں ہے۔ تاریخی حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ عہد عتیق میں صوفیانہ خیالات بالکل ناپید ہیں اور اگر کہیں صوفیانہ تجربات ملتے ہیں تو وہ یونانی حکمت اور خاص طور پر افلاطون کے نظریات کا چربہ ہیں۔

بابل میں زمین کی زرخیزی کے متعلق رسوم اور تصورات کے ارد گرد علم الاصنام اور بعد میں علوم باطنی اور اسرار کا ذخیرہ تیار ہوا پھر یہ رسومات موت کے بعد کی زندگی کے تصور کے ساتھ وابستہ ہو گئیں۔ اس تصور کے ساتھ انسانی زندگی سے متعلق تمثیلات کا تار پود بھی شامل ہو گیا، کہا گیا دیوی "تموز" کی موت کے بعد "اشتر" جہنم کے سات دروازوں سے ہوتا ہوا پاتال میں پہنچا تا کہ دیوی تموز کو دوبارہ واپس لے آئے چونکہ اس کی موت سے تمام نباتی اور حیوانی زندگی ختم ہو چکی تھی پاتال کی ملکہ نے اسے قید کر کے اس کے جسم کو کسی بیماری میں مبتلا کر دیا۔

چینی تصوف کا آغاز اور نشو و نما ''لاؤزی'' سے منسوب ہے لیکن تاریخ چین بتاتی ہے کہ ''لاؤزی'' سے پہلے بھی چین میں ایسے لوگ موجود تھے جو سیاسی اور معاشرتی حالات سے مایوس ہو کر عملی زندگی سے کنارہ کش ہو گئے تھے انہوں نے شہروں کی زندگی سے مایوس ہو کر ذاتی نجات کے لئے پہاڑوں کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب پیغمبران کی تعلیمات پر ان کے جانے کے بعد مصلحت کی بنیاد پر پردہ پڑ گیا تو عوام میں سے ایک گروہ نے تفکر کو اپنا کر حقیقت مطلقہ سے اپنا رشتہ جوڑنے کے لئے ایک راستہ نکالا جس میں ریاکاری اور رسومات سے آزادی شامل تھی، ایسے ضابطے بنائے جن پر قائم رہ کر حقیقت مطلقہ تک رسائی ممکن ہے۔

اسلامی تصوف کی تاریخ رسول اکرم ﷺ کے غار حرا میں مراقبہ سے شروع ہوئی، رسول اکرم ﷺ نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ ماحول بھی دیوی، دیوتاؤں کی پرستش کا ماحول تھا، احدیت سے لوگ دور ہو گئے تھے، ۳۶۰ کائیوں کو خدا مان لیا تھا اس ماحول سے بیزاری کے نتیجے میں رسول اکرم ﷺ مکہ سے کافی دور بلند پہاڑ کی چوٹی پر ایک غار میں تشریف لے جاتے تھے اور وہاں تفکر فرمایا کرتے تھے، یہی وہ تفکر اور وحدانیت کی تلاش تھی جس کے نتیجے میں حضرت جبرائیلؑ غار حرا میں تشریف لائے اور صراط مستقیم کی بنیاد ڈالی۔

ہزاروں سال پہلے کی تاریخ سے یہ حقیقت منکشف ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے جد امجد حضرت ابراہیمؑ نے بھی بت پرستانہ ماحول سے بیزار ہو کر تفکر (مراقبہ) کے ذریعہ وحدانیت کو تلاش کیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے وصال کے بعد جیسے جیسے صدیاں گزریں مسلمان وحدانی طرزوں سے دور ہوتے گئے اور امت مسلمہ میں نئے نئے تفرقے پیدا ہو گئے۔

حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ نے جب قوم کی زبوں حالی اور مسلمانوں کو تفرقوں میں تقسیم ہوتے دیکھا تو انہوں نے تصوف کی ابتداء کی اور کہا:

''اسلام میں اعمال محض جسمانی نہیں ہے، ہاں صحیح عمل وہ ہے جس کے ساتھ روح بھی شامل ہو۔''

ایک طرز فکر بندے کو خالق سے قریب کرتی ہے اور دوسری طرز فکر بندے کو خالق سے دور کرتی ہے، قدرت سے انعام یافتہ شخص مصائب کی زندگی سے دور ہو کر جنت کی آسائش حاصل کر لیتا ہے، حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ نے فرمایا کہ:

''جب زمین اور آسمان کا وجود اس روشنی پر قائم ہے جس کو اللہ تعالیٰ کا نور فیڈ کرتا ہے، اگر نوع انسانی کا ذہن مادے سے ہٹ کر اس روشنی میں مرکوز ہو جائے تو انسان یہ سمجھنے پر قادر ہو جائے گا کہ اس کے اندر عظیم الشان ماورائی صلاحیتیں موجود ہیں، جن کو استعمال کر کے وہ زمین پر پھیلی ہوئی اشیاء میں تصرف کر سکتا ہے۔''

انسان مادی وسائل کا محتاج نہیں ہے بلکہ وسائل اس کے سامنے سر بسجود ہیں، قرآن جس راہ کا تعین کرتا ہے اور مسلمان جس راہ پر چل رہا ہے یہ دونوں ایسی لکیریں ہیں جو آپس میں کبھی نہیں ملتیں، مسلمان کی زندگی دنیا کے حصول تک محدود ہو کر رہ گئی ہے، عبادتیں بھی محض دکھاوے اور دنیاوی برکتیں سمیٹنے کے لئے مخصوص ہو گئی ہیں، آسمانی علم و آگہی کے منفرد خورشید اور کائناتی تسخیری فارمولوں کے ماہر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں:

"اے منافقوں! کلام نبوت سنو، آخرت کو دنیا کے عوض فروخت کرنیوالو! حق کو مخلوق کے عوض بیچنے والو! باقی کو فانی کے بدلے کاروبار کرنے والو! تمہارا بیوپار سراسر خسارے کا سودا ہے، تمہارا سرمایہ تمہیں بربادی کے گڑھے میں دھکیل رہا ہے افسوس تم پر، تم اللہ کے غضب کا ہدف بن رہے ہو۔"

ابدال حق حضور قلندر بابااولیاءؒ نے جسمانی وظائف کے ساتھ روح کے عرفان کے اعمال و اشغال کو تصوف کہا ہے، اسلام میں شریعت اور طریقت کا تصور بھی یہی ہے کہ انسان عبادات میں جسمانی پاکیزگی اور اعمال کے ساتھ ذہنی تفکر کے ذریعے اپنی ذات سے واقفیت حاصل کرے تاکہ اس کے مشاہدے میں یہ بات آجائے کہ انسانی ذات (روح) دراصل کسی انسان کے اندر ماورائی دنیاؤں میں داخل ہونے کا نام ہے، چونکہ روح اللہ کا ایک حصہ ہے۔یعنی کل کا جز ہے۔جب جز کا مشاہدہ ہوتا ہے تو (حقیقت مطلقہ) سامنے آجاتی ہے۔

اللہ کی رسی

"اے محبوب! کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے ان ہاتھی والوں کا کیا حال کیا، کیا ان کے داؤ کو تباہی میں نہ ڈالا اور ان پر پرندوں کی ٹکڑیاں بھیجیں کہ انہیں کنکر کے پتھروں سے ماریں تو انہیں کر ڈالا کھائے ہوئے بھس کی طرح۔"

(سورۃ الفیل)

ہاتھی والوں سے مراد ابرہہ ہے۔ ابرہہ ایک موقع پرست اور نہایت متعصب شخص تھا اس نے حبش کے بادشاہ کے ساتھ غداری کر کے یمن پر قبضہ کر لیا تھا۔ یمن پر قبضہ کرنے کے بعد اس نے نہ صرف یمن کے بادشاہ کو قتل کر دیا بلکہ اس نے یہ اسکیم بنائی کے عربوں کو نیچا دکھانے اور ان کو ان کے مذہب سے دور کرنے کے لئے یمن کے دارالسلطنت صفہ میں ایک عظیم الشان عبادت گاہ تعمیر کرائی جائے۔

ابراہہ نے حبش کے نجاشی کو لکھا کہ میں نے ایک ایسی عظیم الشان عبادت گاہ تعمیر کرادی ہے جس کی نظیر روئے زمین پر نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ دنیائے عرب اس مقام پر آکر حج کرے اور عربوں کے معبد خانہ کعبہ کو ڈھا دوں۔ ابراہہ نے کعبہ پر حملہ کرنے کے لئے اس جھوٹ کی بہت زیادہ تشہیر (Publicity) کی۔

عرب کے لوگوں کو یہ بات بہت شاق گزری اور قبیلہ بنی کنانہ کے ایک شخص نے موقعہ پا کر اس جگہ کو نجاست سے آلودہ کر دیا۔ ابراہہ نے اپنے اس ناپاک منصوبے کو پورا کرنے کے لئے ساٹھ ہزار افراد پر مشتمل فوج تیار کر لی اور ہاتھیوں کے ساتھ حملہ کرنے کے لئے ایسا زمانہ منتخب کیا جس زمانے میں عرب جنگ اور خونریزی سے احتراز کرتے تھے۔

ابراہہ نے مکہ میں ایسے وقت داخل ہونے کی کوشش کی جب اہل مکہ دوسرے لوگوں کے ساتھ حج کے مناسک ادا کرنے کی تیاری کر رہے تھے۔ ابراہہ نے خاص طور پر منیٰ کے قیام کے دنوں میں حملہ کرنا چاہا تا کہ عرب مناسک حج میں مصروف رہیں اور مقابلے پر نہ آئیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ یہ شخص نہایت چالاک اور ہوشیار تھا اس نے اپنی مکاری سے ایسے حالات کا سہارا لیا جس میں اسے کامیابی کا یقین تھا اور اسے یہ زعم تھا کہ اس کے پاس اس زمانہ کے لحاظ سے بہت زیادہ عسکری طاقت موجود ہے۔ لیکن قدرت نے اس کے مکر عیاری اور چالاکی کو خود اس کے اوپر پھینک دیا۔

شان و شوکت اور کر و فر کا مظاہرہ کرتے ہوئے ساٹھ ہزار فوج نے جب پیش قدمی کی تو اللہ تعالیٰ نے اس فوج کو وادی محسر میں روک دیا۔ محسر کے پتھروں سے عربوں نے اسلحہ کا کام لیا اور فوج پر سنگ باری کی اس کے علاوہ اللہ نے "حرم محترم" کے دشمنوں پر سنگ باری کرنے والی ہوا نازل کر دی، جس نے فوج کے اوسان خطا کر دیئے اور بالآخر فوج تتر بتر ہو گئی۔

موت نے فوجی جوانوں کے جسموں کو بھس کی طرح کر دیا۔ عزرائیلؑ نے انہیں اس کی بھی مہلت نہ دی کہ ایک دوسرے کی لاشیں اٹھا سکیں۔ اللہ نے ان کے اوپر گوشت خور چڑیوں کو مسلط کر دیا، جنہوں نے ان کا گوشت نوچا اور کھایا اور وادی مکہ کو ان کے تعفن سے پاک کر دیا۔ دشمن کے اوپر چڑیوں کا غیض و غضب عرب میں ضرب المثل بن گیا۔

عرب شعراء نے یہاں تک کہا ہے:

"جب ہماری فوجیں دشمن پر حملہ آور ہوتی ہیں تو گوشت خور چڑیاں ہمارے ہم رکاب ہوتی ہیں۔"

کہاوت ہے کہ تاریخ خود کو دہراتی ہے:

رسول اللہ ﷺ کی ولادت سے پچاس دن پہلے ابراہہ کے لشکر کا جو حال قرآن نے بیان کیا ہے آج امت مسلمہ پھر ایک اور مکار و چالاک ابراہہ کی زد میں ہے۔ بزدلی اور بے غیرتی کا عالم یہ ہے کہ ایک طرف ایک تلوار ہے تو دوسری طرف ۲۸ تلواریں ہیں۔ ایک طرف ایک ملک ہے تو دوسری طرف ۲۸ ملک ہیں، ایک طرف جدید ٹیکنالوجی کا محتاج آدم زاد ہے تو دوسری طرف بڑے بڑے سائنس دان ہیں۔ لگتا ہے چیونٹی اور ہاتھیوں کی لڑائی ہے، ۲۸ عظیم الجثہ خون اور تیل کے پیاسے ہاتھی ایک چیونٹی کو ختم کرنے کے درپے ہیں، یہ کیسا عالمی ضمیر ہے کہ چیونٹی کی تباہی کسی کو نظر نہیں آتی اور ہاتھیوں کی مصنوعی چیخیں سب سن رہے ہیں، سچ ہے کہ قدرت جسے رکھے اسے کون چکھے۔ قرآن کی رو سے آیتیں ہمارے سامنے ہیں:

"اور ہم نے لوہا نازل کر دیا اور اس میں انسانوں کے لئے بے شمار فائدے رکھ دیئے۔"

"اور اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ متحد ہو کر پکڑ لو اور آپس میں ٹکڑیوں میں تقسیم نہ ہو جاؤ۔"

ابراہہ اور اس کی ذریت نے لوہے سے فائدہ اٹھایا اور جدید ٹیکنالوجی حاصل کر کے توپیں، ٹینک، میزائل اور دیو ہیکل جہاز بنا لئے۔ آپس میں متحد ہو کر تخریب کو اس طرح زمین پر پھیلا دیا کہ دنیا جہنم بن گئی ہر طرف آگ اور خون کے دریا بہا دیئے، باوجود اس کے

کہ قدرت نے زمین کے خزانے امت مسلمہ کے سپرد کر دیئے ہیں، امت مسلمہ نے اللہ کی بات نہیں سنی، لوہے کی صلاحیتوں کو تلاش نہیں کیا اور خود آپس میں تقسیم ہو کر ذلیل و خوار ہو گئی، اپنا جوتا اپنا سر کے مصداق، اللہ کے دیئے ہوئے وسائل کو اپنی ناعاقبت اندیشی سے خود اپنی تباہی کے لئے استعمال کرنا شروع کر دیا۔

چودہ سو سال کی تاریخ یہ ہے کہ عرب میں جب بھی قحط سالی ہوئی یا بارش نہیں برسی، بیت اللہ میں نماز استسقاء ادا کی گئی اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ آسمان نہ برسا ہو۔ اب حال یہ ہے اور مادیت ہمارے اوپر اس قدر غالب آگئی ہے کہ کسی نے یہ نہیں کہا کہ اللہ سے رجوع کیا جائے، اپنے اعمال کی معافی مانگی جائے، متحد ہو کر اپنی طاقت سے دشمن کو زیر کر دیا جائے۔ وسائل ہمارے پاس ہیں، دماغ ہمارے پاس ہیں، تسخیری فارمولوں کی کتاب ہمارے پاس ہے، قدرت کی دستگیری آج بھی اپنے محبوب کی امت کے ساتھ ہے، آج بھی ابابیلیں منتظر ہیں کہ مسلمان خدا کو پکاریں اور وہ ابراہہ کے ہاتھیوں کو بھس بنا کر ہوا میں اڑا دیں۔

حکمرانی

قرآن پاک کی تعلیمات پوری نوع انسانی کیلئے ہیں۔ جس طرح مٹھاس ہر فرد کیلئے مٹھاس اور نمک ہر فرد کیلئے نمک ہے، قرآنی تعلیمات پر دو طرح عمل ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ قرآن میں بیان کردہ احکامات پر غیر مسلم کی حیثیت سے عمل کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ مسلمان کی حیثیت سے قرآن کی حکمتوں پر تفکر کرکے عمل کیا جائے۔

موجودہ سائنسی دور میں جب غیر مسلم اقوام نے قرآن میں بیان کردہ لوہے کی خصوصیات اور فوائد پر غور کیا، تو سائنس نے اپنے پیروکاروں کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچادیا۔۔۔۔۔ اللہ کریم نے کہا ہے:

''متحد ہو کر مضبوطی کے ساتھ اللہ کی رسی کو پکڑلو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو۔''

عالم اسلام تفرقوں اور انفرادی لوٹ کھسوٹ میں مبتلا ہو گیا۔ اس کے برعکس غیر مسلم ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے۔ باوجود یہ کہ عالم اسلام وسائل کے اعتبار سے خود کفیل ہے لیکن چونکہ اتحاد نہیں ہے اللہ کی رسی کو مضبوطی کے ساتھ متحد ہو کر نہیں پکڑا ہوا ہے اس لئے ذلیل و خوار ہے۔ اتنا ذلیل و خوار ہے کہ اپنی حفاظت اور اپنی بقاء کیلئے بھی غیر مسلم اقوام کا سہارا لینے پر مجبور ہے۔ عراق ایران کی لڑائی کے زخم بھی ابھی مندمل نہیں ہوئے تھے کہ ایک اور طوفانِ ہلاکت نے مسلمانوں کو لقمہ تر سمجھ کر نگل لیا۔

تاریخ شاہد ہے کہ:

جب بیت المقدس کی چابیاں حضرت عمر ابن الخطاب کے حوالے کی جارہی تھیں۔۔۔۔۔ مسجد کی دوسری منزل پر پادری ایک دوسرے کی داڑھیاں کھینچ رہے تھے۔ اختلافی مسئلہ یہ تھا کہ ایک گروہ کہہ رہا تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خمیری روٹی کھائی ہے، دوسرے گروہ کی تحقیق یہ تھی کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے خمیری روٹی نہیں کھائی۔۔۔۔۔ اللہ کا قانون اٹل ہے۔ جب مسلمان قانون کے پاسبان تھے اللہ نے انہیں سارے عالم میں ممتاز کر دیا تھا۔۔۔۔۔ آج مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ سود لینے والے اور سود دینے والے اللہ کے ساتھ حالت جنگ میں ہیں اور اللہ کے کھلے دشمن ہیں۔

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا۔۔۔۔۔۔۔۔

اللہ کے دشمن کی نمازوں، اللہ کے دشمن کے روزوں کو کس شمار و قطار میں رکھا جائے۔۔۔۔۔۔یہی ردعمل آج ہمیں اس مقام پر لے آیا ہے کہ ہم اپنے مقامات مقدسہ کی خود حفاظت بھی نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔۔

لہو لہو اس داستان کی روئداد ''مشرق میگزین'' نے شائع کی ہے۔ آپ بھی پڑھیئے اور سوچئے کہ۔۔۔۔۔۔کیا ابھی بھی وقت نہیں آیا کہ فروعی اختلافات کو ختم کر کے سیسہ پلائی ہوئی ایک دیوار بن کر اپنا کھویا ہوا عروج دوبارہ حاصل کرنے کی جدوجہد کریں۔

اللہ کریم کا واضح اور روشن اعلان ہے۔

جو قوم اپنی حالت نہیں بدلتی اللہ بھی اس کی حالت نہیں بدلتا۔۔۔۔۔۔

وہ اندھیرا گھر

جس میں داخل ہونے والا کبھی باہر نہیں نکلتا۔

وہ راستہ

جس سے لوٹنے کی کوئی راہ نہیں۔

وہ مکان

جس میں روشنی کا گزر نہیں ہو سکا۔

اور جہاں لوگ دھول پھانکتے اور کیچڑ کھاتے ہیں

اور جہاں دروازوں اور تالوں پر کالی گرد جمی رہتی ہے۔۔۔۔۔۔

ڈھائی ہزار قبل مسیح کی یہ تحریر اس لوح پر کندہ ہے جو عراق کے آثار قدیمہ کی کھدائی کے دوران ان مقامات سے ٹکڑوں کی صورت میں ملی تھیں جہاں اب نئے شہر اور نئی بستیاں آباد ہیں۔ مگر حالیہ جنگ کے دوران ان بستیوں اور شہروں کا یہ حال ہو گیا ہے جیسے بابلی دیومالا کی ملکہ بہار عشتار نے ایک بار پھر بحر ظلمات کا سفر کیا، عکادی سومیری اور اشوری تہذیبوں کی اس داستان میں تخلیق اور محبت کی دیوی عشتار جب ملکہ ثور یعنی بدی کی دیوی آرائش کی کل کے ہاتھوں گرفتار ہو کر پاتال میں اسیر ہو جاتی ہے تو کرہ ارض پر نہ صرف تخلیق کا عمل رک جاتا ہے

بلکہ آسمان کالا اور زمین سرخ ہو جاتی ہے۔

اور آج پھر عراق کا آسمان کالا اور زمین گرم ہو رہی ہے۔

بغداد کے نواح میں قدیم کھنڈروں پر تعمیر ہونے والی یہ بستیاں اور شہر خوفناک بمباری سے ایسے اندھیرے گھر بن چکے ہیں جہاں سے باہر نکلنے کے تمام راستے معدوم ہو گئے ہیں۔ ٹوٹے بکھرے دروازوں پر کالی گرد جمی ہے اور یہاں کے بچے کھچے مکین لاشوں کے ڈھیر پر بیٹھے دھول پھانکنے اور کیچڑ چاٹنے پر مجبور ہیں اور برسوں بعد جب اپنے شاندار ماضی کی تلاش میں سرگرداں کل کا انسان ان شہروں اور بستیوں کی بوسیدہ ہڈیاں چنے گا تو اسے محسوس ہو گا کہ شہر اور تاریکی کی دیوی آرائش کی کل تہذیب کے ملبے پر کھڑی ان لوگوں کا ماتم کر رہی ہے جو اپنے بیوی اور بچوں کو پیچھے چھوڑ کر بارود کے آتشکدہ میں کود گئے تھے اور ان کے بچوں کے لئے آنسو بہا رہی ہے جن کے پھول سے جسم ایٹمی اور کیمیائی آگ سے سرمہ ہو گئے تھے۔ اور شاید زمین بوس شہروں کے کھنڈرات سے ماہرین ارض کو ایسی کوئی زندگ آلود تختی بھی مل جائے جس پر مہذب دنیا کی زبان میں یہ درج ہو کہ ''ہم نے دجلہ وفرات کی وادی پر آگ کی بارش کر کے بابلی تہذیب کے ہزاروں سال پرانے تمام احسانات چکا دیئے ہیں۔''

علماء ارض کا کہنا ہے کہ ''بنی نوع انسان پر دجلہ وفرات کی تہذیب کے بے شمار احسانات ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ''بابل ہی کی شمع علم تھی جس سے یونانی دانش کدوں کے چراغ روشن ہوئے ان کے نزدیک اہل مشرق ہوں یا مغربی اقوام یہودی، عیسائی، پارسائی اور مسلمان سب کے عقیدوں اور رسم ورواج کا رشتہ بابلی تہذیب ہی سے ملتا ہے لیکن مشرق ومغرب کی مہذب اقوام نے عراق کو ان احسانات کا صلہ یہ دیا کہ بصرہ شعلوں میں جھلس گیا ہے، موصل کے کھنڈرات دھواں دے رہے ہیں۔ سامرہ مدائن نجف اشرف اور کربلا سے لہو میں ڈوبے ہوئے اتنے جنازے نکلے ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جا سکتا گنتی کریں تو زبان تھک جاتی ہے، چپ رہیں تو آنکھیں ابلنے لگتی ہیں۔

خلیفہ ابو جعفر المنصور کے بغداد میں کبھی ہلاکو خاں نے عراقی سروں سے مینار تعمیر کرایا تھا، اتحادی فوجوں نے آج اس شہر کو ننگی لاشوں کا قبرستان بنا دیا ہے، ہزار داستان کی اس الف لیلوی بستی میں اب صرف ایک ہی داستان سنی جاتی ہے کہ ''زندگی پہلے کبھی اتنی ارزاں نہیں ہوئی تھی۔''

ایک ہزار ایک راتوں کے بغداد میں اب صرف ایک ہی رات باقی بچی ہے اور وہ بھی آنکھوں میں کٹ جاتی ہے۔ عباسی حکمرانوں کا پایہ تخت دریائے دجلہ کا تحفہ ہے۔ یہاں پیرانِ پیر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، حضرت امام ابو حنیفہؒ اور امام غزالیؒ کے مزارات ہیں۔ ایک دیوار ہے جس کے بارے میں روایت ہے کہ اس میں سادات اہل بیت کو زندہ چن دیا جاتا تھا۔ یہ تمام مقدس مقامات بھی بمباری سے متاثر ہوئے ہیں۔

ایک محتاط اندازے کے مطابق اتحادیوں نے ۴۷لاکھ آبادی کے اس شہر پر طیاروں اور میزائیلوں کے ذریعے اتنا بارود گرایا ہے کہ بغداد کے ہر شہری کے حصے میں پون کلو آگ آتی ہے۔ صدر صدام اگرچہ اعتراف نہیں کرتے مگر آنکھوں دیکھی بات یہ ہے کہ آدھے سے زیادہ شہر ملبے کا ڈھیر بن چکا ہے اور کم و بیش ۳۰ ہزار افراد لقمہ اجل ہو گئے ہیں۔ شہر کے وسط میں سے گزرنے والے دریائے دجلہ کا اجلا پانی روزانہ سینکڑوں لاشیں اپنے ساتھ بہالے جاتا ہے اور اب تو اس کا پانی زہریلے دھوئیں اور انسانی خون کی آمیزش سے سیاہی مائل سرخ ہو چکا ہے۔

دریائے دجلہ کے دوسرے کنارے پر کاظمین کا علاقہ ہے، کھجوروں کے باغات سے گھری ہوئی اس مرجع خلائق بستی کی آبادی پانچ لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ عباسی دور میں جب اس کا نام ''کرخ'' تھا بغداد کے قبرستان کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ یہاں حضرت امام موسیٰ کاظمؒ اور حضرت امام تقیؒ کے حرمین ہیں۔ حرمین سے بغداد کا فاصلہ چھ میل کے لگ بھگ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ کاظمین مرکزی شہر کا حصہ بن چکا ہے بیچ میں صرف دریا حائل ہے۔ حرم سے باہر سڑک کے کنارے امام موسیٰ کاظمؒ کے دو بیٹوں حضرت اسماعیل اور حضرت ابراہیم کے مدفن ہیں اور زیارت کا سلسلہ یہیں سے شروع ہو جاتا ہے۔ عینی شاہدین کا کہنا ہے کہ اتحادی طیاروں کی بمباری سے حرمین کی عمارتوں کو اگرچہ نقصان نہیں پہنچا مگر کاظمین میں واقع سینکڑوں مکان مسمار ہو چکے ہیں۔ امام موسیٰ کاظمؒ کے روضے کی طرف جانے والا راستہ بھی میزائیلوں کا نشانہ بنا ہے۔

بغداد سے کاظمین کی جانب سر راہ ایک مسجد بُراثا کے نام سے معروف ہے اس کا ایک مینار راکٹ لگنے سے شہید ہو گیا ہے۔ اس مسجد کے بارے میں عام روایت یہ ہے کہ نہروان کی جنگ سے واپسی کے بعد حضرت علیؓ نے یہاں قیام فرمایا تھا۔ مسجد کے اندر ایک کمرہ مقام خانہ مریم کہلاتا ہے۔

دروازے کے باہر سیاہ رنگ کا پتھر رکھا ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ مقدس ماں نے اس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو لٹا کر رب ذوالجلال کے حضور نماز ادا کی تھی۔ صحن مسجد میں یوشعؑ نبی اور بہلول دانا کی قبور بھی ہیں۔ ۲۱ جنوری کو جب یسوع مسیح کے نام لیواؤں نے عراق پر لہر در لہر ایک ہزار طیارے اڑائے تو صحن مسجد میں مسیحی اور مسلم زائرین کا ایک ہجوم دعا کے لئے جمع تھا ان میں سے بے شمار لوگ مارے گئے اور سینکڑوں زخمی ہو گئے۔ سیاہ رنگ کے پتھروں پر زائرین کے خون کے چھینٹے مسیح کی بھیڑ یا نما بھیڑوں کی درندگی کے ابھی تک نشانات ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ یہ علاقہ طوفان نوح سے قبل نظام آب پاشی کا بہترین نمونہ تھا، پانی کی نہریں تو صدیوں پہلے سوکھ گئیں اب ادھر سے خون کی ندیاں بہتی ہیں۔

کاظمین سے کربلا ۶۵ میل کی دوری پر واقع ہے اور عالم انسانی کو دنیا کے عظیم ترین سانحہ کی یاد دلا رہا ہے۔ یہاں نواسہ رسول ﷺ امام حسینؓ ان کے اہل بیت اور ساتھیوں کے مزارات اور مقابر ہیں۔ چودہ سو سال پہلے کے نینوا اور غاضریہ کے اس میدان میں جگر

گوشہ بتولؓ نے یزید وقت کے مقابل صبر و رضا کی انوکھی داستان مرتب کی تھی۔ روضہ حسینؓ سے ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر باب الحوائج میں حضرت عباسؓ علمدار وفا کی تفسیر بنے لیٹے ہیں۔ جن لوگوں نے کربلا کے نواح میں ایک کارخانے پر بم گرتے دیکھے ہیں ان کا اصرار ہے کہ پگھلتے لوہے کے ٹکڑے حرم امام پر بھی گرے تھے باب قبلہ پر ان کے نشانات صاف نظر آتے ہیں۔ کربلا شہر میں برسوں سے مقیم ایک ہندی خادم نے انکشاف کیا ہے کہ اتحادیوں کے تین جنگی طیاروں نے عراقی فوجیوں کے ایک دستے پر مشین گنوں اور راکٹوں سے حملہ کرتے ہوئے تل زینبیہ کو بھی نشانہ بنایا ہے۔ یہ وہ جگہ ہے معرکہ کربلا کے دوران جہاں سے حضرت زینبؓ نے زخموں سے چُور چُور بھائی کو گھوڑے سے گرتے ہوئے دیکھا تھا۔

کربلا کے بعض ایرانی اور یمنی نژاد شہریوں کے بقول مقام حضرت علیؓ کے قریب یکے بعد دیگرے تین میزائل گر چکے ہیں اور ان سے کافی تباہی پھیلی ہے۔ان لوگوں نے ایک تازہ گڑھے کی نشاندہی کرتے ہوئے بتایا کہ ایک ہزار پاؤنڈ وزنی بم یہاں سے سو گز کے فاصلے پر گرا اور اس کے دھماکے سے زمین کئی جگہ سے شق ہو گئی۔ان کی گفتگو سے پتہ چلا کہ مقام حضرت علیؓ کو بنی نوع انسانی کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے حوا کی تلاش میں دربدر بھٹکنے والے حضرت آدم کو یہیں ٹھوکر لگی تھی۔ طوفان کے دوران حضرت نوحؑ کی کشتی جب یہاں پہنچی تو ڈولنے لگی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ کا گھوڑا بھی یہیں پر بدکا تھا۔اور جب تخت سلیمانؑ کا گزر ادھر سے ہوا تو ہوا میں معلق ہو کر رہ گیا۔ایک روایت یہ بھی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہاں ہرنوں کو روتے ہوئے سنا تھا۔

بغداد سے کربلا ۶۵ میل اور کربلا سے نجف اشرف کا فاصلہ کم و بیش ۶۰ میل ہے۔ یہاں مولود کعبہ اور شہید مسجد مولا علی مشکل کشا کا روضہ اقدس ہے۔ کرہ ارض کے اس ٹکڑے کی فضیلت بیان کرتے ہوئے حضرت امام جعفر صادق نے فرمایا تھا کہ نجف کبھی دنیا کا بلند ترین پہاڑ تھا اور حضرت نوحؑ کے بیٹے نے اس پہاڑ سے پناہ مانگی تھی تو یہ حکم خداوندی سے ریزہ ریزہ ہو کر نرم ریت بن گیا تھا۔ کبھی اسے پشت کوفہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

کوفہ تو ویران پڑا ہے مگر نجف اشرف کی فضائیں رحمتوں اور برکتوں سے معمور ہیں۔اتحادی طیاروں نے اس شہر کے گرد و نواح میں تین بار بمباری کی ہے جن سے پانچ پھاٹکوں والے روضہ مرتضیٰ کے دو دروازوں باب طوس اور باب فلق کو معمولی نقصان پہنچا ہے البتہ نجف میں آباد بہت سے شہری بری طرح زخمی ہوئے ہیں۔ ایک عراقی اخبار نویس کے بقول وادی اسلام کا قدیم ترین قبرستان جہاں حضور ہودؑ اور حضرت صالحؑ کے مزارات ہیں بارود کی آگ سے بری طرح متاثر ہوا ہے۔ نجف اشرف کے بعض خدام نے بتایا ہے کہ حرم کے احاطے میں حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کی قبور میں شگاف پڑ چکے ہیں اور جب پہلی بار اتحادی طیاروں نے کربلا کے نواح میں بم برسائے تو مدفن علیؓ سمیت قبور انبیاء دو بار ایسے کانپی تھیں جیسے زلزلہ آ رہا ہو۔

عراق کے فوجی حکام کا کہنا ہے کہ مقتل جناب امیر المومنین کوفہ اور زنداں امام علی تقی اور امام حسن عسکری سامرہ بھی اتحادی بم باری سے متاثر ہوئے ہیں۔ کوفہ خلیفہ دوئم حضرت عمر فاروقؓ کے دور میں فوجی چھاؤنی کے طور پر آباد ہوا تھا جبکہ اس کی قدامت صدیوں اور قرنوں پر محیط ہے بعض روایات کے مطابق یہاں پہنچ کر حضرت آدمؑ کی دعا قبول ہوئی، حضرت ابراہیمؑ کی ولادت اسی خطے میں ہوئی، حضرت ادریسؑ اور حضرت خضرؑ کی رہائش بھی اسی خطے میں تھی، کہتے ہیں کہ حضرت یونسؑ کو مچھلی نے اسی مقام پر اگلا تھا اور وہ تنور بھی یہیں کہیں تھا جہاں سے سیلاب عظیم پھوٹا تھا، کوفہ سفیر حسین حضرت مسلم بن عقیل کا مدفن ہے اور بابل کے کھنڈرات بھی اسی شہر کے نواح میں واقع ہیں۔

سامرہ جس کا پرانا نام سر من رائے ہے مغدود سے موصل جاتے ہوئے راستے میں آتا ہے، خلافت عباسیہ کا دارالخلافہ رہ چکا ہے اور ڈینجر زون سے اس کا فاصلہ ۸۰ میل ہے۔ حضرت نوحؑ کے بیٹے گوش کا پوتا نمرود یہیں پیدا ہوا تھا۔ امام عصر کی والدہ ماجدہ سیدہ نرجس خاتون اسی جگہ دفن ہیں، سامرہ اور کوفہ سے نقل مکانی کر کے اردن پہنچنے والے جنگی متاثرین کا کہنا ہے کہ اتحادی بم باری سے حضرت ادریسؑ کی رہائش گاہ سے متصل مکانات کو سخت نقصان پہنچا ہے، مقام ابراہیمؑ کا تو نشان ہی مٹ چکا ہے، سامرہ کے وسط میں واقع تاریخی برج کی ایک منزل گر گئی ہے اس برج کے بارے میں مشہور ہے کہ نمرود شہر کا نظارہ کرنے کے لئے یہاں گھوڑے پر بیٹھ کر آتا تھا۔

نبیوں، رسول زادوں، اماموں اور ولیوں کے متبرک اور مقدس سرزمین پر ٹوٹنے والی قیامت کے نتیجے میں شہید مزارات، مقابر اور ہزاروں سال پرانے تاریخی مقامات جس بے دردی سے مسمار کئے جا رہے ہیں ان کے نوحے اور فریاد پوری دنیا نے سنی ہے، خدا کی دھرتی پر اس کے رسولوں کی امتوں نے جو فتنے اٹھائے ہیں ان کا دھواں آسمان تک پہنچ رہا ہے۔ بغداد سے ۲۵ میل دور واقع مدائن سے آنے والے ایک مسافر کی زبانی صحابی رسول ﷺ حضرت سلیمان فارسیؓ کے مقبرے کا حال جان کر آنکھیں بھیگ جاتی ہیں۔ اس نے بتایا کہ:

"مسجد امام حسن کا گنبد گولیوں سے چھلنی چھلنی ہو رہا ہے، قبور حضرت حذیفہ یمانی، حضرت عبداللہ بن جابر انصاری کے ساتھ ساتھ نوشیر وان عادل کے مسمار محلات بھی کانپ اٹھے ہیں۔"

مہذب قوموں کے نرغے میں جلتی بھڑکتی سرزمین عراق کا وہ شہر الاحمر بھی ملبے کا ڈھیر بن چکا ہے جسے بائبل میں کیش کے نام سے پکارا گیا ہے۔ یہ وہی شہر ہے فہرست شایان کے مطابق جہاں طوفان نوح کے بعد اور پانچ ہزار قبل از مسیح آسمان سے دوبارہ بادشاہت اتاری گئی تھی اس بادشاہت کے ایک فرمانروا احمورابی نے خداوند مروک کے حکم سے دنیا کا پہلا ضابطہ قانون مرتب کیا تھا اور اس خطے پر سوا لاکھ برس سے آباد انسانوں کی یہی منظم تہذیب سمجھی جاتی ہے۔ آج یہ تہذیب چیتھڑے چیتھڑے ہو گئی ہے، دنیا کے

پہلے ضابطہ قانون کی دھجیاں بکھر رہی ہیں، وہ یوں کہ جنگ بازوں کا کوئی مذہب ہوتا ہے، ماضی و حال ہوتا ہے اور نہ ہی کوئی قانون اور اخلاق۔ وہ زیر زمین پیغمبروں کی صدائیں سنتے ہیں اور نہ ہی ماضی کی پکار پر توجہ دیتے ہیں۔ محمد ﷺ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے ماننے والے صرف یہ سوچتے ہیں کہ جس طرح پانی کے سیلاب کے بعد پچھلی قوموں کے لئے آسمان سے بادشاہت اتری تھی اس طرح آگ کے طوفان کے بعد ان کے لئے بھی حکمرانی اتاری جائے گی اور اسی لئے انہوں نے پرانی بادشاہتوں کو مٹانا شروع کر دیا۔

نفی

''سب تعریف اللہ کے لئے جو رب ہے عالمین کا، مہربان اور رحم کرنے والا، انصاف کے دن کا مالک ہے، ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے رحم کی مدد کے خواستگار ہیں، چلا ہم کو سیدھے راستے پر جو ان لوگوں کا راستہ ہے جن کے اوپر تو نے اپنا فضل کیا ہے اور حفاظت کر ہماری ان لوگوں سے جن سے تو ناراض ہے اور بچا ہم کو بھٹکنے والوں سے۔''

کائنات کی تنظیم اس طرح کی گئی ہے کہ ایک ہستی کا کائنات کے اوپر پورا پورا کنڑول ہے۔ کائنات کے اندر احتیاج ہے، کائنات ہر قدم پر مجبور ہے، کائناتی کنبہ کا ہر فرد دوسرے فرد کے ساتھ اس طرح ہم رشتہ ہے کہ باوجود یہ کہ وہ اپنی ذات میں منفرد ہے لیکن دوسرے فرد سے خود کو دور کر سکتا ہے اور نہ آزاد کر سکتا ہے۔ زماں و مکاں کائنات کی بساط اوّل ہے، مکاں (زمین)، زماں (آسمان) نہ ہوں تو زندگی عدم ہے۔ عدم پر نقش و نگار حیات ہے، حیات حرکت ہے، حرکت کا تقاضہ ہے، تقاضہ جذبہ ہے اور جذبہ حس ہے جس سے حواس بنے، حواس سے خود آگاہی حاصل ہوئی، خود آگاہی نے ''میں اور تو'' میں امتیاز بخشا۔ یہ جان لیا کہ میں جز ہوں وہ کل ہے، کل ہے تو میں ہوں وہ ابتدا ہے، میں ابتدا کی انتہا ہوں، وہ انتہا ہے تو میں اس کا پرتو ہوں، پر تو نے اصل کی آواز الست سنی تو کان بن گئے، دیکھا تو آنکھیں روشن ہو گئیں، نور کا جھماکہ ہوا تو بارہ کھرب سیل (Cells) چارج ہو گئے، خلئے کھلے تو ایک نقطہ سے کھربوں نقطے متحرک ہو گئے۔ ''وہی ہے جس نے تخلیق کیا تم کو ایک نفس (نطفہ) سے'' کی تفسیر سامنے آ گئی پھر خالق کائنات اللہ کریم بولا:

''پاکی بول اپنے رب کے نام کی جو سب سے اعلیٰ ہے جس نے بنایا پھر ٹھیک کیا٥ اور جس نے متعین مقداروں سے ہدایت دی٥ اور جس نے نکالا چارہ٥ پھر کر ڈالا اس کو کوڑا کالا٥ ہم پڑھا دیں گے تجھ کو پھر تو وہ بھولے گا مگر جو چاہے اللہ وہ جانتا ہے ظاہر اور چھپا ہوا٥ اور آہستہ آہستہ پہنچائیں گے ہم تجھ کو آسانی تک٥ تو سمجھے گا اگر سمجھنا چاہے٥ سمجھ جاویگا جس کو ڈر ہو گا٥ اور سرک رہے گا اس سے بڑا بدبخت اور جو پہنچے بڑی آگ میں٥ پھر نہ مرے گا اس میں نہ جیوے گا٥ کوئی نہیں تم آگے رکھتے ہو دنیا کا جینا٥ اور پچھلا گھر بہتر ہے اور رہنے والا٥ یہ کچھ لکھا ہے

پہلے ورقوں میں صحاف ابراہیمؑ میں اور صحاف موسیٰؑ میں٥''۔

''کچھ پہنچی تجھ کو بات اس چھپا لینے والے کی o کتنے منہ اس دن خوف زدہ ہیں محنت کرتے تھکتے o پہنچیں گے دہکتی آگ میں پانی ملے گا ایک چشمہ کھولتے کا o نہیں آس پاس کھانا مگر جھاڑ کانٹے o نہ موٹا کرے نہ کام آوے بھوک میں o کتنے منہ اس دن آسودہ ہیں o اپنی کمائی سے راضی o اونچے باغ ہیں o نہیں سنتے اس میں بکتا o اس میں ہے ایک چشمہ بہتا o اس میں تخت ہیں اونچے لمبے o اور آپ خورے دھرے o اور غالیچے قطار پڑے (Wall to wall carpeted) مخمل کے نہالچے گھنڈر رہے o بھلا کیا نگاہ نہیں کرتے اونٹوں پر o کیسے بنائے ہیں o اور آسمان پر کیسا بلند کیا ہے o اور پہاڑوں پر کیسے کھڑے کئے o اور زمین پر کیسی صاف بچھائی ہے o اس کو تو سمجھنا تیرا کام ہی ہے سمجھانا o تو نہیں ہے ان پر داروغہ o مگر جس نے منہ موڑا اور منکر ہوا o تو عذاب کرے گا اس کو اللہ وہ بڑا عذاب o بے شک ہمارے پاس ہے ان کو واپس لانا o پھر بیشک ہمارا ذمہ ہے ان سے حساب لینا o''۔

سورۃ اعلیٰ اور سورۃ غاشیہ میں کائناتی کنبہ کے سرپرست اعلیٰ کہکشانی نظاموں کے خالق اکبر اور عالمین کے رب نے اپنی صفات بیان کر کے واضح کیا ہے کہ کائنات دو رخوں سے مرکب ہے۔ایک یونٹ یکتا۔واحد۔بے نیاز اور ہر قسم کے احتیاج سے پاک۔خالق جو دیتا ہے لیکن کسی سے کچھ لیتا نہیں ہے جو زندگی دیتا ہے۔ایک زندگی سے دوسری زندگی میں اور دوسری زندگی سے تیسری زندگی میں الٹ پلٹ کرتا رہتا ہے۔

وہ قائم پاک ذات ہے، حیات و ممات سے ماوراء ہے، جس نے زمین کو بچھونا بنا دیا ہے جس نے پہاڑوں کو میخیں بنا کر زمین میں گاڑھ دیا ہے، جس نے سات آسمانوں کی چھتوں کو دیواروں اور ستونوں کے بغیر کھڑا کر دیا ہے۔جس نے سورج کی ڈیوٹی لگا دی ہے کہ وہ زمین سے اُگتی ہوئی کھیتیوں کو پکائے اور جس نے چاند کو حکم دے دیا ہے کہ وہ کھیتوں اور پھلوں میں مٹھاس منتقل کرتا رہے۔زمین پر سے قطار در قطار درخت اگا دیئے ہیں۔رنگ رنگ کے پھول زمین پر زینت کیلئے جھومر بنا دیئے ہیں۔اور دوسرا یونٹ مخلوق ہے۔مخلوق میں افضل آدم ہے۔وہ آدم جو محتاج ہے، بے اختیار ہے، کبھی موت کا پنجہ اسے دبوچ لیتا ہے اور کبھی حیات اسے سہارا دیتی ہے۔اور اگر خالق کائنات اللہ کریم کے ارشادات کے مطابق وہ خالق اکبر اللہ کو جان لیتا ہے کہ وہ کل کا جزو اور اصل کا پرتو ہے۔پھر من و تو کا پردہ اٹھ جاتا ہے۔بندہ اپنی نفی کر کے پکار اٹھتا ہے:

''میرا یقین ہے کہ ہر امر اللہ کی طرف سے ہے میرا جینا، میرا مرنا، سب اللہ کے حکم کے تابع ہے۔''

آنکھیں

یہ کون نہیں جانتا کہ آدم برادری کا ہر فرد روح اور جسم کا مجموعہ ہے۔ جسم اور جسمانی توانائی زندگی اور حرکت کا تعلق مادیت سے ہے، جسم کی غذا بھی مادی ہے۔ آدم زاد کے اندر تین حصے پانی ہر وقت جسم کی کارکردگی کو بحال رکھتا ہے، شریانوں، وریدوں میں خون دوڑ کر بہتا ہے، پھیپھڑوں کا پھیلنا اور سکڑنا بھی ہوا اور آکسیجن کے اوپر قائم ہے۔ جس زمین پر آدم رہتا ہے چلتا پھرتا ہے، مکر و فریب کی دنیا بساتا ہے، کبر و نخوت سے اس کی گردن اونٹ کا کوہان بنی رہتی ہے، جس دھرتی کی کوکھ سے وسائل مہیا ہوتے ہیں اور جو دھرتی آدم زاد کو اس کی تمام تر رعونت اور تعفن کے ساتھ اپنے اندر سمیٹ لیتی ہے وہ بھی مادیت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ اس کے برعکس روح جو لطیف ہے، پاکیزہ ہے، طاہرہ ہے اور منیزہ ہے۔ عالم اقدس سے ہم رشتہ ہے اس کی غذا نور اور روشنی ہے۔ تجلی براہ راست اسے فیڈ کرتی ہے۔ روح کی توانائی، روح کی زندگی، روح کی حرکت، روح کا حسن، اللہ کی محبت اور قربت ہے جس طرح جسم مادی غذا نہ ہونے سے کمزور و ناتواں اور ناکارہ ہو جاتا ہے اسی طرح اگر روح کو قربِ الٰہی حاصل نہ ہو تو وہ بھی ضعیف و ناتواں ہو جاتی ہے۔ بے چین و بے قرار رہتی ہے۔

کبھی آپ نے سمندر میں سے اٹھتی ہوئی موجوں کو دیکھا ہے؟ یہ موجیں سمندر میں سے ٹھیک ساحل پر جبیں ریز ہوتی ہیں۔ آپ نے کبھی سوچا ہے کہ موجوں اور لہروں کی بے قراری، بے تابی، تڑپ اور کروٹ طغیانی کا راز کیا ہے؟

موج جب اپنے اصل سمندر سے دور ہوتی ہے تو اس کے اوپر دوری کا احساس غالب آ جاتا ہے وہ بار بار ساحل سے سر ٹکراتی ہے۔ اسے فراق کی گھڑیاں قیامت لگتی ہیں۔ سمندر اپنا ایک تشخص رکھتا ہے۔ جوش، جلال اور عظمت سے جب وہ اپنی حیثیت کا مظاہرہ کرتا ہے تو آسمانوں کے کناروں کو چھوتی ہوئی لہریں اس کے باطن سے باہر آ جاتی ہیں اور ساحل پر اپنی پیشانی رکھ دیتی ہیں، عظمت و جرأت کا مظاہرہ اسے اس بات پر مجبور کر دیتا ہے کہ وہ فرش پر سجدے میں گر جائیں۔ لہریں جیسے ہی فرش پر جبیں نیاز رکھتی ہیں سمندر اسے اپنی آغوش میں ایسے سمیٹ لیتا ہے کہ لہر اور سمندر ایک ہو جاتے ہیں۔ سمندر میں مد و جزر، جوار بھاٹا، لہروں کا طلاطم سمندر کے تشخص میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل بن جاتا ہے۔

پانی جب ذرہ ذرہ ہو کر لطیف ہو جاتا ہے تو ہوا اسے اپنے کندھوں پر سے خلاء میں اچھال دیتی ہے۔ خلاء جب لطافت سے معمور ہو جاتا ہے اور اسے سکون کا ایک ابدی لمحہ میسر آ جاتا ہے تو یہ ساری لطافت، یہ ساری ترشح، یہ ساری نمی بادل کے روپ میں خود کو منتقل کر

دیتی ہے۔ بادل کے بڑے بڑے مشکیزے قافلہ در قافلہ، کارواں در کارواں اڑتے ہوئے شمال سے جنوب اور جنوب سے شمال، مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق میں محو سفر ہو جاتے ہیں جہاں ان کا قیام ہوتا ہے وہاں حرکت منجمد ہو جاتی ہے اور جمود اپنے وجود کو ٹھہرا ہوا دیکھتا ہے تو سورج سے معاونت چاہتا ہے۔ سورج جب بلند و بالا پہاڑوں کی چوٹیوں پر بکھری ہوئی چاندی کو گہری آنکھوں سے دیکھتا ہے تو سورج کی آنکھوں سے نکلنے والی شعاعیں اس وجود کو ریزہ ریزہ کر دیتی ہیں۔ یہ ریزہ ریزہ جمود سیال بن کر اعلیٰ سے نشیب کی طرف چشموں، آبشاروں، ندی نالوں میں سے سیل بیکراں کی طرح رواں دواں ہو جاتا ہے اور اپنی اصل سمندر سے جاملتا ہے۔ یہ سب کیوں ہوتا ہے؟ اس لئے کہ سمندر میں سے نکلا ہوا پانی کا ایک ایک قطرۂ آب اصل سے اپنا رشتہ قائم رکھنا چاہتا ہے۔

کسی بھی درخت کا بیج پسند نہیں کرتا کہ وہ فنا ہو جائے اس طرح فنا ہو جائے کہ موت اس کے مستقبل کو کھا جائے۔ ہر بیج اپنے اندر تناور درخت کی حفاظت کرتا ہے۔ خود فنا کا لباس زیب تن کر کے درخت کے وجود کو قائم رکھتا ہے۔ یہ کیوں ہو رہا ہے؟ اس لئے کہ بیج اپنی اصل سے رشتہ مستحکم رکھنا چاہتا ہے۔

حرکت ہمہ وقت حرکت ہے۔ یہ حرکت پہاڑوں کو بڑے بڑے ٹکڑوں میں، پہاڑوں کے بڑے بڑے تودوں کو چھوٹے چھوٹے پتھروں میں چھوٹے پتھروں کو کرش میں اور کرش کو بجری میں، بجری کو ریت میں کیوں تبدیل کرتی رہتی ہے؟ اس لئے کہ پہاڑوں، کہساروں اور ریت کے ذرات میں قدر مشترک ختم نہ ہو جائے۔

آدم زاد نے جب روح سے اپنا رشتہ توڑ لیا اور روحانی طریقات کو نظر انداز کر دیا۔ سیم وزر کی فراوانی اور عیش و عشرت کو سب کچھ جان لیا تو روح کی بے قراری میں اضافہ اس لئے ہو گیا کہ روح جانتی ہے کہ صرف مادیت کا عروج روح کی غذا کو زہریلا اور مسموم بنا دیتا ہے جیسے ہی روح سے آدم زاد کا رشتہ کمزور ہوتا ہے وہ قرب الٰہی اور خالق اکبر کی محبت سے دور ہوتا رہتا ہے۔ دنیا میں جنگ و جدال، خون ریزی، نفرت و حقارت اور بھیانک موت کی تاریکی اس لئے پھیل گئی ہے کہ آدم برادری کی روح بے قرار اور بے چین ہے اسے سکون اسلئے نہیں ہے کہ اشرف المخلوقات آدم درندہ بن گیا ہے، زر و جواہر کو اہمیت دیتا ہے لیکن جس نے زر و جواہر کے ذخائر آدم کو منتقل کر دیئے ہیں اور برابر منتقل ہو رہے ہیں اس سے صرف لفظی تعلق ہے۔

اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ ان ممالک میں جہاں دولت کی فراوانی ہے، آسائش و آرام کی اتنی سہولت ہے کہ لوگ سوچتے ہیں کہ اب ہم کس زاویہ سے آسائش حاصل کریں وہاں ہر شہر کے ہر ہسپتال میں آدھی سے زیادہ آبادی دماغی مرض کی ہے۔ ہسپتالوں میں نصف سے زیادہ بستر دماغی امراض کے مریضوں کے لئے مخصوص ہیں۔ خودکشی کی وارداتیں بھی ان ممالک میں زیادہ ہو رہی ہیں۔ یہاں کا کروڑ پتی تاجر سب کچھ خرید سکتا ہے لیکن اسے سکون میسر نہیں ہے۔ اس کے اندر کی بے چینی اسے کسی کل چین نہیں لینے

دیتی۔ وہ دبیز قالینوں پر فانوس کے نیچے ٹہلتا ہے اور سوچتا ہے کہ میرے پاس سب کچھ ہے لیکن میں بے چین اور پریشان کیوں ہوں؟ دولت کے پجاری کو کون بتائے کہ وہ اس لئے بیکل اور پریشان ہے کہ اس کے اندر ایک ہستی ہے۔ جس نے اس کے وجود کو سہارا دیا ہوا ہے۔ جس نے اسے زندہ رکھا ہوا ہے۔ وہ بھی بے چین ہے۔ وہ ہستی کون ہے؟ وہ ہستی روح ہے اور روح کی غذا اللہ کی محبت ہے۔ جب تک روح کو غذا میسر نہیں آئے گی آدم زاد سب کچھ ہوتے ہوئے بھی بے چین رہے گا۔

آج کا مسلمان جو ایمان سے خالی دامن ہے۔ جس کے قول و فعل میں تضاد ہے۔ وہ جھوٹ کو سچ اور سراب کو حقیقت سمجھ بیٹھا ہے۔ جس کے اندر منافقت، بغض، کینہ، تعصب، نفرت اور درندگی نے بسیرا کر لیا ہے۔ جو گریبان چاک، افسردہ چہرہ، تصنع، بناوٹ اور گدلی آنکھوں والی تصویر بن گیا ہے۔ کہتا ہے مجھے سکون نہیں، کوئی بتائے کہ میں اس بے چینی کا کیا تدارک کروں؟

اے میرے بھائی مسلمان! تو کیوں نہیں سوچتا کہ تو اس لئے بے چین ہے کہ منافقت اور مکر تیری زندگی میں داخل ہو گیا ہے۔ جیسے جیسے تو مکر و فریب سے قریب ہو رہا ہے تیری روح اپنی غذا اللہ کی محبت اور قربت سے دور ہو رہی ہے۔

اے مسلمان بھائی! تو اپنی منافقت سے پردہ اٹھا۔ تجھے تیرا چہرہ بھیانک نظر آئے گا۔ اللہ کہتا ہے سود لینے اور سود دینے والے سودی معیشت میں زندگی گزارنے والے اللہ کے کھلے دشمن ہیں۔

اے میرے بھائی! تو یہ کیوں نہیں سوچتا کہ جس کو اللہ اپنا دشمن کہہ رہا ہے۔ اس کی نمازیں، اس کا حج کیسے قبول ہو گا؟ تو کیوں اللہ کا دوست نہیں بن جاتا؟ کیا تجھے اس وقت روزی نہیں ملی جب تو ماں کے پیٹ میں تھا۔ کیا تو اس وقت بھوک سے مر گیا تھا جب تو کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے تو سانس لیتا ہے کیا اس میں تیرا کوئی دخل ہے؟ زمین کو اللہ نے تیرے لئے دستر خوان بنا دیا۔ اگر اللہ نہ چاہے تو کیا زمین کو اپنی خدمت پر مجبور کر سکتا ہے؟ ہوا تیری خدمت گزاری سے انکار کر دے، تیرے پاس کون سی طاقت ہے کہ تو ہوا کو مجبور کر دے کہ وہ تیرے پھیپھڑوں کو بھر دے۔ کیا سورج کو تو مجبور کر سکتا ہے کہ وہ تجھے روشنی فراہم کرتا رہے؟ ہمارا ماحول زہر آلود ہو گا تو ہم کیوں بیمار نہیں ہونگے؟ جب روح کی غذا اللہ کی محبت اور اس کی مخلوق سے محبت ہمارے اندر نہیں ہو گی تو ہم کیسے خوش رہ سکتے ہیں؟ خوش نہیں ہونگے تو سکون کہاں ملے گا؟ سکون نہیں ملے گا تو کیسے ممکن ہے کہ آدم زاد دوزخ کا ایندھن نہ بنے، دوزخ کے ایندھن کا مصرف جلنے اور کوئلہ بن جانے کے علاوہ کیا ہو سکتا ہے؟

حضرت مریمؑ

قرآن کا نزول چھٹی صدی عیسوی میں ہوا۔ قرآن پاک میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس کا بڑا حصہ تورات اور انجیل میں بیان ہو چکا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد گرامی ہے:

''میں کوئی نئی بات نہیں کہہ رہا ہوں مجھ سے پہلے میرے بھائی پیغمبران ؑ نے جو کچھ فرمایا ہے وہی میں بھی تمہیں بتا رہا ہوں۔''

اسلام نے آسمانی کتابوں کو برحق جانا ہے۔ ایمان کی تعریف ہی یہ ہے کہ محمد رسول ﷺ پر ایمان لایا جائے، آسمانی کتابوں پر یقین کیا جائے، پیغمبروں پر ایمان لایا جائے، یوم آخرت پر ایمان ہو، خیر و شر کی تقدیرات پر یقین ہو، اسلام تمام انبیائے کرام حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ کو برحق مانتا ہے۔ جس طرح قرآن پاک میں حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کو کرامت کہا گیا ہے اسی طرح انجیل میں بھی حضرت عیسیٰؑ کی ولادت قدرت کا ایک کراماتی عمل ہے جس طرح انجیل میں بھی حضرت مریمؑ کو ایک خاص مقام حاصل ہے اس طرح قرآن میں بھی حضرت مریمؑ کا اپنا منفرد مقام ہے یہاں تک کہ قرآن کی ایک سورۃ کا نام بھی مریم ہے۔

پانچ سال پہلے انگلینڈ کے ایک شہر نیلسن میں ایک پادری صاحب میرے پاس تشریف لائے۔ انہوں نے اپنا پہلا تعارف یہ کرایا کہ:

''میں ایمان رکھتا ہوں کہ عیسیٰؑ ہمارے لئے کفارہ بن گئے ہیں اور صلیب پر چڑھ کر (Jeses) نے ہمارے گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا ہے۔''

میں نے ان سے پوچھا:

''پادری صاحب! جب مسیح نے آپ کے لئے اپنی جان صلیب کی نظر کر دی ہے تو آپ کے اوپر بھی ان کے حقوق عائد ہوتے ہیں۔''

انہوں نے کہا:

''ہاں! میں بائیس سال سے مسیحؑ کی تعلیمات کی تبلیغ کر رہا ہوں۔''

میں نے کہا:

”جناب تبلیغ تو وہ بھی کر رہے ہیں جو پادری نہیں ہیں، پادری ہونے کی حیثیت سے آپ کے اوپر یہ فرض ہے کہ آپ مسیحؑ کو دیکھ کر ان سے عیسائیت کے علوم حاصل کریں۔“

پادری صاحب ایک دم آپے سے باہر ہو گئے کہنے لگے:

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں اپنے اندر میں Jeses کو محسوس کرتا ہوں۔“

میں نے کہا:

”جناب! محسوس تو یہ ساری باتیں کی جاتی ہیں لیکن محض محسوساتی باتوں کو حقیقت نہیں کہا جاتا، پادری صاحب! آپ بائیس سال سے مسیحؑ کے نام پر ایک خوبصورت آرام دہ عمارت (گرجا) میں رہتے ہیں۔ چرچ آپ کی ضروریات پوری کرتا ہے۔ اس کے باوجود آپ صرف محسوساتی زندگی کے خول میں بند ہیں۔ ہم مسلمان بھی حضرت عیسیٰؑ ابن مریم کو مانتے ہیں نہ صرف مانتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں بلکہ دیکھتے بھی ہیں اور حضرت عیسیٰؑ کی ذات سے ان کا علم بھی سیکھتے ہیں۔“

پادری صاحب غصے سے آگ بگولہ ہو گئے اور بڑے ہی دل آزار لہجے میں بولے:

”یہ نہیں ہو سکتا۔“

میں نے عرض کیا:

”ایسا ہوتا ہے اور اگر آپ چاہیں تو آپ بھی مسیحؑ کی روح سے ملاقات کر سکتے ہیں۔“

کچھ دیر وہ خاموش بیٹھے رہے اور یہ کہہ کر چلے گئے:

"This man is master in spiritualism"

ایک اور عیسائی بزرگ سے ملاقات ہوئی۔ اسلام اور عیسائیت پر گفتگو ہوئی تو میں نے ان سے عرض کیا:

”جناب! ہم عیسائیوں کی نسبت حضرت عیسیٰؑ اور حضرت مریمؑ کو زیادہ فضیلت دیتے ہیں۔ ہمارے قرآن پاک میں ایک باب کا نام ہی مریم ہے۔“

وہ اصرار کرتے رہے کہ:

"ایسا نہیں ہو سکتا۔"

میں جس مسلمان گھر میں مقیم تھا ان سے کہا قرآن کا انگریزی ترجمہ لے آئیں لیکن وہاں تاج کمپنی کے علاوہ دوسرا قرآن نہیں تھا۔ اس طرح میری بات کا وزن قائم نہیں ہو سکا۔

برمنگھم میں دو پادری خواتین (Nuns) آئیں اور تبلیغ شروع کر دی۔ میں نے ان سے پوچھا:

"اس وقت مسیح کہاں ہیں؟ ان کا جسم جو صلیب سے اتارا گیا تھا کہاں ہے؟"

بولیں:
"مسیح کہاں نہیں ہیں؟"

میں نے پوچھا:

"نظر کیوں نہیں آتے؟"

کہنے لگیں:

"روح بھی کہیں نظر آتی ہے؟"

میں نے پوچھا:

"تم کیا ہو؟"

وہ خاموش ہو گئیں، بات آگے بڑھی تو ہم اس نتیجے پر پہنچ گئے کہ مرنے کے بعد روح، روح کو دیکھتی ہے۔ میں نے کہا:

"اگر تم اپنی روح سے واقفیت حاصل نہیں کرو گی تو مسیح کو نہیں دیکھ سکو گی۔"

بدمزہ سا منہ بنا کر بولیں:

"ہمیں کیا ضرورت ہے کہ ہم آپ کی باتیں سنیں۔"

میں نے کہا:

’’سسٹر! میں بھی کوئی بیکار آدمی نہیں ہوں۔ مجھے کیا ضرورت ہے کہ تمہاری غیر حقیقی باتوں میں اپنا وقت برباد کروں۔ آپ میری باتیں سنیں گی میں آپ کی باتیں سنوں گا۔‘‘

انہیں جیسے کرنٹ لگ گیا اور تیزی کے ساتھ دونوں گھر سے باہر نکل گئیں۔

نیویارک میں ایک لڑکی آئی۔ بولی:

’’آپ Saint ہیں۔ میں یقین رکھتی ہوں کہ Jeses خدا کا بیٹا ہے۔‘‘

میں نے کہا:

’’ٹھیک ہے، میں کہہ سکتا ہوں کہ حضرت مریم خدا کی بیوی ہیں۔‘‘

وہ غصے سے لال پیلی ہو گئی اور مجھے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ میں نے نہایت نرم لہجے میں اور محبت سے کہا:

’’تم میری بیٹی کے برابر ہو۔ بات کو غصہ سے نہیں نرمی اور پیار سے سمجھنے کی کوشش کرو جب اللہ کا کوئی بیٹا ہو سکتا ہے تو اللہ کی بیوی بھی ہو سکتی ہے۔‘‘

وہ بہت دل برداشتہ ہو کر چلی گئی اور ایک ہفتے کے بعد دوبارہ واپس آئی اور کہا:

’’میں نے کئی پادریوں سے یہی سوال کیا کہ جب خدا کا کوئی بیٹا ہو سکتا ہے تو خدا کی بیوی کیوں نہیں ہو سکتی؟ وہ لوگ مجھے مطمئن نہیں کر سکے۔

اب میں مسلمان ہونا چاہتی ہوں لیکن چند شرائط ہیں۔ میری ماں بوڑھی ہے، میں اسے نہیں بتاؤں گی کہ میں مسلمان ہوں۔ اس لئے کہ وہ اس خبر سے مر جائے گی۔ میں برقع نہیں اوڑھوں گی، مسلمان پادری کہتے ہیں کہ برقع اوڑھنا ضروری ہے جبکہ یہاں مسلمان خواتین کھلے سر پھرتی ہیں۔‘‘

مغربی دنیا کا ایک اور واقعہ سن لیجئے۔ ایک کثیر الاشاعت اخبار کی نمائندہ آئی۔ مجھ سے انٹرویو کیا۔ پہلے رنگوں کے اوپر بات ہوئی کہ رنگ ہی ساری کائنات کا اصل ہیں اور رنگوں کے امتزاج سے کائنات میں نوعوں کا وجود قائم ہے۔ قصہ مختصر، وہ بظاہر بہت متاثر ہو گئی اور کہا رنگوں کی یہ عجیب و غریب تھیوری ہم آئندہ بدھ کو اخبار میں شائع کریں گے۔ بات ایڈیٹر سے ڈائریکٹر تک پہنچی۔ پھر بورڈ بیٹھا اور انٹرویو شائع نہیں ہوا۔ انہوں نے باقاعدہ معذرت کی کہ بورڈ کی رائے یہ ہے کہ انٹرویو شائع نہ کیا جائے۔ میرا خیال ہے کہ یہ انٹرویو اس لئے شائع نہیں ہوا کہ وہ اپنے عوام کو یہ نہیں بتانا چاہتے تھے کہ کوئی مسلمان رنگوں کی عجیب و غریب تھیوری جانتا

ہے۔ میں نے دیکھا اور جانا ہے کہ مغربی دنیا کی عوام کو صحیح حقائق معلوم نہیں ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں پالیسی کے تحت عوام سے حقائق کو چھپایا جاتا ہے اور عوام کو اسلام کی حقانیت سے بے بہرہ رکھا جاتا ہے۔ان عوامل میں ہم مسلمانوں کا قصور ہے۔ مسلمان اس معیار سے بہت زیادہ پست ہیں جس معیار پر زندگی گزارنے کی اسلام نے ہمیں تعلیم دی ہے۔ مغرب نے جان بوجھ کر اسلام کو (Mohammadanism) کا نام دیا ہے اور اس کی بے پناہ تشہیر کی گئی ہے تا کہ لوگ یہ سمجھیں کہ قرآن محمد ﷺ کا کلام ہے اور اسلام محمد ﷺ کا بنایا ہوا دین ہے۔ یہ ایک سازش ہے جو اسلام کیخلاف پوری شدومد کے ساتھ جاری ہے۔ مسلمان قوم کی زبوں حالی وابتری کا حال یہ ہے کہ اب ہم علم میں بھی یورپ اور مغربی دنیا کے محتاج بن گئے ہیں۔

قرآن کریم کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات پوری واضح ہو جاتی ہے کہ خواب اور بیداری زندگی کے دو نصف حصے ہیں۔ مگر ہمارے دانائے فرنگ اور دانشوروں پر مغرب کی چھاپ اتنی گہری ہے کہ فرائڈ کو نفسیات اور خواب کا بابائے آدم تصور کیا جاتا ہے جبکہ وہ نفسیاتی اور جنسی مریض کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ سائنس دانوں نے جب دیکھا کہ عیسائی علماء، سائنسی ترقی میں حارج ہوتے ہیں تو انہوں نے مذہب کو سائنس سے الگ کر دیا۔ سائنس اور مذہب کے تقابلی مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ بائبل کے مبصرین اور سائنس کے اسکالروں کے مابین شدید اختلاف ہے اس کے برعکس قرآن ایک ایسی الہامی کتاب ہے جس میں زندگی کے تین رخ متعین کئے گئے ہیں:

۱۔اصول معاشیات تمدن اور زندگی گزارنے کے طور طریقے

۲۔تاریخ جو ماضی میں بسنے والی قوموں کے عروج وزوال کے حقائق کو منکشف کرتی ہے۔

۳۔ معاد یعنی اس دنیا کے پیچھے اور اس دنیا کے آگے ایک اور دنیا ہے۔ چھپی ہوئی دنیا ہی سے خیالات واطلاعات موصول ہو رہی ہیں۔ ان اطلاعات میں مستقبل کے راز بھی ہیں اور ہر قسم کی سائنسی ترقی کے فارمولے بھی ہیں۔ یہ فارمولے ہر آن، ہر لمحہ نشر ہو رہے ہیں۔

صدائے عام ہے یاران نقطہ داں کے لئے

جو قوم اور قوم کا جو فرد ان نشر ہونے والے فارمولوں پر تفکر کرتا ہے، وہ فارمولوں کو تلاش کر لیتا ہے اور نئی نئی سائنسی ایجادات عملاً سامنے آجاتی ہیں۔

محبوب بغل میں

یہ جو روحانی سلسلہ ہے بڑا عجیب سلسلہ اور مشکل راستہ ہے جب آدمی تھوڑا سا سفر کر لیتا ہے تو اس کے اوپر شکوک و شبہات اور مایوسی کے خیالات آنے لگتے ہیں۔ شیطان اپنا زور اس بات پر لگا دیتا ہے کہ بندہ ناخوش ہو جائے۔ ناخوشی کے لئے شیطان جو خودکار ہتھیار استعمال کرتا ہے وہ ''انا'' کا خول ہے یعنی آدمی اپنی انا میں سمٹنے لگتا ہے وہ جو سوچتا ہے اپنی ذات، اپنی انا اور اپنی انفرادی شخصیت کے بارے میں قیاس کرتا ہے۔ اللہ کے لئے ذرا سا کچھ کام ہو جائے تو اسے بہت بڑا کارنامہ قرار دیتا ہے اور اس کمزوری کی وجہ سے اللہ سے اپنے حقوق قائم کر دیتا ہے۔ یہ بات ذہن سے نکل جاتی ہے کہ اللہ نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ ایک ہفتے پہلے کی بات ہے کہ ایک کروڑپتی شخص نے کہا۔ میرا دوست اللہ سے باغی ہو گیا ہے اس لئے کہ اللہ نے اس کی دعا قبول نہیں کی۔ اس نے دعا کی تھی کہ اس کا باپ زندہ رہے، لاکھوں روپے علاج پر خرچ کر دیئے مگر باپ مر گیا۔ اب وہ ہر وقت شراب و کباب میں مست و بے خود رہتا ہے۔

میں نے جواب دیا کہ:

اول تو یہ دعا ہی غلط تھی تم نہیں مروگے تو تمہاری کرسی پر تمہارا بیٹا کیسے بیٹھے گا؟

مرنا جینا دونوں کام اس قدر یقینی ہیں کہ ان سے کسی بھی طرح چھٹکارا نہیں۔ آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کا دوست جس گھر میں رہتا ہے اس گھر کی زمین کی قیمت اس نے اللہ کو کتنی دی ہے۔ جو سرمایہ لئے بیٹھا ہے اگر وہ پیدائشی طور پر کمزور دماغ ہوتا یا اس کے ہاتھ پیر نہ ہوتے، وہ ایک بھکاری اور مفلوک الحال کا بیٹا ہوتا تو شراب کہاں سے پیتا؟ میرے عزیز! آپ نہایت خوبصورت روح اور دلکش ذہن کے انسان ہیں اور یہ دلکشی اور یہ خوبصورتی آپ کا کوئی کارنامہ نہیں ہے۔ اللہ نے آپ کو اس طرح کا بنایا ہے۔ مایوسی اور پریشان خیالی راستے کی چیزیں ہیں جب کوئی مسافر سفر کے لئے نکلتا ہے تو اسے طوفانوں، گرد و غبار اور تھکان سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

صحیح مسافر وہ ہے جو منزل کی طرف بڑھتا رہتا ہے اس کا مقصد منزل کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا اور منزل چونکہ سامنے نہیں آتی اس لئے وہ ہر حال میں چلتا رہتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ ان پریشان کن خیالات سے نکل آئیں گے جو اس راستے میں سب کو پیش آتے ہیں۔ آپ نے مجھے استاد بنایا ہے میں نے بھی آپ کو آنکھوں کی روشنی بنا کر قبول کیا ہے۔ میرے اوپر فرض ہے کہ میں آپ کو راستے

کی بھول بھلیوں سے آگاہ کرتا رہوں۔ آپ کا یہ فرض ہے کہ آپ منزل کے علاوہ کسی بڑی اور چھوٹی عارضی شئے کو قبول نہ کریں۔ منزل جب مل جاتی ہے تو ہر شئے منزل رسیدہ شخص کے سامنے خود بخود جھک جاتی ہے۔ میرے تصور میں جب آپ کا ہنستا، مسکراتا چہرہ ٹینشن کی صورت میں بن جاتا ہے تو میں بے چین ہو جاتا ہوں۔ اس لئے کہ مجھے معلوم ہے کہ خوش رہنے والے لوگ ہی اللہ کے دوست بن سکتے ہیں۔ ناخوش رہنے والے لوگوں کو اللہ اپنا دوست نہیں بناتا۔ آپ جانتے ہیں کہ یہاں دنیا میں کوئی آپ کا اور میرا نہیں ہے، کوئی ہمیں چھوڑ جائے گا اور زیادہ کو ہم چھوڑ جائیں گے۔ بالآخر ہمارا آخری سرمایہ دو گز قبر ہے وہ بھی اس وقت جب ہمیں مل جائے۔ ہمارا جسمانی نظام قبر کے اندر کیڑوں کی خوراک ہے۔ ہماری انا مٹی کے ذرات میں تبدیل ہو جاتی ہے اور انا کے ذرات کو آدمی کتے، بلیاں، گدھے، گائے، بھینس اپنے پیروں میں روندتے پھرتے ہیں۔ کتنے بڑے بڑے بادشاہوں کے سر اور ان کے تاج۔

کتنے بڑے بڑے نمرود، فرعون، شداد، قارون جو گزرے ہیں زمین نے انہیں نگل لیا اور مٹی کے ذرات میں تبدیل کر دیا۔ آج ان نمرودوں، فراعین، شدادوں اور قارونوں کے دماغوں اور جسموں سے بنے ہوئے مٹی کے ذرات پر ہم چل پھر رہے ہیں، تھوک رہے ہیں اور ان ذرات کو اپنی غلاظت سے خراب کر رہے ہیں۔

میرے دوست! میں نے جوانی میں ایک واقعہ پڑھا تھا۔ ایک آدمی نے اپنی انا کے خول میں بند بہت ریاضت کی اپنی دانست میں اللہ کے کاموں کو آگے بڑھایا۔ لوگوں سے مانگ مانگ کر معابد بنائے خود بادشاہوں کی طرح زندگی گزاری اور اللہ کی مخلوق کو سوکھی روٹی دے کر خوش ہو گیا۔ شعوری دنیا سے نکل کر جب لاشعوری دروازے پر دستک دی تو حضرت ابلیس نے استقبال کیا۔ خوش پوشاک، دراز ریش بزرگ کے روپ میں ابلیس نے کہا، آپ کی داد و پیش، خیرات، عبادت و ریاضت اللہ کو پسند آگئی ہے آپ کو اب آسمانوں کی سیر کرائی جاتی ہے۔ انا کے خول میں بند آدمی نے آنکھیں موندلیں اور سیر شروع ہو گئی۔ پستی سے بلندی کی طرف پرواز ہوئی اور پھر بلندی سے پستی کی طرف نزول ہوا آنکھ کھلی تو ایک کوڑے پر جہاں تعفن، بدبو اور غلاظت کے سوا کچھ نہیں تھا وہ آدمی لتھڑا ہوا پڑا تھا۔

حضور قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں کہ جب بندہ اللہ کے لئے ایک قدم اٹھاتا ہے تو سوچتا ہے کہ میں نے اللہ کے اوپر احسان کر دیا ہے۔ وہ کیوں نہیں سوچتا کہ اللہ نے اسے نو مہینے ماں کے پیٹ میں روزی فراہم کی، پیدائش کے بعد دو سال تک بلامشقت غذا کا اہتمام کیا۔ ہوا، پانی، آکسیجن دنیا کے سارے وسائل فراہم کئے۔ بندے سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا، صحت دی، اولاد دی، عزت و وقار دیا، کاروبار کرنے کے لئے عقل دی۔

بندہ پیدا ہونے کے بعد ۷۰۔۸۰ سال زندہ رہتا ہے۔ اللہ کی زمین پر دندناتا پھرتا ہے۔ سرکشی کرتا ہے اللہ کو کچھ نہیں جانتا۔ اللہ کے پھیلائے وسائل کی اللہ سے زیادہ قیمت لگاتا ہے۔ پھر بھی اللہ ہر قدم پر اسے یاد رکھتا ہے۔

میری زندگی میں ایک وقت تھا کہ شکوک و شبہات، بے یقینی اور وسوسوں کی آماجگاہ بنی ہوئی تھی۔ یقین کے راستے میں قدم بڑھایا تو وسوسوں اور بے یقینی کا طوفان میرے اوپر حملہ آور ہوا۔ میں نے کہا اس کا بدلہ مجھے کیا ملا؟ میں نے اتنا طویل عرصہ اللہ کو پکارا۔ اللہ نے جواب کیوں نہیں دیا۔ راتیں آنکھوں میں سمیٹ لیں، کوئی کشف کیوں نہیں ہوا؟ مرشد کے اوپر میرا یہ حق ہے، وہ حق ہے، مجھے کیا دیا؟ سلسلہ کے لئے میں نے خود رات دن ایک کر دیئے سلسلے سے مجھے کیا ملا؟ فلاں آدمی کیوں نواز دیا گیا مجھے کیوں محروم رکھا گیا؟ حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے نام جتنے خطوط آتے تھے مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں خطوط پڑھ کر سنایا کرتا تھا جواب بھی میں لکھتا تھا۔ ایک روز میں نے عرض کیا:

''حضور! میں آپ کے اوپر قربان! کیا میرے اندر اتنی صلاحیت بھی نہیں ہے جتنی ان صاحب کے اندر ہے جن کا خط میں نے پڑھا ہے؟''

حضور فرماتے:

''نہیں تمہارے اندر صلاحیت نہیں ہے۔''

کبھی میں سوچتا کہ یہ صاحب ماشاء اللہ کتنی اچھی سیر کرتی ہیں۔ آسمانوں میں اڑتی پھرتی ہیں، کیا میں ان سے بھی گیا گزرا ہوں؟ فرماتے۔ ''ہاں''

جب پانی سر سے اونچا ہو گیا اور میرے اوپر مایوسی کے دورے پڑنے لگے شیطان نے مجھے اپنا آلہ کار بنالیا تو ایک دن مرشد کریم کو رحم آیا۔

رمایا:

''خواجہ صاحب بیٹھ جائیں۔''

پوچھا:

''میرا آپ سے رشتہ کیا ہے؟''

میں نے عرض کیا:

''آپ کا غلام ہوں۔''

فرمایا:

''یہ تو ٹھیک ہے، میں تمہارا کیا لگتا ہوں؟''

میں نے ڈرتے ڈرتے کہا:

''حضور! آپ میرے محبوب ہیں۔''

مسکرا کر فرمایا:

''لیجئے! یہ تو مسئلہ ہی حل ہو گیا، اب آپ یہ بتائیں کہ جب محبوب بغل میں ہو تو کیا کوئی اور خیال آتا ہے اور اگر آتا ہے تو یہ محبوب کی توہین ہے۔ اس لئے کہ اگر محبوب کی ہم آغوشی کے بعد کوئی خیال آتا ہے تو دراصل وہ محبوب ہے جس خیال آ رہا ہے۔ آپ جنت دیکھنا چاہتے ہیں، آسمانوں میں پرواز کرنا چاہتے ہیں تو آپ کا محبوب میں کس طرح ہوا؟ آپ کا محبوب جنت ہے، پرواز ہے، کشف و کرامات ہے۔''

میرے ہمدم! آپ یقین کریں میں لرز گیا۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ دل کی دنیا ماتم کدہ بن گئی۔ تھکے قدموں سے اٹھا اور مرشد کے قدموں میں سر رکھ دیا۔ مرشد کریم نے ایک آہ بھری اور مجھے سینے سے لگا لیا۔ محبوب کی وصل کی لذت آج بھی میرے اندر زندہ ہے اور یہی وہ وصل ہے، لذت ہے جو مجھے دن رات بے قرار کئے ہوئے ہے۔ میں اس لذت کی تلاش میں کہاں کہاں نہیں پہنچا۔ میں نے جنت کا ایک ایک گوشہ دیکھا، آسمانوں کی رفعتوں میں فرشتوں کے خوشنما صفاتی پروں کا جمال دیکھا، ملائے اعلیٰ کی قدسی اجسام میں تجلی کا عکس دیکھا، دوزخ کے طبقات میں گھوم کر آیا، موت کو دیکھا، موت سے پنجہ آزمائی کی، وہ کچھ دیکھا جن کے لئے الفاظ نہیں ہیں کہ بیان کر دیا جائے لیکن مرشد کے وصل کی لذت نہیں ملی۔ ہر لمحہ مرنے کے بعد اس لئے جیتا ہوں کہ مرشد سے قربت ملے گی، جینے کے بعد ہر آن اس لئے مرتا ہوں کہ مرشد کا وصال نصیب ہو گا۔

اندر جھانکتا ہوں مرشد نظر آتے ہیں

باہر دیکھتا ہوں مرشد کی جھلک پڑتی ہے

ہائے! وہ کیسی لذت وصل تھی کہ زمانے گزرنے کے بعد بھی روح میں تڑپ ہے۔ اضطراب ہے۔ انتظار ہے۔ اس یقین کے ساتھ زندہ ہوں۔ اس یقین کے ساتھ مروں گا۔ اس یقین کے ساتھ دوبارہ زندہ ہوں گا کہ مرشد کریم حضور قلندر بابا اولیاءؒ مجھے ایک بار اپنے سینے سے لگائیں گے۔ اور مجھے اس طرح اپنے اندر سمیٹ لیں گے کہ میرا وجود نفی ہو جائے گا۔ اور کوئی یہ نہیں جان سکتا کہ مرشد اور مرید دو الگ الگ پرت ہیں۔

روحانی راستہ کے مسافر میرے فرزند۔ میں آپ کو چند سطریں لکھنا چاہتا تھا۔ مگر میرے اندر مرشد کریم کی محبت کا رکا ہوا طوفان برملا ظاہر ہو گیا۔اور میں داستان جنون لکھتا گیا۔خدا کرے میرا جنون آپ کا جنون بن جائے۔(آمین)

دولت پرستی

کُن کا عمل ہوا کائنات بن گئی۔ کائنات کے بارے میں ہمارا علم ابھی محدود ہے۔ ہم اتنا ہی جانتے ہیں کہ کائنات کے ایک طفیلی سیارے پر آدم کا وجود ظاہر ہوا۔ یہ سیارہ پہلے ہی سے موجود تھا اور آدم کے لئے وسائل مہیا کرنے کا ذریعہ تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس سیارے پر جنات کی نوع پہلے ہی سے موجود تھی۔ موالید ثلاثہ موجود تھے لیکن ان کی زندگی عناصر کی محتاج تھی اور عناصر اپنی زندگی کی بقاء کے لئے وسائل کے ذی احتیاج تھے۔

آدم کی پیدائش کے بعد حوا (جو آدم کے اندر کا رخ ہے) سامنے آئی۔ آدم حوا سے نسل در نسل لوگ اس طرح پیدا ہوتے رہے جسے آدم سے پہلے اس طفیلی سیارے پر جنات نسل در نسل پیدا ہوتے رہے۔ جب آدم زاد انفرادی شعور سے نکل کر اجتماعی شعور میں داخل ہوا تو ذہن جو محدود سوچ رکھتا ہے، کھل گیا اور گہرائی میں ایک تلاطم برپا ہو گیا۔ دماغ میں ایک گونج ہوئی اس گونج کے ارتعاش نے خیالات کو جنم دیا اور خیالات اس نقطہ پر مرکوز ہو گئے کہ:

کائنات کیا ہے؟ کائنات کیوں ہے؟ کائنات کیسے شروع ہوئی؟ جیسے جیسے انسانی سوچ میں ارتقاء ہوتا رہا۔ یہ سوالات اہمیت اختیار کرتے رہے۔ ارتقائی عمل سے گزرنے والے شعور نے ذہن کی پستی پر جب اپنے اوپر آسمان کو چھت دیکھا تو اس نے چاند سورج، ستاروں کا گھٹنا بڑھنا، ڈوبنا طلوع ہونا شعور کے لئے مزید سوالیہ نشان بن گئے۔ آدم زاد نے سوچنا شروع کے گھٹنے بڑھنے، پیدا ہونے، نشوونما پانے اور فنا ہونے کا نام کائنات۔ اس نے یہ راز جان لیا کہ کائنات مسلسل حرکت ہے ایسی حرکت جو ہر آن ظاہر ہوتی ہے اور دوسری آن آنے سے پہلے مخفی ہو جاتی ہے۔ چاند سورج اور ستاروں کی گردش سے انسان نے یہ سمجھ لیا کہ سیارے اور ستارے کائنات کی بساط ہیں اسی مفروضے کو بنیاد بنا کر ستاروں کے جھرمٹوں اور کہکشاؤں کے پھیلاؤ کی مناسبت سے ستاروں کو شناخت کرنے کے لئے انہیں جانوروں کی شکل و صورت دے دی گئی۔ اگر ستاروں کا جھرمٹ دنبہ کی شکل میں نظر آیا تو اس کا نام مینڈھا، بیل، بچھو، سرطان، شیر وغیرہ رکھ دیا۔

جھرمٹ نے انسانی شکل اختیار کی تو اس کا نام اسی مناسبت سے رکھ دیا۔ یہ سلسلہ دراز چلتا رہا۔ نام تو وہی رہے لیکن قیاس آرائی بڑھتی رہی۔

قیاس آرائی جب ماوریت میں تبدیل ہوگئی تو عقیدہ بن گئی اور سورج کی پرستش ہونے لگی۔ سورج کی پرستش نے غیروں کی پرستش کا دروازہ کھول دیا اور لوگوں نے دیوتاؤں اور دیویوں کو پوجنا شروع کر دیا۔ مذہبی دانشوروں نے اپنے لئے ایک نظریہ حیات بنادیا کہ سورج ہر لحاظ سے بڑا ہے اس لئے یہی پرستش کے لائق ہے۔ اس عقیدے نیانسان کو ایک نہ ختم ہونے والے قیاسی گورکھ دھندے میں گرفتار کر لیا۔ چالاک اور ذہن لوگوں نے مذہبی لبادہ اوڑھ کر اس سے مالی فائدہ اٹھایا اور ماورائی طاقتوں کا خوف مسلط کر کے سیدھے سادے عوام کو اس طرح بے دست وپا کر دیا کہ ان کی چودھراہٹ قائم ہوگئی۔ عوام کو بے دست وپا کرنے کیلئے ایسے ایسے قوانین وضع کئے جن قوانین میں دہشت کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

اس طرح دو گروہ زمین پر من مانی کرنے پر قادر ہو گئے۔ ایک گروہ نے عقیدے کے نام پر عوام کی ناک میں نکیل ڈال دی اور دوسرے گروہ نے خود کو عوام کا خادم کہہ کر کاروبار حیات سنبھال لیا۔ پھر وہ خادم عوام کی محنت سے کمائے ہوئے سرمایہ پر قابض ہو کر خود کو شداد، نمرود اور فرعون کہلانے لگے اور مذہب کے نام لیوالوگوں کا سہارا لے کر خدائی کا اعلان کر دیا۔ اب سورج کی پرستش کی جگہ انسان پرستی نے لے لی اور انسان پرستی کا عروج یہاں تک ہوا کہ شداد نے اپنے پیروکاروں کے لئے زمین پر جنت بنا دی۔

انسانی برادری کے فطین اور چالاک لوگ عوام کو نہ صرف اپنا غلام بنانے کی تدبیریں کرتے رہے بلکہ معبود بن کر مخلوق کو اپنی مخلوق بنانے کی سازشوں میں مصروف ہے۔ ادھر یہ سب ہوتا رہا اور دوسری طرف قدرت عوام کی نگہبانی اور تحفظ کے لئے اپنے برگزیدہ بندہ بھیجتی رہی۔ تاریخ کے صفحات میں دونوں گروہوں کے درمیان پہلا معرکہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے دور میں ہوا۔ بدترین تدبیر سے انہیں منجنیق پر بڑھا کر آگ کے الاؤ میں پھینک دیا لیکن شکست ان کا مقدر بن گئی۔ ان کی دہکائی ہوئی آگ گلزار بن گئی۔

دوسرا بڑا معرکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دور میں ہوا۔ فرعون جو خدائی کا دعویدار تھا اس نے مذہبی پروہتوں اور جادوگروں کو میدان میں طلب کیا۔ فرعون کے پیروکاروں اور دربار میں جنت کے آرزومندوں نے اپنے علم کا جادو جگایا۔ بانس اور رسیاں پھینک دیں۔ بانس اژدھا بن گئے اور رسیاں سانپ بن گئیں۔ خدائی نمائندہ موسیٰ علیہ السلام نے سانپوں سے بھری ہوئی فرعون کے دربار کی زمین پر عصا رکھا تو اس نے اژدھوں کو نگل لیا۔ فرعون کی ظلم وستم رسیدہ قوم کی قدرت نے مدد کی اور اس طرح فرعون کی خدائی دریا برد ہوگئی۔ زمانہ بدلتا رہا فراعین اپنی حشر سامانیوں کے ساتھ آتے رہے اور موسیٰ علیہ السلام کا تشخص بھی برقرار رہا۔

آج پھر عقیدے کی بنیاد پر چالاک لوگ سیدھے سادے عوام کو ایک اللہ، ایک رسول، ایک کتاب پر ایمان رکھنے والوں کو اپنی خواہشات پر بھینٹ چڑھادینا چاہتے ہیں۔ ارتقائی دور کے ابتدائی مرحلہ میں سورج کی پرستش سے یہ کارنامہ انجام دیا گیا تھا۔ فی زمانہ

یہ کام دولت پرستی سے شروع کیا گیا ہے۔ دولت پرستی کسی بھی طرح سورج پرستی سے کم نہیں ہے جو کسی بھی طور پر بت پرستی سے کم نہیں ہے۔

''اور جو لوگ جمع کرتے رہے سونا اور چاندی اور اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کر دیتے ان کے لئے عذاب الیم کی بشارت ہے۔''

(القرآن)

مالک الملک

یہ دنیالاکھوں پریشانیوں، دکھوں اور مصیبتوں کی دنیاہے جس کو ٹٹولئے وہ اندر سے ٹوٹا ہوا ہے۔ بکھرا ہوا ہے، سیماب بنا ہوا ہے، کسی کل چین نہیں، کروٹ کروٹ بیزار، پاش پاش دل، پر نم آنکھ اور ٹپکتے آنسو، پرشکیب پیشانی، غنچہ دہن بسورتا چہرہ، داغ داغ تن، ایمان سے خالی من۔

انسان ایک ایسی اذیت میں مبتلا ہے کہ وہ نہ اذیت سے نکلتا ہے اور نہ ہی اذیت کو قبول کرتا ہے۔ عظیم دنیا ویران اور جنگل بن گئی ہے۔ کوئی خوش نہیں، کسی کو سکون نہیں، افراتفری کے عالم میں ہر شخص اپنی آگ میں جل رہا ہے اور دوسروں کو بھی جلا رہا ہے۔ ایک چہرے پہ ہزار چہرے بنائے انسان خود فریبی کے ایک ایسے جال میں گرفتار ہو گیا ہے کہ نہ کھڑے ہونے کی جگہ ہے اور نہ چلنے کے لئے کوئی راستہ۔ تعصب کے دہکتے ہوئے کوئلہ پر انسان تڑپ رہا ہے۔ نسلی منافرت سے اس کا چہرہ مسخ ہو گیا ہے۔ مسکراہٹ ابلیسیت میں اور اخلاص فریب میں تبدیل ہو گیا ہے۔

میں نے سوچا کہ ایسا کیوں ہے؟ جنت کے باغات جن کا وعدہ کیا گیا ہے کہاں غائب ہو گئے؟ سکون کیوں غارت ہو گیا؟ اطمینان قلب کی کیفیات پر دبیز پردے کیوں پڑ گئے؟ آدم و حوا کی نسل کا قافلہ صحرا میں کیوں بھٹک رہا ہے؟

سوچتے سوچتے میرا شعور خود میرے اندر اتر گیا۔ چاروں اطراف سمٹ کر ایک نقطہ بن گئے۔ نقطہ کے اوپر ایک دائرہ نظر آیا۔ دائرہ پر اور بے شمار دائرے لپٹے ہوئے تھے ان دائروں نے ایک نقطے کی روشنی کو اپنے اندر جذب کر لیا اور پھر یہ دائرے اس نقطے سے دور ہوتے چلے گئے، اتنے دور کہ نقطے کا وجود او جھل ہو گیا۔ کشش اور گریز کے اس مسلسل عمل سے دائروں پر عدم چھا گیا اور پھر ایک ''کون'' میرے اوپر میرے ذہن کے اوپر اور میری نسل کے اوپر مسلط ہو گئی۔ میں نے خود کو تکون کے تین زاویوں میں اس طرح دیکھا جیسے مجھے پابند سلاسل کر دیا گیا ہو جیسے جیسے میرے وجود پر، میری زمین کے وجود پر، میرے ماحول پر گھٹن کا احساس بڑھتا رہا میں اضطراب کے دو پاٹوں میں پستا رہا۔

میں نے دیکھا کہ یہاں ہر سکون، امتحان اور اضطراب کے لئے مہلت ہے اور ہر خوشی، غم و آلام کے لئے ایک وقفہ ہے۔ یہ راز جان کر میری چیخ نکل گئی۔ نبض نبض ڈوب گئی، دل دھڑکنے لگا، آنکھوں کا سیل بہہ نکلا۔ لاشعور و شعور آسمان و زمین ایک دوسرے میں

اس طرح پیوست دیکھے کہ جیسے ایک ورق کے دو صفحے یا ایک بیج کے اندر بہت بڑا درخت۔ تفکر عمیق بہت گہری گھاٹیوں میں سے گزر کر بالآخر میری انا، میری زندگی، میری روح میں اتر گیا، میں نے ایک ہیولیٰ دیکھا، رنگ بدلتے اس ہیولیٰ سے میں نے پوچھا:

"تو کون ہے؟"

میرا سوال فضاء اور پر انوار ماحول میں گونج بن کر نشر ہونے لگا۔

"میں تیری ابدی شناخت ہوں۔ میں اس ہستی کی آواز ہوں جو تجھے عدم سے وجود میں لائی۔ تجھے رہنے کے لئے زمین دی۔ اڑنے کے لئے بال و پر دیئے۔ دیکھنے کیلئے آنکھ دی۔ سوچنے کے لئے دماغ عطا کیا۔ تیرے لئے سماوات کی درجہ بندی کی۔ آسمان کو چھت بنایا اور زمین کو فرش۔ آدم کے نالائق بیٹے گریبان میں منہ ڈال کر سوچ کہ جس زمین پر تو رہتا ہے۔ جس زمین میں سے تو اپنے وسائل نکالتا ہے۔ جو زمین تیرے ارادے اور اختیار کے بغیر تجھے پانی فراہم کر دیتی ہے۔ جس زمین کیلئے تو اپنے باپ اپنے بھائی کو قتل کر دیتا ہے۔ جس زمین کو تو اپنی ملکیت قرار دیتا ہے۔ انسانی جان سے جس زمین کی قیمت تیرے نزدیک زیادہ ہے۔ اس زمین کی ملکیت حاصل کرنے کیلئے تو نے زمین کے اصل مالک اللہ کو کتنی قیمت ادا کی ہے؟

اے جدال! ظالم! جلد باز! اور ناشکرے آدم کے بیٹے! یہ کیسی جہالت، کبر و ظلم اور کیسی بدنصیبی ہے کہ اصلی اور حقیقی مالک اللہ کی زمین پر تو دندناتا پھرتا ہے۔ زمین کا مالک بن بیٹھا ہے تو کیوں نہیں سوچتا کہ جب تو نے گھر، کوٹھی، فیکٹری اور اپنی کھیت کھلیان کی ایک پھوٹی کوڑی بھی قیمت ادا نہیں کی تو کس طرح تیرے اندر ملکیت کا تصور ابھرا؟ تو کس طرح مالک بن بیٹھا؟ اے آدم کی ناسعید اولاد! تو غاصب ہے مکار اور جھوٹا ہے۔ تو نے اللہ کی ملکیت کو اپنی ملکیت بنا کر فراڈ کیا ہے۔ اپنے ضمیر کو سراپا احتجاج بنا دیا ہے۔ تیرے ضمیر کا یہ احتجاج تجھے بے چین اور پریشان کئے ہوئے ہے۔ تجھے اللہ نے زمین مفت اس لئے دی ہے کہ تو اس زمین کو استعمال کر کے خوش رہے۔ ملکیت کا تصور جب تیرے اندر نہیں ہو گا تو قتل و غارت گری کا بازار سرد پڑ جائے گا۔ ایک آدمی کسی دوسرے آدمی کو اپنا گھر عارضی طور پر رہنے کیلئے دیتا ہے۔ وہ آدمی احسان فراموش ہو کر اس مکان کو اپنی ملکیت میں شامل کرنے کا دعویٰ کرتا ہے۔ دنیا کا کوئی قانون اس کو تسلیم نہیں کرتا۔ اے آدم زاد تو کتنا مکار، دغا باز، فریبی اور احسان فراموش ہے کہ خود ہی اپنے بنائے ہوئے قانون کی پاسداری نہیں کرتا۔ اللہ کی زمین پر تو اپنے ہی بنائے ہوئے قانون کو توڑ کر تو نے اللہ کی ملکیت کو بزعم خود اپنی جائیداد بنا لیا ہے۔ بے شک تو ظالم جاہل اور دغا باز ہے۔ ظالم، جاہل اور جلد باز، قانون شکن اور احسان فراموش بندے تو کیسے خوش ہو گا۔ ضمیر کی ملامت کا مارا ہوا انسان کیسے پر سکون رہ سکتا ہے۔

میرے دادا آدم کی نسل، میری بہنوں اور بھائیوں آؤ کہ:

آج عہد کریں کہ اللہ کی زمین پر خوش رہیں گے۔ خوش ہو کر کھائیں گے پئیں گے۔ زمین اللہ کی ملکیت ہے۔ زمین کو اللہ کی ملکیت تسلیم کریں گے۔ بیشک و شبہ یہی حاکم اعلیٰ اور قادر مطلق ہے۔ اللہ ہر قسم کی احتیاج سے مبرا ہے اور مخلوق سراپا احتیاج ہے۔

اشرف المخلوقات

مختصر طور پر زندگی کا تذکرہ کیا جائے تو یہ کہنا مناسب ہے کہ زندگی جذبات سے تعبیر ہے یعنی زندگی بیشمار جذبات پر رواں دواں ہے اور حواس کے دوش پر سفر کر رہی ہے۔ان جذبات کو کنٹرول کرنا بھی حواس کے ذریعے ہی ممکن ہے۔

مثال۔۔۔۔۔ایک آدمی کو پیاس لگی۔پیاس ایک تقاضہ ہے۔پیاس کے تقاضے کو پورا کرنے کیلئے حواس ہماری رہنمائی کرتے ہیں۔

حواس ہمیں بتاتے ہیں کہ پانی گرم ہے۔یہ پانی سرد ہے۔یہ پانی کڑوا ہے یا یہ پانی شیریں ہے۔پیاس کا عمل یا پیاس کا تقاضہ پانی پینے سے پورا ہوتا ہے۔

پانی کی پہچان بھی حواس کے ذریعے ممکن ہے۔ایک تقاضہ پیاس ہے ایک تقاضہ بھوک ہے۔

کسی کو چاہنا ایک الگ تقاضہ ہے آدمی کے اندر یہ تقاضہ پیدا ہونا کہ کوئی مجھے بھی چاہے الگ تقاضہ ہے۔ان تقاضوں کو ایک جگہ جمع کر لیا جائے تو اس کا نام زندگی ہے اور جب ان تقاضوں کو الگ الگ کر کے دیکھا اور سمجھا جائے تو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ہر تقاضہ اس لئے الگ الگ ہے کہ تقاضوں کے اندر مقداریں الگ الگ کام کرتی ہیں۔

پیاس کے تقاضے میں جو مقداریں کام کر رہی ہیں وہ بھوک کے تقاضے میں موجود نہیں ہیں۔اس لئے صرف پانی پی کر ہی بھوک کا تقاضہ رفع نہیں ہوتا۔بھوک کے اندر جو معین مقداریں کام کر رہی ہیں اس کی اپنی الگ ایک حیثیت ہے اس لئے کہ صرف کچھ کھا کر پیاس کا تقاضہ پورا نہیں ہوتا۔تمام حواس الگ الگ تقاضوں کو جانتے ہیں، سمجھتے ہیں۔

انسانی زندگی میں ایک تقاضہ محبت ہے۔محبت ایک ایسا مجموعی تقاضہ ہے جس کے بغیر زندگی ادھوری اور نامکمل رہتی ہے۔حواس محبت کے اس تقاضے کو الگ الگ حیثیت دیتے ہیں۔مثلاً یہ حواس ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ خاتون ہماری بیوی ہے اور یہ لڑکی بیٹی ہے اور یہ خاتون ہماری ماں ہے۔جب ہم محبت کا نام لیتے ہیں تو محبت کا مجموعی مفہوم ہمارے ذہن میں ہماری بیٹی آتی ہے لیکن جب ہم حواس کے ذریعے محبت کو سمجھتے ہیں تو محبت کا مفہوم ایک رہتا ہے لیکن محبت کا طرز عمل بدل جاتا ہے۔ایک عورت ہر حال میں عورت ہے لیکن حواس اس عورت کو الگ الگ تقسیم کرتے ہیں۔حواس ہمیں بتاتے ہیں کہ یہ عورت بہن ہے۔یہ عورت بیٹی ہے

اور یہ عورت ماں ہے اور یہ عورت بیوی ہے۔ بحیثیت عورت اور مرد سب میں قدریں مشترک ہیں لیکن حواس ہمیں بتاتے ہیں کہ مشترک قدروں میں بھی ایک ضابطہ اور قانون موجود ہے۔

بتانا یہ مقصود ہے کہ انسانی زندگی جس بنیاد پر قائم ہے اس کے دو پیر یا دو ستون ہیں۔ ایک پیر یا ستون جذبہ ہے اور ایک پیر یا ستون حواس ہیں۔ جب تک آدمی جذبات کے دائرہ میں رہتا ہے اس وقت تک اس کی حیثیت دوسرے حیوانات سے الگ نہیں ہے اور جب ان جذبات کو وہ انسانی حواس کے ذریعے سمجھتا ہے اور جذبات کی تکمیل میں حواس کا سہارا لیتا ہے تو وہ حیوانات سے الگ ہوتا ہے۔ جذبات اور حواس کا اشتراک انسانوں کی طرح حیوانوں میں بھی موجود ہے لیکن فرق یہ ہے کہ ایک بکری یا گائے حواس میں معنی نہیں پہنا سکتی۔ اس کا علم زندگی کو قائم رکھنے کی ضروریات پوری کرنے تک محدود ہے۔ وہ صرف اتنا جانتی ہے کہ پانی پینے سے پیاس بجھتی ہے۔ پتے کھانے سے بھوک رفع ہوتی ہے۔ اس بات سے اسے کوئی غرض نہیں کہ پانی کس کا ہے۔ اس کے اندر قائم رہنے کیلئے ایک تقاضہ ابھرتا ہے اور وہ تقاضہ پورا کر لیتی ہے اس کے برعکس انسان کے اندر زندگی کو قائم رکھنے کیلئے جب تقاضہ ابھرتا ہے تو وہ حواس کے ذریعے یہ بات سمجھتا ہے یہ تقاضہ کس طرح پورا کیا جاتا ہے۔

چونکہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے حواس کے ذریعے ایک علم عطا کر دیا ہے اس لئے انسان دوسری مخلوق کے مقابلے میں ممتاز ہو گیا ہے اور یہ ممتاز ہونا ہی مکلف ہونا ہے۔ یہ بات واضح طور پر سامنے آگئی ہے کہ زندگی قائم رکھنے کیلئے اللہ تعالیٰ کی تمام مخلوق میں تقاضے یکساں ہیں، آدمی کو بھی بھوک لگتی ہے اور بکری اور بیل کو بھی بھوک لگتی ہے، پیاس آدمی کو بھی لگتی ہے اور پیاس دوسرے حیوانات کو بھی لگتی ہے، دونوں بھوک اور پیاس کے تقاضے کو پورا کرتے ہیں لیکن انسان تقاضوں اور حواس کی الگ الگ حیثیت سے واقف ہے۔ یہ وقوف ہی انسان کو اشرف کے درجہ پر فائز کرتا ہے۔ حواس کے قانون سے واقف ہونا روحانیت میں داخل ہو جانا ہے۔ روحانی علوم میں یہ بات پڑھائی جاتی ہے اور دکھادی جاتی ہے کہ حواس اور جذبات کس طرح تخلیق ہوتے ہیں۔

انسان کے اندر کئی کھرب کل پرزوں سے مشین کام کر رہی ہے۔ کچھ کل پرزے ایسے ہیں جو حواس بناتے ہیں۔ کچھ کل پرزے ایسے ہیں جو جذبات کی تخلیق کرتے ہیں۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے یہ علم عطا کیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو یہ جان لیتا ہے کہ اس کے اندر نصب شدہ مشین میں یہ کل پرزے کس طرح فٹ ہیں اور ان کے ذریعے جذبات اور حواس کس طرح بنتے ہیں۔

جذبات اور حواس کے اعتبار سے انسان اور تمام حیوانات ایک دائرے میں کھڑے ہیں لیکن بکری کے اندر یہ صلاحیت نہیں کہ وہ حواس بنانے کی مشین یا حواس بنانے کے کل پرزوں کو سمجھ سکے۔ اگر کوئی انسان بکری کی طرح اپنے اندر نصب شدہ اس کائناتی نظام کو نہیں سمجھتا تو اس کی حیثیت بلی اور کتے سے زیادہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ بھوک کتے کو بھی لگتی ہے۔ پیٹ کتا بھی بھرتا ہے۔ بھوک آدمی کو بھی لگتی ہے۔

یٹ آدمی بھی بھرتا ہے، پیاس چوہے کو بھی لگتی ہے، پانی چوہا بھی پیتا ہے، پیاس آدمی کو بھی لگتی ہے، پانی آدمی بھی پیتا ہے۔ جبلی طور پر ایک آدمی بھی اپنی اولاد کی پرورش کرتا ہے۔ اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے۔ اپنی اولاد کی تربیت کرتا ہے۔ بالکل اسی طرح ایک بلی بھی اپنی اولاد سے محبت کرتی ہے، اولاد کی پرورش بھی کرتی ہے۔ اپنی اولاد کو دودھ پلاتی ہے اور زندگی گزارنے کیلئے تمام ضروری باتوں سے آگاہ کرکے اپنے بچوں کی تربیت کرتی ہے۔ روحانی نقطہ نظر سے اگر کوئی آدمی سب وہی کام کرتا ہے جو ایک بلی کرتی ہے تو اس کی حیثیت بلی کے برابر ہے۔ اسے بلی سے افضل قرار نہیں دیا جاسکتا۔ کوئی انسان بلی، کتے، چوہے سے اس لئے افضل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے نصب شدہ مشین یا کمپیوٹر کا علم عطا کردیا ہے۔

دل کی باتیں

اک جرعہ مئے ناب سے کیا پائے گا

اتنی سی کمی سے فرق کیا آئے گا

ساقی مجھے اب مفت پلادے کیا معلوم

یہ سانس جو آیا ہے پھر آئے گا

دنیا کی محبت انسان کو بزدل بنادیتی ہے۔وہ موت جیسی حقیقی زندگی سے خوف زدہ رہتا ہے۔نفس پرستی پراگندگی،فتنہ انگیزی اور ظلم ستم عام ہو جاتا ہے۔دوسری قومیں طرح طرح کی سازشوں کے جال بچھا کر اور مال وزر کی لالچ میں مبتلا ہو کر کم ہمت قوموں کو ختم کر دیتی ہیں۔دنیا سے محبت اور موت سے خوف کرنا چھوڑ دیجئے۔یہ عمل سکون راحت اور اطمینان قلب کا باعث بنے گا اور دوزخ آپ کے قریب بھی نہیں پھٹکے گی۔

آؤ یارو!

دلدار کی باتیں کریں۔

فرمایا قلندر باباولیاءؒ نے کہ:

ہر فرد کو چاہئے کہ کاروبار حیات میں پوری پوری کوشش کرے اور نتیجہ اللہ کے اوپر چھوڑ دے۔اس لئے کہ آدمی حالات کے ہاتھوں میں کھلونا ہے۔حالات جس طرح چابی بھر دیتے ہیں آدمی اس طرح زندگی گزارتا ہے۔ہمیں کسی کی ذات سے تکلیف پہنچ جائے تو اسے بلاتوقف معاف کر دو۔اس لئے کہ انتقام اعصاب کو مضمحل کر دیتا ہے۔تم اگر کسی کی دل آزاری کا سبب بن جاؤ تو اس سے معافی مانگ لو اس سے قطع نظر کہ وہ تم سے چھوٹا ہے یا بڑا۔جھکنے میں عظمت پوشیدہ ہے۔

اک آن ہے میخانہ کی عمر اے ساقی

اک آن کے بعد کیا رہے گا ساقی

اک آن میں ہو کہکشاں خاکستر

اک آن کا فائدہ اٹھالے ساقی

حضرت قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں کہ :

مراقبہ صرف ایک عمل کا نام نہیں ہے بلکہ مراقبہ مختلف علوم کے حصول کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ سالک اگر مراقبہ کرے یعنی وہ ذہنی یکسوئی کے ساتھ اس بات پر متوجہ ہو جائے کہ وہ خود اللہ کی صفت رحیمی کا جز ہے تو اس کے اوپر تخلیقی علوم منکشف ہو جاتے ہیں۔

شب بیداری کے دوران حضور قلندر بابا اولیاءؒ کی باطنی نگاہ متحرک ہوئی تو انہوں نے سامنے پڑی مٹی کو دیکھا۔ مٹی کے ذرات سے گفتگو کی۔ مٹی نے نہیں بتایا، ماضی میں میرے ہر ذرے کی اپنی ایک ہستی تھی ان مٹی کے ذرات میں سے کوئی ذرہ برہمن تھا، کوئی ذرہ واعظ تھا، کوئی ذرہ گداگر تھا، کوئی ذرہ بادشاہ وقت تھا۔ آج یہ حال ہے کہ بادشاہ، گداگر، واعظ اور برہمن مٹی کے ایسے ذرات ہیں جن کو خود ان کی اولادیں پیروں تلے روندتی پھرتی ہیں۔

طرز فکر

انسان کا کردار اس کی طرز فکر کی تعمیر کرتا ہے۔ طرز فکر میں پیچ ہے تو کردار بھی پیچیدہ بن جاتا ہے۔ طرز فکر سادہ ہے تو بندے کی زندگی میں سادگی داخل ہو جاتی ہے۔ طرز فکر اگر سطحی ہے تو بندہ سطحی طریقہ پر سوچتا ہے۔ طرز فکر اگر گہری ہے تو بندہ ہر چیز کے اندر گہرائی تلاش کرنے کے لئے تفکر کرتا ہے۔ اللہ کریم نے حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ میں اسی طرز فکر کی نشاندہی کی ہے۔ ہزاروں لاکھوں افراد کی موجودگی میں ایک فرد واحد کی سوچ الگ ہے اور اس سوچ میں حقیقت پسندی اور گہرائی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایک خاص طرز فکر کے لوگوں میں رہتے ہوئے بھی طرز فکر الگ ہو سکتی ہے۔ یہ حقیقت پسندانہ طرز فکر کہاں سے منتقل ہوئی۔ جبکہ پورے ماحول میں کہیں نظر نہیں آتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حقیقت پسندانہ طرز فکر انسان کے اندر موجود ہے لیکن ہر آدمی اسے استعمال نہیں کرتا۔ حضرت ابراہیمؑ سے ان بت پرستوں نے سوال کیا کہ ان خداؤں کو کس نے توڑا؟ حضرت ابراہیمؑ نے جواب دیا اپنے خداؤں سے پوچھ لو۔ لوگوں کے سامنے یہ بات آگئی تھی کہ بت اپنی مرضی اور منشاء استعمال نہیں کر سکتے اور انہیں توڑا جا سکتا ہے لیکن ان کے اندر پھر بھی حقیقت پسندی نے حرکت نہیں کی۔

روحانی راستے کے مسافر کی طرز فکر میں تبدیلی اس طرح واقع ہوتی ہے کہ روحانی استاد یا پیر و مرشد بتدریج اپنے شاگرد سے اس قسم کی باتیں کرتا ہے جو اس کے ماحول میں موجود نہیں ہوتیں یا ماحول میں رہنے والے لوگ اس طرف توجہ نہیں دیتے۔ مرشد کریم مرید کے اندر اس بات کو راسخ کر دیتا ہے کہ وہ چیز مفروضہ ہے اس کو حقیقت نہیں کہا جا سکتا۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ باوجود اس کے کہ آدمی خود کو با اختیار سمجھتا ہے زندگی کے شب و روز میں اس کو کہیں بھی اختیار نہیں ہے۔ پیدا اپنے اختیار سے نہیں ہوتا، پیدائش کے بعد بالکل غیر اختیاری طور پر بڑھتا ہے۔ جوانی کے بعد نہ چاہنے کے باوجود بوڑھا ہو جاتا ہے۔ دنیا کا ایک فرد واحد بھی یہ نہیں چاہتا کہ وہ مر جائے لیکن جب وہ پیدا ہوتا ہے تو مرنا ضرور ہے۔ آدمی کو اس بات پر تو اختیار نہیں ہے کہ وہ ساری زندگی کھانا نہ کھائے یا ساری زندگی پانی نہ پئے یا ہفتوں مہینوں بیدار رہے۔ یہ تمام باتیں ایسی ہیں جو ہر لمحے آدمی کے ساتھ چپکی رہتی ہیں۔ لمحات، گھنٹے، دن، مہینے اور سال یہ تغیر ایک ایسا تغیر ہے جسے کوئی باہوش آدمی انکار نہیں کر سکتا۔ ان تمام تغیرات کی نشاندہی کر کے مرشد کریم بتاتا ہے کہ اس کے تغیر کے پیچھے یہ حقیقت چھپی ہوئی ہے کہ کوئی ذات ایسی ہے جس کے ہاتھ میں اس تغیر و تبدل کی ڈوریاں ہیں اور وہ ہاتھ ان ڈوریوں کو جس طرح حرکت دیتا ہے زندگی میں تغیر واقع ہوتا ہے۔ سالک جب دن رات ایسے مشاہدات سے گزرتا

ہے جن کے اوپر غیر روحانی آدمیوں نے پردہ ڈالا ہوا ہے تو اس کا ذہن خود بخود اس مطلق ہستی کی طرف رجوع ہو جاتا ہے جس ہستی نے تغیر و تبدل کی ڈوریاں سنبھالی ہوئی ہیں۔

طرز فکر کا یہی بیج جو مرشد کریم دماغ میں بو دیتا ہے پھر اس بیج کو پروان چڑھانے کیلئے مرشد کریم مزید کوشش اور جدوجہد کرتا ہے وہ ایسے برگزیدہ بندوں کو سامنے لاتا ہے جن کی طرز فکر میں حقیقت پسندی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے مثلاً وہ اپنے تصرف سے مرید کو خواب کی ایسی دنیا میں لے جاتا ہے جس دنیا میں اولیاء اللہ اور پیغمبروں کی زیارت اسے نصیب ہوتی ہے۔ مسلسل اور متواتر خوابی مشاہدے کے بعد اس کا رخ اولیاء اللہ اور پیغمبروں کی طرف مڑ جاتا ہے اور اس کی طرز فکر پر ایسا رنگ چڑھ جاتا ہے جو رنگ اولیاء اللہ اور پیغمبروں کے لئے مخصوص ہے۔

اس کی باطنی آنکھ پر مرشد کریم ایسا عینک لگا دیتا ہے کہ عینک کے اندر لگے ہوئے شیشے اس کو وہی کچھ دکھاتے ہیں جو مرشد کریم کی طرز فکر ہے مثلاً عینک کے اندر جس رنگ کے گلاس لگے ہوتے ہیں۔ آدمی کو وہی رنگ نظر آتا ہے۔ عینک کے گلاس اگر نیلے ہیں تو ہر چیز نیلی نظر آتی ہے۔

گلاس اگر سرخ ہیں تو ہر چیز سرخ نظر آتی ہے۔ گلاس اگر شفاف ہیں تو ہر چیز اسے صاف اور واضح نظر آتی ہے۔ عینک کے شیشے اگر دھندلے ہیں تو ہر چیز اسے دھندلی نظر آتی ہے۔ اگر عینک کے شیشے اندھے ہیں تو عینک کے شیشے آنکھ پر لانے کے باوجود آنکھ اندھی رہتی ہے کچھ نظر نہیں آتا۔ حالانکہ عینک لگنے کے بعد آنکھ کھلی رہتی ہے۔ رنگ دراصل طرز فکر ہیں عینک کے اندر جس قسم کی طرز فکر کا گلاس فٹ کر دیا جاتا ہے وہی طرز فکر کام کرتی ہے۔ عینک کے اندر شیشہ اتنا صاف شفاف ہوتا ہے کہ آدمی میلوں دور کی چیزیں دیکھ سکتا اس کے برعکس عینک میں لگا ہوا گلاس اتنا اندھا بھی ہوتا ہے کہ عینک لگانے کے بعد آدمی کو اتنا بھی نظر نہیں آتا جتنا کہ عینک لگائے بغیر نظر آتا ہے۔ دیکھنا، چیزوں کی ماہیت معلوم کرنا، تفکر کرنا ہر آدمی کے اندر موجود ہے بات صرف اتنی ہے کہ ہمیں ان صلاحیتوں کا استعمال نہیں آتا۔ مرشد چونکہ تفکر کی صلاحیتوں کے استعمال کو جانتا ہے اور اس کی زندگی تفکر سے تعمیر ہوئی ہے اس لئے مرید کے اندر جب مرشد کی صلاحیت منتقل ہوتی ہے تو تفکر کا بویا ہوا بیج آہستہ آہستہ تناور درخت بن جاتا ہے اس بیج کو تناور درخت بننے میں جو چیز رکاوٹ بنتی ہے وہ آدمی کا اپنا ذاتی ارادہ اور عقل ہے۔ کوئی بندہ جب اپنی ذات کو سامنے لے آتا ہے اور عقل کو وہ سب کچھ سمجھ لیتا ہے تو اسے کامیابی نہیں ہوتی۔ اس لئے کہ اس کے اندر جو شعور کام کرتا ہے اس کا تعلق اس طرز فکر سے ہے جس طرز فکر میں گہرائی اور حقیقت پسندی نہیں ہے۔

روپ بہروپ

آدم کو جب اللہ نے بنایا تو اس طرح بنایا کہ آدم اندر زیادہ دیکھتا تھا اور باہر کم۔ باہر دیکھتا تھا تو باغوں وطیور، نہریں، آبشاریں، بلبل کا ایک شاخ سے دوسری شاخ پر پھدکنا، کوئل کی کوک، کبوتر کی غٹرغوں، چڑیوں کی چہک، فاختہ کی کوکو سنتا تھا۔ رنگ رنگ پھولوں کا مستی بھرا شباب، جوانی کی خوشبو اور خوشبو کی مہک سے مشام جاں عطر بیز محسوس کرتا تھا۔ آدم ایک بے خود کر دینے والی کیفیت میں گم ہو جاتا تھا۔ خوبصورت روشیں، راہ گزر پر قطار در قطار ہوا میں جھومتے پھول، سرو قد درخت، چھتری چھتری پیڑ نظر آتے تھے۔ ان سب میں دل لگانے کے باوجود آدم کے اندر ایک ٹیس ابھرتی تھی۔ کلیجہ منہ کو آتا تھا، گھٹن آنکھوں سے ٹپکتی تھی کہ آدم کا ہم جنس کوئی نہیں تھا۔ ہم جنس کو تلاش کرتے کرتے جب وہ تھک گیا اندر سے ٹوٹ گیا، بکھر گیا تو آدم کو بکھرے ہوئے ذرات میں اپنی ہم جنس کا عکس دکھائی دیا۔ تصویر کا غلاف آنکھوں، چاند، چہرا، غنچہ دہن، تبسم تبسم ہونٹ، صراحی گردن، سیمیں بدن، غلافی آنکھیں، مقناطیسی کمر، معطر سراپا، قدرت کا شاہکار تصویر کو دیکھا تو آدم اس پر فریفتہ ہو گیا۔ جب اسے اپنے اندر اپنی ہی تصویر کا دوسرا رخ نظر آیا تو تصویر پر اس کا ذہن مرکوز ہو گیا۔ ذہن میں مرکزیت آئی تو ارادہ پیدا ہوا۔ ارادے میں حرکت ہوئی تو اندر موجود اس تصویر نے پلک جھپکی، پلکوں کا جھپکنا تھا کہ آدم کے دل میں پہلے سے موجود روشن نقطہ کھل گیا۔ روشنی اور نور کا ایک ساتھ جھماکہ ہوا اور آدم کے اندر سے تصویر باہر آ گئی۔ آدم ایک قدم آگے بڑھا تو تصویر دو قدم آدم کی طرف آئی۔ دونوں کا باہم اتصال ہوا اور آدم و حوا ایک دوسرے میں جذب ہو گئے۔ آدم نے جذب ہونے کے لئے خود کو حوا کے سپرد کر دیا اور حوا نے آدم کو اس کی پوری صلاحیتوں اور توانائی کے ساتھ اپنے اندر سمیٹ لیا۔ یہ جذب ہونا اور سمٹ کر دونوں کا ایک ہو جانا فطرت کو پسند آیا۔ فطرت نے انگڑائی لی، فطرت کو یوں بے تاب دیکھ کر اس کی دادرسی کے لئے جبلت نے اپنا چولا اتار پھینکا، فطرت اور جبلت آپس میں یک جان دو قالب بن گئیں۔ آدم اور حوا فطرت اور جبلت کے سنجوگ کو دیکھ کر کائنات سرشاری میں نیچے اتر آئی اور اس طرح نزول و صعود شروع ہو گیا۔ کائناتی قانون یہ بنا کہ جب دو صورتیں ایک دوسرے میں جذب ہو نگی تو تیسری تخلیق عمل میں آ جائے گی۔ قانون کی عمل داری کے بعد ایک تصویر سے دوسری تصویر اور دو تصویروں کے ملاپ سے تیسرا وجود عالم مظاہر میں آنے لگا۔ آدم کے بیٹوں حوا کی بیٹیوں سے زمین اور بستیاں آباد ہو گئیں اور بستیاں شہر بن گئیں۔

ایک شہر میں ایک باپ اور اس کے چار بیٹے رہتے تھے۔ باپ نے چاروں بیٹوں کی تربیت اس طرح کی تھی کہ چاروں بیٹے ایک ہی جان کے الگ الگ حصے تھے۔ سب میں ایثار تھا، سب میں محبت تھی اور سب ایک دوسرے کے کام آتے تھے۔ سب میں ایک ہی ماں کا خون دوڑ رہا تھا۔ ماں تا ایک تھی ماں تا کے مظاہر چار تھے۔ چاروں گبرو جوان نکلے، چاروں جب زمین پر چلتے تو زمین اپنے وجود کو اور زیادہ پھیلا لیتی تھی۔ سچی بات یہ ہے کہ زمین ہی سب سے بڑی ماں ہے جب بچوں نے زمین کی کوکھ کر کرید اتوان کے لئے خود کو لہلہاتے کھیت اور کھلیانوں میں تبدیل کر دیا۔

چار بیٹے جب اپنے اندر آگ کی تپش سے جھلسنے لگے تو انہوں نے اپنے باپ آدم کے سبق کو دہرایا۔ بالآخر یہ چاروں بیٹے آدم و حوا کے روپ میں بہروپ بن گئے۔ وہ آدم اپنی حواؤں کو لے کر الگ ہو گئے۔ وہ بھائی الگ نہیں ہوئے، بڑے بھائی نے سوچا کہ چھوٹا بھائی ابھی کمزور ہے۔ میرے اوپر فرض ہے کہ میں اس کی مدد کروں، بڑے بھائی نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ روزانہ گیہوں کی کوٹھی میں سے اتنا گندم نکال لیتا تھا کہ جتنا روز کا خرچ تھا۔ چھوٹے بھائی نے سوچا کہ میں چھوٹا ہوں، بڑے بھائی کے اعصاب پر انحطاط آ گیا ہے، چھوٹا بھائی ہونے کے ناطے میرا فرض ہے کہ بھائی کی خدمت کروں۔ اس نے بھی یہ طریقہ اختیار کیا کہ روزانہ کا خرچ اپنے گیہوں کی کوٹھی سے بھائی کی کوٹھی میں ڈالنا شروع کر دیا۔

ایک سال گزرا دو سال گزرے، تین سال گزر گئے۔ گھر خوشحال اور سکون کا گہوارہ تھا۔ چوتھا سال آیا، بڑے بھائی کی جورو نے یہ کام کیا کہ بڑا بھائی چھوٹے بھائی کی کوٹھی میں جتنا گندم ڈالتا تھا وہ اس سے دگنا نکال لیتی تھی۔ چھوٹے بھائی کی بیوی نے سوچا کہ میرے شوہر کی کمائی بڑے بھائی کو جا رہی ہے اس نے یہ کام کیا کہ اگر چھوٹا بھائی بڑے بھائی کی کوٹھی میں ایک کلو گندم ڈالتا تو وہ چار کلو گندم نکال لیتی۔ ابھی ایک سال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ دونوں بھائی کنگال ہو گئے۔

مساجد

سن ایک ہجری تک اسلامی حکومت مدینہ منورہ کے چند محلوں تک محدود تھی۔ فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو رسول ﷺ کی زندگی میں دس سال کے قلیل عرصہ میں اسلامی فتوحات میں روزانہ ۲۷۶ میل کا اضافہ ہوتا رہا۔ سن گیارہ ہجری میں فخر موجودات رسالت مآب ﷺ کی تعلیمات اور امت کے لئے اسلامی پروگرام کی بنیاد پڑی۔ ہم جب اسلامی نظام اور امت مسلمہ کے لئے ضابطہ حیات کا مطالعہ کرتے ہیں تو قرآن ہماری رہنمائی اس طرف کرتا ہے کہ اسلام اجتماعی اقدار اور اجتماعی زندگی گزارنے کا نام ہے۔

اسلام میں کچھ عبادات فرض ہیں ان میں بھی اجتماعی حیثیت برقرار ہے۔ اسلام نے اجتماعی حیثیت کو قائم رکھنے کے لئے دن میں پانچ وقت کی نماز، سال میں تیس روزے اور صاحب استطاعت لوگوں پر حج فرض کیا ہے۔ اجتماعی حیثیت میں عبادت کرنے کے لئے مسجد کا اہتمام ہوا۔ مسجد دراصل محلے میں رہنے والے مسلمان افراد کے لئے ایک میٹنگ پلیس ہے۔ جہاں لوگ اکٹھے ہو کر اجتماعی طور پر عبادت کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کا دکھ درد بانٹتے ہیں اور جب یہ نیک نفس حضرات و خواتین نماز باجماعت میں دو مرتبہ السلام علیکم کہتے ہیں تو اس عمل سے اجتماعی محبت، اجتماعی ہمدردی، اجتماعی اخوت کے جذبات لاشعوری طور پر دل میں موجزن ہوتے رہتے ہیں۔ جمعہ کے روز بڑے اجتماع میں یہ رمز مخفی ہے کہ ملت اسلامیہ کے دانشور قوم کے ان افراد کو ساتھ لے کر مملکت کو درپیش مسائل پر تبادلہ خیالات کریں اور مملکت کی فلاح و بہبود کے لئے لائحہ عمل متعین کریں۔ قوم کی معاشی حالت کو بہتر بنائیں۔ معاشرے کی برائیوں کو دور کرنے اور فسق و فجور سے بچنے کی تدابیر نکالیں۔ نماز جمعہ کی افادیت کو سامنے رکھتے ہوئے جب ہم عیدین کی نماز کے حکم پر تفکر کرتے ہیں تب بھی یہ بات سامنے آتی ہے کہ شہر کے گوشے گوشے، مضافاتی بستیوں اور قریہ قریہ سے مسلمان ایک مقام، ایک میدان اور ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر محبت، اخوت کے ساتھ مصافحہ کرتے ہیں، گلے ملتے ہیں، مبارک باد دیتے ہیں اور خوشی کے جذبات سے ایک دوسرے کو پیار کرتے ہیں۔ صاف ستھرے لباس میں بچے رشتہ دار، دوست احباب اور پڑوسی مسرت و شادمانی سے لبریز دل کے ساتھ بلاامتیاز ذات، برادری، امارات و غربت، نیک و بد اور بلا تخصیص مساک گھروں میں جا کر شیر خرمہ کھاتے ہیں اور گھر والے انہیں خوش آمدید کہتے ہیں۔ بچے اس لئے خوش ہوتے ہیں کہ انہیں عیدی ملتی ہے۔ چھوٹے اس لئے مسرور ہوتے ہیں کہ ان کے سروں پر

بزرگ دست شفقت رکھتے ہیں۔ بزرگ اس لئے خوش ہوتے ہیں کہ انہیں بچوں میں اپنی گزری ہوئی معصومیت نظر آتی ہے۔ بیوی اس لئے خوش ہوتی ہے کہ اچھا شوہر اس سعید خوشی کے موقع پر اپنی رفیق حیات کو تحفہ پیش کرتا ہے بچوں کیلئے اجلے کپڑوں کا اہتمام کرتی ہے اور نہایت فراخدلانہ میزبانی کے فرائض انجام دیتی ہے۔ بیٹیوں کی خوشی ان کے چہرے سے عیاں ہوتی ہے، جب شاپنگ کرتی ہیں، چوڑیاں پہنتی ہیں، ہاتھوں میں مہندی کے نقش و نگار بناتی ہیں۔

رمضان المبارک کے مہینے میں تیس روزے ہمیں تفکر کی دعوت دیتے ہیں کہ بندے کا اور اللہ کا ایک براہ راست تعلق قائم ہے۔ خود اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

"روزے کی جزا میں خود ہوں۔"

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"اے رسول اکرم ﷺ! میرے بندے جب آپ سے میرے بارے میں سوال کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں ان کے قریب ہوں جب وہ مجھے پکارتے ہیں تو میں ان کی پکار سنتا ہوں۔"

لیلۃالقدر

انسانی زندگی کا مطالعہ ہمارے اوپر یہ باب روشن کرتا ہے کہ ہر انسان دو حواس میں زندگی گزار رہا ہے۔ایک قسم کے حواس اسفل زندگی کی طرف متوجہ رہنے پر مجبور کرتے ہیں اور دوسری قسم کے حواس ہمیں آزاد دنیا(جنت) سے روشناس کرتے ہیں۔عام دنوں کے برعکس روزہ ہمیں ایسے نقطے پر لے آتا ہے جہاں سفلی حواس کی گرفت ٹوٹ جاتی ہے اور ہم اجتماعی شعور میں داخل ہو جاتے ہیں۔روزے میں اجتماعیت کا عمل دخل اتنا واضح ہے کہ کوئی آنکھ کا اندھا بھی مشاہدہ کر سکتا ہے۔سحری کا وقت ختم ہونے کے بعد مسجد میں اللہ اکبر کی صدا بلند ہوتی ہے تو کروڑوں مسلمان اس ایک آواز پر منہ بند کر لیتے ہیں اور اپنے اوپر حلال چیزوں کو حرام کر لیتے ہیں، نہ کھانا کھاتے ہیں، نہ پانی پیتے ہیں۔تیرہ چودہ گھنٹے کے بعد مساجد سے پھر اذان نشر ہوتی ہے اور لوگ اجتماعی طور پر اللہ کے دیئے ہوئے رزق سے اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ روزے میں یہ حکمت ہے کہ روزے رکھنے سے تزکیہ نفس ہوتا ہے اور اس عبادت کے نتیجے میں انسان کے اندر روح کی بالیدگی اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ اعلیٰ حواس کا سفلی حواس پر غلبہ ہو جاتا ہے تو اس کے اندر دیکھنے کی، سمجھنے کی، محسوس کرنے، چھونے اور غیب کی دنیا میں داخل ہونے کی رفتار ساٹھ ہزار گنا بڑھ جاتی ہے۔ ساٹھ ہزار گنا پرواز کی رفتار کو تلاش کرنے کیلئے رسول اللہ ﷺ نے شب قدر کا پرو گرام دیا ہے۔

''ہم نے یہ اتارا شب قدر میں اور آپ کیا سمجھے کیا ہے شب قدر، شب قدر بہتر ہے ہزار مہینے (ساٹھ ہزار دن رات کے حواس) سے شب قدر میں اپنے رب کے حکم سے روح اور فرشتے اترتے ہیں۔ہر امر پر امان ہے وہ رات صبح کے نکلنے تک۔''

قرآن پاک نے جس رات کا نام لیلۃالقدر رکھا ہے۔وہ دراصل رمضان کی تکمیل کا ایک حصہ ہے۔اس حصہ کی تکمیل سے اللہ تعالیٰ کا یہ فرمان کہ روزے کی جزا میں ہوں بندے پر صادق آجاتی ہے۔

لیلۃالقدر کے حصول یعنی حواس کی رفتار ساٹھ ہزار گنا ہونے کے بعد بندے کو اللہ تعالیٰ سے جو قربت حاصل ہوتی ہے اور بندے کے اوپر اللہ کی نشانیاں روح اور فرشتوں سے ملاقات کا عمل سامنے آتا ہے تو اس عظیم نعمت کے حصول کے بعد مومن دوگانہ نماز عید ادا کرتا ہے۔وہ غیب کی دنیا سے متعارف ہونے کی خوشی میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہے اور اس خوشی کو اجتماعی طور پر مصافحہ کر کے بغل گیر ہو کر مسلمانوں میں تقسیم کرتا ہے۔یہی عید کا مفہوم ہے اور یہی عید کی خوشی ہے۔

یہی وہ ملت اسلامیہ کی اجتماعی حیثیت ہے جس کی وجہ سے بازوؤں میں طاقت، دلوں میں اخوت اور قدرت نے ان کی تلوار میں ضرب کی اتنی صلاحیت پیدا کر دی تھی کہ تعداد میں کم ہونے کے باوجود حق و باطل کے پہلے معرکہ میدان بدر میں اپنے سے تین گنا طاقت رکھنے والے دشمن کو (جو اس زمانے کے اعتبار سے بہترین اسلحہ سے مسلح تھا) شکست فاش دے دی۔

اغیار یہ بات جان گئے ہیں کہ ملت اسلامیہ کے ہر عمل میں فوجی اسپرٹ موجود ہے۔ اگر یہ فوجی اور عسکری وقار برقرار رہا تو ایک دفعہ مسلمان سارے عالم پر حکمران ہو جائے گا۔ دس ہزار انسانوں کا یک جان دو قالب قافلہ جس زمین کی طرف رخ کرے گا وہ زمین اس کی گلزار بن جائے گی۔ ہماری طاقت، ہماری قوت اور ہماری عسکری تنظیم کا وقار بلند کرنے کے لئے ہر سال عید ہمیں دعوت اتحاد و یگانگت دیتی ہے۔

آیئے اس مرتبہ عید کی صدا پر کان دھریں اور اپنے اندر سے تفرقہ کو ختم کر دیں۔ اللہ کے حکم کی فرمانبرداری کرتے ہوئے اللہ کی رسی کو اجتماعی طور پر متحد ہو کر مضبوطی کے ساتھ پکڑ لیں تاکہ بدر میں ہمارے اسلاف کی طرح ہماری فتح میں معاون بننے کیلئے ہمارے اوپر فرشتے نازل ہوں۔

حوا

کوئی نظام اسی وقت نظام کا درجہ پاتا ہے جب اس کی بنیادیں مستحکم ہوں اور اس نظام کو چلانے والے اس کی حفاظت میں کمربستہ رہیں۔ زمین پر آدم و حوا کے وجود کے ابتدائی مرحلہ سے لاکھوں سال بعد تک معاشرتی نظام قائم ہے۔ جیسے جیسے شعوری ارتقاء ہوتا رہا معاشرے کی بنیادیں تو وہی رہیں لیکن ضروریات کے مطابق اصلاح و تجدید ہوتی رہی۔ آدم و حوا جنت سے جب زمین پر آئے تھے اس وقت ستر پوشی کا نظام قائم ہو گیا تھا۔ زمین پر آدم و حوا کی نسل بڑھی تو زندہ رہنے کے لئے وسائل کی پیداوار اور تقسیم کا عمل شروع ہوا۔ پھر یہ معاشرہ اور ایک عورت اور ایک مرد کی حسن تدبیر سے خاندان، قبائل، قوم اور ملک کی صورت اختیار کرتا چلا گیا۔ زندہ رہنے اور حیوانات سے ممتاز ہونے کیلئے آدم نے (اپنے اس علم سے جو اسے یوم ازل میں منتقل ہو چکا تھا) قوانین بنائے۔ ہابیل قابیل دونوں بھائیوں میں سے ایک بھائی نے جب اپنے باپ آدمؑ کے بنائے ہوئے قانون کو ضد، ہٹ دھرمی اور اپنی انا سے توڑ ڈالا تو زمین پر پہلا قتل ہوا یعنی قانون توڑنے کا پہلا ردعمل، اولاد آدمؑ کے سامنے قتل کی صورت میں ظاہر ہوا۔

آدمؑ نے اپنے پیغمبرانہ علم کی روشنی میں انسانی نسل کے لئے جو معاشرتی قوانین ترتیب دیئے وہی دین حق کی بنیاد ہے۔ اسی بنیاد پر اصلاحی کام شروع ہوا۔ مرد اور عورت دونوں کے حقوق کا تعین ہوا، دونوں کے حقوق و فرائض متعین کر دیئے گئے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہوشیار اور خود غرض لوگوں نے اس معاشرے میں قد غن لگائی اور اصلاحی معاشرہ تخریبی معاشرہ بن گیا۔ مرد چونکہ اعصابی طور پر مضبوط تھا اس نے چالاک حکمت عملی کے تحت زور بازو پر ہر چیز کو اپنی ملکیت بنالیا۔ آدمؑ کا بنایا ہوا قانون کہ ''مرد عورت دونوں ایک دوسرے کے لباس ہیں اور دونوں اس طرح مساوات کے عمل میں شریک ہیں کہ ہر کوئی اپنا فرض پورا کرے۔ اپنا حق حاصل کرے کسی کے حق پر غاصبانہ قبضہ نہ کرے اور اپنا حق نہ چھوڑے۔''

لیکن عمل نہیں ہو سکا کیونکہ معاشرہ مرد اور عورت (دو یونٹ) کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لئے مرد نے پہلی ضرب عورت پر لگائی اور وہ یہ بھی بھول گیا کہ مرد کی پیدائش اور تخلیق کے عمل میں مرد کے کردار کے مقابلے میں عورت کا کردار تین حصے زیادہ ہے۔ جنسی غلبے نے آدم زاد کو حیوانات سے زیادہ مغلوب کر دیا اور اس طرح عورت کو گھریلو استعمال کی ایک چیز سمجھا جانے لگا۔ بھیڑ، بکریوں کی طرح اس کی خرید و فروخت ہونے لگی۔ مرنے والے مرد کے مال کے ساتھ عورت وراثت میں تقسیم ہو جاتی

تھی۔ یورپ میں عورت کی وقعت اس حد تک کم تھی کہ وہ عورت کو انسان تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے۔ ہندوستان میں عورت کو خاوند کے ساتھ ستی کر دیا جاتا تھا یعنی خاوند کے ساتھ زندہ جلا دینا عورت کا مقدر بنا دیا گیا تھا۔

وہی یورپ جو عورت کو انسان کا درجہ دینے پر تیار نہیں تھا انقلاب فرانس کے بعد اتنا ضرور نیچے آیا کہ عورت کو مرد کی خادمہ تسلیم کر لیا گیا۔

زمانہ کے نشیب و فراز کے ساتھ زمین پر فساد برپا ہوتا رہا اور آدم کا بیٹا زمین کو اجاڑنے کے منصوبے بناتا رہا پھر حرص و ہوس اور اقتدار کی بھٹی میں ایسے ایسے مہلک ہتھیار بنائے کہ زمین پر شگوفے کھلنے کی بجائے آگ و خون کا بازار گرم ہو گیا۔ اقتدار کی خواہش نے لاکھوں مردوں کو لقمہ اجل بنا دیا۔ مرد کم ہو گئے تو عورتوں کی کثرت سے نئے نئے مسائل سامنے آئے۔ عورتیں پاگل ہو کر سر بازار آ گئیں۔ زمین پر آدم کی نسل کم ہونے لگی تو مرد سر جوڑ کر بیٹھے اور عورت کو ایسی آزادی دی کہ معاشرہ مزید درہم برہم ہو گیا۔ غیر جانبدارانہ سوچ بتاتی ہے کہ اس میں بھی مرد کی خود غرضی سے صرفِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔

سوال یہ ہے کہ سب کچھ مرد ہی کیوں کرتے ہیں؟ کیا عورتوں میں عقل و شعور نہیں ہے؟ کیا عورت مرد کی ماں نہیں ہے؟ کیا وہ عضو معطل ہے؟ کسی بھی زمانے میں مرد نے اپنی طاقت مضبوط اعصاب، شیطنت اور مکر و فریب سے عورت کو اقتدار میں اپنے برابر نہیں بٹھایا۔ اب جبکہ عورت کے حقوق دینے کی باتیں ہو رہی ہیں تو مساوات کے نام پر عدم مساوات کی تحریکیں چلائی جا رہی ہیں۔ مادی چکا چوند میں معاشرے کو تباہی کی طرف دھکیلا جا رہا ہے یہ بھی زمین پر آباد پرامن لوگوں کے خلاف ایک سازش ہے۔ عورت اور مرد معاشرے کے دو اہم رکن ہیں جس طرح مرد کے بغیر کوئی معاشرہ قائم نہیں ہو سکتا اسی طرح معاشرے کے اہم ترین رخ عورت کو اگر الگ کر دیا جائے تو سارا کائناتی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ خالق کائنات تخلیق کرنے والوں میں بہترین خالق ہے۔ کائناتی معاشرے کو دو رخوں پر بنایا ہے اور بار بار پیغمبروں کے ذریعے اس کی وضاحت کرائی ہے۔ حضرت آدمؑ سے لے کر سیدناﷺ تک ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبروں نے ایک ہی بات کو دہرایا ہے کہ:

''عورت اور مرد دو رخوں کی تخلیق ہے عورت اور مرد دونوں کے اپنے اپنے فرائض ہیں جب بھی ان فرائض منصبی کو کم وقعت سمجھا جائے گا۔ معاشرہ میں ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہو جائے گا۔''

یہ اللہ کا قانون ہے اس قانون نے عورتوں کو مساوی حقوق دیئے ہیں۔ معاشرے کی تعمیر میں عورت کا بھرپور کردار ہے۔ وراثت میں اسے حصہ دار بنایا ہے بالغ عورت کو کسی کے ساتھ نکاح پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ شوہر کے لئے عورت کے حقوق ادا کرنا اور اسے خوش رکھنا اور اس پر خرچ کرنا اللہ نے عبادت قرار دیا ہے۔ عورت کے اوپر بھی مرد کے حقوق قائم کئے ہیں عورت کو معاشرے کی تعمیر میں ایک اہم کردار ادا کرنے یعنی اولاد اور نسل انسانی کی صحیح تربیت اور تعلیم کی ذمہ داری سونپی گئی ہے۔

موجودہ سائنسی اور مادیت گزیدہ معاشرے میں عورت کے اوپر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے دیئے ہوئے حقوق کی حفاظت کرے، اپنی انا کو ٹٹولے اور دیکھے کہ اس کے کاندھوں کو قدرت نے کتنا طاقت ور اور مضبوط بنایا ہے۔ عورت پر لازم ہے کہ وہ اپنی نسل اور اولاد بیٹے اور بیٹیوں کو بتائے کہ مادی اقتدار عارضی ہے۔ مادی زندگی فریب کے لباس میں قید ہے۔ محض مادی اقتدار قوموں کے زوال کی علامت ہے۔

مادی اقتدار کے پجاری اخلاقی قدروں کو پامال کر دیتے ہیں اور زمین آگ کا دریا بن جاتی ہے اور اس آگ میں مرد اور عورت دونوں جل کر بھسم ہو جاتے ہیں۔

اے عورت! تو میری ماں ہے تو نے مجھے جنم دیا ہے عدم سے وجود میں لانے کے لئے تو میرے لئے وسیلہ اور ذریعہ بنی ہے۔ تیرے اندر کی آتما، تیری روح نے میری تخلیق کی ہے۔

اے عورت! تو میری شناخت ہے تو نہ ہوتی تو میں بھی نہ ہوتا۔ میری رگوں میں جو خون دوڑ رہا ہے وہ تیرا ہی خون ہے، میری زندگی میں جو توانائی جل رہی ہے وہ تیری آغوش کے لمس کی گرمی ہے۔ تو نے میرے باپ کو مضبوط اعصاب بخش کر خوبصورت پیکر بنایا تو میری ایسی ماں ہے جس نے مجھے باپ کے مقدس مرتبہ پر فائز کر دیا۔

اے ماں! آج پھر تیری نسل کو تیری ضرورت ہے تو اپنے بچوں کے دلوں میں انسانوں کی محبت بھر دے۔ ایسی تربیت دے کہ نوع انسانی میں نفرت اور حقارت کے جذبات سرد پڑ جائیں ختم ہو جائیں۔

اے ماں! ایسی تعلیم دے کہ تیری اولاد مادیت کی عفریت سے نجات حاصل کر کے مادیت کے خالق کی گود کو اپنا مسکن بنا لے۔

اے ماں! ٹھنڈے موسم میں سورج کی تپش ہے۔ گرم لہروں کو ٹھنڈا کرنے کیلئے تو چاند کی چاندنی ہے تو دن کا اجالا اور ستاروں بھری رات کی کہکشاں ہے، تو اولاد کا سکون ہے۔ اے ماں! تجھے تیری ماں ممتا کا واسطہ تو اپنی روحانی قوتوں سے ہمارا سکون واپس لوٹا دے۔

زمین کی پکار

اللہ کی کتاب جو اللہ کے محبوب ﷺ پر نازل ہوئی جس میں ''لاریب'' شک نہیں۔ جو کتاب روشن دلیلوں کے ساتھ ہدایت ہے متقی لوگوں کے لئے جس کتاب کا ہر ہر لفظ نور ہے۔ ایسا نور جو انسانوں اور خالق کے درمیان تعلق قائم کرتا ہے ایسا نور جو مخلوق کے لئے سماعت اور بصارت بن جاتا ہے۔ یہی نور ہے جو زمین کو بچھائے ہوئے ہے اور یہی نور ہے جس نے آسمانوں کو رفعت بخشی ہے۔ نور علیٰ نور ہدایت عطا کرتا ہے جسے اللہ چاہے نور کے جامہ میں ملبوس قرآن کریم کی آیت:

''عقل والے اللہ تعالٰی کی نشانیوں پر غور کرتے ہیں۔''

میں نے تفکر کیا تو ایک شعور سے اس پار لاشعور میں جھما کہ ہوا غنود کے دروازے سے نکل کر لاشعوری حواس میں پہنچا تو لاشعوری طلسماتی دنیا میں زماں و مکاں کی قید سے آزاد انسانوں کو چلتے پھرتے دیکھا۔ مرغزاروں میں طیور دیکھے، مہوش ایسی صورتیں نظر آئیں جن کے سراپا بلور کے قندیل تھے۔ شیشے کے جاروں میں بند قطار اندر قطار سرو اور درختوں کو ترانے گاتے سنا۔ چٹکتی کلیوں اور مہکتے پھولوں کو غزل سرا دیکھا۔ ذہن میں ایک دریچہ کھلا لاشعوری دنیا سے پرے بھی ایک ایک عالم بالکل اسی طرح موجود ہے جیسے میری زمین اور میری زمین کے باسی۔ میں اوپر سے نیچے پلٹ آیا کہ جب سب کچھ زمین ہی ہے تو میں زمین کے اوپر کیوں تفکر نہ کروں۔ زمین کے اندر اس کا کھوج کیوں نہ لگاؤں۔ میں نے اپنی ماتا دھرتی سے پوچھا، اے ماں! تو کیا ہے زمین بولی میں کیا نہیں ہوں۔ میں چٹکتی کلی کا حسن ہوں، شاخوں اور پتوں کا نکھار ہوں، پھول کی مہک ہوں، بلبل کی آواز ہوں، چڑیوں کی چہکار ہوں، کوئل کی کوک ہوں، کبوتر کی غٹر غوں ہوں، پھلوں کی مٹھاس ہوں، کلیوں، پھولوں، پھلوں کا رنگ ہوں اور درختوں کی آن بان ہوں۔ زمین بولی میں اگر پھول کے بیج کو اپنے شکم میں نشوونما نہ دوں تو پھر میں خوشبو کہاں سے آئے گی۔ میں پھلوں کو اپنے رحم میں پروان نہ چڑھاؤں اور ان کے اندر مٹھاس منتقل نہ کروں تو پھل میٹھے کیسے ہونگے۔

میں تیری ماں، زمین تیرے لئے پانی کے چشمے نہ ابال دوں تو پہاڑوں سے آبشاریں نہیں گریں گی۔ یہ جو تو موٹر کاریں، ہوائی جہاز میں، دیوہیکل مشینوں میں تیل اور پیٹرول پھونکتا ہے یہ میری شریانوں سے نکلا ہوا میرا خون ہے۔ میں تیری ماں زمین اگر دل سخت کرلوں اور اپنا جسم اکڑالوں تو میرے اوپر کوئی گھر نہیں بن سکتا۔ میں تجھے زندگی دیتی ہوں تو جب میرے اوپر تکبر کی تصویر بن کر

ٹھوکروں میں روندتا ہے میں جب بھی تیرے پیر نہیں پکڑتی اور جب تو میرے جسم میں اپنے نوکیلے ہتھیاروں سے گھاؤ ڈال کر میرے وجود میں بیج ڈالتا ہے تو میں تیری ماں اسے ضائع نہیں کرتی۔ یہ میری اولاد کو زندگی دیتے ہیں۔ مگر اے میری اولاد! کیا تو نے سوچا ہے کہ تو نے مجھے کیا دیا ہے تو نے میرے احسانات اور خدمت کا کیا بدلہ چکایا ہے۔ زمین پر بسنے والی میری اولاد میں سے سب سے افضل اور میری چہیتی اولاد میں نے تیرے باپ آدم کو جنم دیا، تیری ماں حوا کو خوبصورت وجود بخشا۔ اس لئے کہ ہر ماں کی طرح میری بھی آرزوئیں اور تمنائیں ہیں، میں بھی ماں تا کی ماری چاہتی ہوں کہ میری اولاد خوش رہے، پر سکون رہے، آپس میں مہر و محبت خلوص وایثار ہو، ایک بھائی دوسرے بھائی کو تباہ نہ کرے، ایک بہن دوسری بہن کو برباد نہ کرے۔

آدم حوا کی نسل میری اولاد! میرے قریب آ! کہ میں تجھے ایک راز بتادوں مجھے اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے دستر خوان بنادیا ہے۔ جتنا میرا طول و عرض ہے اتنا ہی بڑا کشادہ اللہ کا دستر خوان ہے۔ اس دستر خوان پر اللہ نے وہ ساری نعمتیں رکھ دی ہیں جن کی تمہیں ضرورت ہے۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک نعمتیں ہی نعمتیں، کوئی روک ٹوک نہیں کوئی قیمت نہیں۔ زمین پر رہنے والا ہر فرد جس طرح چاہے اس سے مستفید ہوتا ہے، ہو سکتا ہے، ہوتا رہے گا۔

کیا تو نہیں دیکھتا اور کیا تو نہیں سمجھتا کہ میں تیری ملکیت بن گئی ہوں۔ میری ہر چیز تیری ہے جس طرح ہر ماں کی ہر چیز اولاد کی ہوتی ہے، سونا چاندی میرے ہی جسم کے ذرات میں پرت در پرت طبقات میرے اعصاب ہیں۔ پانی میرا خون ہے، گیسیں میری وریدوں میں دوڑنے والی حیات ہیں۔ رنگ میری خوبصورتی، غلافوں میں بند پھل میری حیاء، مخملی گھاس میرا لباس، پھول لباس پر نقش و نگار، چوپائے میرے وجود کا احساس، پرندے میرا لہجہ، سمندر میرا مدوجزر، پہاڑ میری طاقت، دریا میرا سکون، بارش میرے آنسو، شفق میرے لبوں کی لالی، سورج میری روشنی، چاند میرے ماتھے کا ٹیکہ اور ستارے میرے سر کا جھومر یہ سب کس کیلئے ہے؟

میرے بچو! یہ سب تمہارے لئے ہے۔

میں تمہاری ماں زمین۔

اپنی ماں! اپنے خالق اللہ کی منشاء سے، اللہ کی چاہت سے، اللہ کے پیار سے ہر آن ہر لمحہ تمہاری خدمت میں لگی رہتی ہوں۔ تم کیوں آپس میں لڑ کر، فساد برپا کر کے، قتل و غارت گری سے اپنی ماں کو دکھی کرتے ہو۔ میں نے کبھی تم سے کچھ نہیں مانگا۔ ہمیشہ تمہیں زندگی دی ہے۔ پھر تم کیوں میری گود اجاڑ دینا چاہتے ہو؟

سنو بگوش ہوش سنو!

ایک محلے میں پچاس گھر ہوتے ہیں۔ ہر گھر میں گھر والے اپنے آپ میں مگن رہتے ہیں، کوئی کسی کے گھر کو اپنا گھر بنانے کیلئے جھگڑا نہیں کرتا۔ ایک شہر میں ہزاروں گھر ہوتے ہیں ہر فرد قناعت کے ساتھ اپنے آنگن میں اپنے پھول جیسے معصوم بچوں کے ساتھ خوش رہتا ہے۔

کیا زمین پر بسنے والی قومیں اپنے اپنے ملکوں میں محلوں اور شہروں میں رہنے والے لوگوں کی طرح نہیں رہ سکتے؟ تم اقتدار کے نشے میں بدمست کیوں ہو گئے ہو؟ میں کروڑوں سال سے زندہ ہوں۔ میں نے نہیں دیکھا کہ اقتدار کی ہوس میں فتوحات کرنے والا کوئی غاصب۔۔۔۔۔۔انا کا پجاری۔۔۔۔۔۔ظالم اور جاہل اپنے ساتھ ایک تنکا بھی لے گیا ہے۔

میرے بچو!

تم میری کوکھ سے محبت کی تصویر بن کر جنم لیتے ہو اور محبت کو نفرتوں میں تبدیل کر کے خالی ہاتھ واپس لوٹ آئے ہو۔ میں زمین تمہاری ماں ہوں۔

میرے اندر نفرت، حقارت، تعصب، نسل پرستی اور اقتدار کا شائبہ بھی نہیں ہے۔۔۔۔۔۔کیا تمہیں اپنی ماں کو مایوس کر کے، دکھی کر کے خوشی ہوتی ہے۔ کیا تم اتنے ہی احسان فراموش ہو کہ تمہاری ماں اپنے خون کا ایک ایک قطرہ نچوڑ کر تمہیں زندگی دے رہی ہے اور تم آپس میں اپنی ماں کیلئے بہن بھائیوں میں خوشیاں بانٹ سکتے ہو۔

یاد رکھو! تمہیں اپنی پوری گندگی، سڑاند اور جاہ و جلال کے جھوٹے دعوؤں کے ساتھ دوبارہ میرے پاس آنا ہے۔ میں ماں ہونے کے ناطے تمہارا تعفن تو ڈھانپ لونگی مگر تمہیں اپنے بچھے ہوئے دستر خوان پر کبھی بھی ناخوش ہو کر جینا ہو گا، جہاں اقتدار رہے اور نہ ہی کوئی نخوت کی گنجائش۔

نورانی پیکر

سمندر کی اونچی اونچی لہریں زور وشور سے جھاگ اڑاتی کنارے پر آئیں تو یوں لگا جیسے ریت کے ننھے ننھے ذرات میں تحلیل ہو گئیں اور ان چاندی ملے، ذرات نے جب مدافعت کی تو وہ خود بھی لہروں کے ساتھ سمندر میں جا ملے۔ دم توڑتی لہریں واپس ہونے لگیں تو سمندر کی سطح پر تاحد نظر بل کھاتی ہوئی لکیریں بن گئیں۔ محسوس ہوا کہ سمندر کروٹ بدل راہ ہے۔ جیسے جیسے سکون سمندر میں منتقل ہوتا رہا موجوں میں طغیانی آتی رہی اور سمندر طوفان بن کر ساحل کی طرف رواں دواں ہوتا رہا۔ یہ سلسلہ کب سے چل رہا ہیاور کب تک چلتا رہے گا کسی کو معلوم نہیں۔ نو منزلہ برطانوی جہاز کی آٹھویں منزل پر جب میں نے نظر دوڑائی تو جہاز کی تعمیر میں ہر جگہ لوہا نظر آیا، دیواریں لوہے کی، فرش لوہے کے، مستول لوہے کا، حفاظتی کشتیوں میں لوہا، دروازے لوہے کے، سیڑھیاں لوہے کی، لوہے کی بنی ہوئی اس عظیم الشان کاریگری کو دیکھ کر ورائے شعور میں خالق کائنات کی آواز نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا:

''اور ہم نے لوہا نازل کیا اور اس میں انسانوں کیلئے بے شمار فائدے ہیں۔''

یہ نو منزلہ لوہے کی عمارت سمندر میں تیر رہی تھی۔ پہلی دوسری اور تیسری منزل میں ٹرک اور کاریں تھیں، چوتھی پانچویں اور چھٹی منزلیں مسافروں کیلئے تھیں۔ ساتویں منزل پر ہوٹل، ڈیوٹی فری شاپ اور کاسینو تھے۔ دو اور چار مسافروں کے لئے دو ہزار کیبن تھے۔ ہر کیبن ایک مکمل گھر تھا۔ کپڑے رکھنے کیلئے کافی بڑی الماری، سنگھار دان، کھانے کی میز، ٹھنڈے گرم پانی کا باتھ روم، نہایت آرام دہ برتھ، برتھ کے سرہانے مطالعے کے لئے روشنی کا انتظام، دھلے ہوئے تولئے، پانی پینے کیلئے گلاس، غرض اس کمرے میں ہر وہ چیز موجود تھی جس کی سفر میں ضرورت ہو سکتی تھی۔ آٹھویں منزل پر آڈیٹوریم، نویں منزل پر کانفرنس روم اور دھوپ سینکنے کے لئے عرشے پر بڑے بڑے صحن جس میں نہایت سلیقے سے جہاز کے رنگ سے مناسبت رکھتی ہوئی سفید کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔

اللہ کی آواز آئی:

''اے میرے بندے! دیکھ اس قوم نے ہماری آیت پر غور و فکر کیا، ہم نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر کر دیا تاکہ تم اس میں کشتیاں چلاؤ اور ہم نے اس تفکر کو قبول کر کے ان کے اندر ایجاد کی صلاحیت کو بیدار کر دیا۔''

میری آنکھوں سے نور کے موتی رخساروں سے گزرتے ہوئے جب لوہے کے فرش سے ٹکرائے تو میں نے دیکھا کہ اس نو منزلہ فائیو اسٹار ہوٹل کے من میں آگ بھڑک اٹھی۔ جہاز نے ایک آہ بھری اور یہ آگ دھواں بن کر چمنی کے راستے آسمان کی طرف بلند ہوئی اور فضاء میں پھیل گئی۔ فضاء میں فرشتوں کی نورانی ٹولہ کو یہ کہتے سنا اللہ نے چودہ سو سال پہلے کہا تھا:

''اور دھویں کو حکم دیا کہ داخل ہو جا مرضی سے یا مرضی کے بغیر، دھویں نے کہا میں تو آپ کا تابعدار ہوں۔''

دھواں دھواں دل، بھیگی بھیگی پلکوں عرشہ پر کھڑا میں یہ سب دیکھتا رہا۔ بھونچال میں جہاز ڈولنے لگا تو دماغ میں بھی بھونچال آ گیا۔ اندر کی آنکھ نے اندر ایک مورتی دیکھی، من میں میل نہ ہو تو دل آئینہ کی طرح ہو جاتا ہے۔ باہر اندر، یہاں وہاں ہر سمت اللہ ہی تو ہے۔ دل نے اپنے اندر بہتر ہزار ٹائم اسپیس کی گہرائی کے وقفوں میں نورانی پیکر سے پوچھا کہ :

''سمندر کی موجوں میں یہ بے قرار کیوں ہے۔''

نورانی پیکر بولا۔

''سمندر کی موجیں اپنے مرکز سے جدا ہو گئی ہے۔ یہ بے قراری اس لئے ہے کہ وہ دوبارہ اپنے مرکز سے گلے ملنا چاہتی ہیں۔'' سمندر سے موجیں ساحل کی طرف بڑھتی ہیں، ساحل پر جبیں سائی کرتی ہیں تو مرکز سے دور ہو جاتی ہیں تو سارا زور سارا طوفانی ولولہ اور توانائی ساحل پر منتشر ہو جاتی ہے۔ موجیں دوبارہ سمندر کے مرکز میں بانہوں میں بانہیں ملانے کے لئے واپس ہوتی ہیں۔ روح کی بے قراری کے ساتھ موج کی روح مرکز میں جذب ہونا چاہتی ہے۔

یہی حال کائنات کی اصل روح کا بھی ہے، ازل میں خالق سے جو دوری واقع ہوئی تھی، روح اس دوری کو ختم کرنے اپنے محبوب سے دوبارہ ہم آغوش ہونے کے لئے سمندر کی موجوں کی طرح بیقراری کے عالم میں صعود سے نزول کرتی جب زمین کی چھاتی سے ٹکراتی ہے تو بکھر کر، ٹوٹ کر نئے نئے قالب میں ڈھلتی چلی جاتی ہے۔

روح چاہتی ہے جیسے بھی نئی نئی تصویروں میں جلوہ گر ہو کر دوبارہ خالق کائنات کی گود میں سمٹ جائے۔ اپنی یا صل کی طرف ٹوٹ جائے، وہ اصل جو ازل سے ابد تک رہے اور ہمیشہ رہے گی اور جس کو کبھی زوال نہیں۔ جس طرح زندگی بولتی ہے، سنتی ہے، محسوس کرتی ہے۔ اسی طرح روح بھی بولتی ہے، سنتی ہے، محسوس کرتی ہے۔

روشنی قید نہیں ہوتی

اس دنیا میں ہر آدمی ایک ریکارڈ ہے اور اس کی ساری زندگی فلم ہے۔ گھما پھرا کر بات کی جائے تو کہا جائے گا کہ عالم ناسوت کا ہر باسی ایک ڈرامہ ہے، ایک کہانی ہے۔ کہانی مختصر ڈرامہ ہے اور ڈرامہ زندگی میں کام آنے والے کرداروں کو ایک جگہ جمع کر دیتا ہے ایسے کردار جو کسی ایک شخص کی انفرادی زندگی کو بھی نمایاں کرتا ہو اس کے ماحول میں جو کچھ ہے اسے بھی منظر عام پر لے آتا ہے۔

جب ہم ڈرامہ لکھتے ہیں ہمارے سامنے زندگی میں بسنے والے سارے کردار ہوتے ہیں اور جب ہم ڈرامہ دیکھتے ہیں تو ہم خود زندگی کے ان کرداروں میں کھو جاتے ہیں جن سے ہم گزر چکے ہیں یا گزرے ہیں۔ عجیب کھیل تماشہ ہے عمر رفتہ کے کسی بھی دور میں جب کوئی جھانکتا ہے تو ہر شخص کی کہانی ایک جیسی نظر آتی ہے۔ ہر آدمی مادی وجود میں اس زمین پر قدم رکھتا ہے اور ہر شخص دھیرے دھیرے لمحہ بہ لمحہ مادی وجود سے دور ہوتا رہتا ہے۔ مادی وجود سے دوری اپنی جگہ مسلم لیکن مادی وجود جس بساط پر نمودار ہوتا ہے جس بساط پر آگے بڑھتا ہے اور جس بساط پر منظر سے غائب ہو جاتا ہے وہ سب کے لئے ایک ہے۔

ابھی تک سائنسی دنیا میں کوئی ایسا علم مظہر نہیں بنا جو اس بات کی تشریح کر دے کہ بساط کیا ہے؟ کوشش لوگوں نے بہت کی کہ بساط پر سے پردہ اٹھ جائے مگر پردہ تو جب اٹھے گا جب کہیں پردہ ہو۔ اگر کہیں کسی کو پردے کے بارے میں کوئی خبر مل گئی ہے تو وہ خبر بھی خود پردہ ہے۔ نقاب رخ الٹ دیا جائے تو بڑی سے بڑی دانشورانہ بات بعد میں بات بن کر ایک نہ سلجھنے والی گتھی بن جاتی ہے جو سلجھتی نہیں۔ اگر شعور، لاشعور اور ورائے لاشعور کی بھاری اور مشکل اصطلاحات کا سہارا لے کر کچھ عرض کیا جائے تو وہ بات بے پردہ ہو جاتی ہے جس پر انسانی ارتقاء کی بنیاد رکھی ہوئی ہے۔ ارتقاء کیا ہے؟

ارتقاء یہی تو ہے کہ آدمی اپنی برائیوں، کمزوریوں کوتاہیوں کو چھپاتا ہے اور خود کو دوسروں سے اچھا ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ میں بھی کائنات کے ایک کنبے کا فرد ہوں، وہ کنبہ جو زمین پر آباد ہے۔ مفت خوری جس کا طرۂ امتیاز ہے۔ پیدا کوئی کرتا ہے۔ کہا جاتا ہے ماں نے پیدا کیا۔ کفالت کوئی کرتا ہے، کہا جاتا ہے کہ باپ نے پرورش کی۔ عقل و شعور پتہ نہیں کہاں سے ملتا ہے کہا جاتا ہے کہ حجروں اور مدرسوں سے شعور ملا ہے۔ زمین پر دندناتا پھرتا ہے۔ زمین کے بطن کو اپنے نوکیلے خنجروں سے چیرتا ہے اس میں دانہ ڈالتا ہے اور زمین سے خراج وصول کرتا ہے۔ کبھی یہ نہیں سوچتا کہ زمین کا بھی کوئی حق ہے۔

جس نے زمین دی، جس نے ایک چھوٹی کوڑی لئے بغیر پانی دیا، ضرورت سے بہت زیادہ وافر مقدار میں ہوا دی۔ اس کا تذکرہ آ بھی جائے تو ایسا لگتا ہے کہ بیکار بات کہی جا رہی ہے۔ بڑا ہو، چھوٹا ہو، کم عقل ہو یا دانشور ہو، غریب ہو یا دولت کا پجاری قارون سب مفت خورے ہیں نہ صرف مفت خورے بلکہ احسان فراموش بھی ہیں۔

میں ایک پتلا تھا پتلے میں خلا تھا، خلا میں کل پرزے تھے۔ ہر کل دوسری کل سے جڑی ہوئی تھی اور ہر پرزہ دوسرے پرزے میں پیوست تھا۔ اس طرح کہ کہیں بھی کوئی حرکت ہو تو سارے کل پرزے متحرک ہو جاتے تھے۔ کل پرزوں سے بنی مشین کو چلانے کیلئے پتلے میں چابی بھر دی گئی تو پتلا چلنے پھرنے لگا۔ چلنے پھرنے، اچھلنے کودنے اور محسوس کرنے کے عمل سے پتلے میں ''میں'' پیدا ہو گئی۔ ''میں'' جانتی ہے کہ چابی ختم ہو جائے گی ''میں'' کا وجود عدم ہو جائے گا اور پتلا باقی رہ جائے گا۔

لوگ اس ''میں'' کو ایک فرد مانتے ہیں۔ ''میں'' کو ایک ہستی تسلیم کرتے ہیں۔ یہ بات ہے بھی سچی میں ایک فرد ہوں، میری ایک ذات ہے، میری ذات میری انا میری ہستی کیوں ہے؟ کوئی نہیں جانتا ''میں'' بھی نہیں جانتی۔ جب میں خود کو فرد کے روپ میں دیکھتا ہوں تو ظاہر الوجود نظر آتا ہے اور جب میں خود ہڈیوں، پٹھوں اور کھال میں منڈھے ہوئے صندوق کے اندر تلاش کرتا ہوں تو مجھے اپنی ذات نظر نہیں آتی، البتہ باطن الوجود آنکھ دیکھتی ہے۔ عالم ایک نہیں بے شمار عالمین ہیں اور ان عالمین میں لاکھوں کہکشائیں جھماکوں کیساتھ قائم ہیں۔ لگتا ہے کہ ساری کائنات Sparking کا مسلسل اور متواتر عمل ہے۔ لیزر بیم سے لطیف روشنی کی کرن ہے جس سے اندرونی دنیا بندھی ہوئی ہیاور اس اندرونی دنیا میں وہ کچھ ہے جسے ظاہر الوجود آنکھ دیکھ نہیں سکتی۔ شعور ادراک نہیں کر سکتا، عقل کی وہاں تک رسائی نہیں۔

میری اصل باطن الوجود ہے اور ظاہر الوجود باطن الوجود کا عکس یا فوٹو سٹیٹ کاپی ہے۔ میں اس وقت ''میں'' ہوں۔ جب زمین پر موجود ہوں لیکن تماشہ یہ ہے کہ زمین بھی ایک نہیں ہے یعنی زمین بھی ظاہر الوجود اور باطن الوجود کے غلاف میں بند ہے۔ زمین جب ظاہر الوجود ہے تو ٹھوس ہے اور جب باطن الوجود ہے تو خلاء ہے۔ ظاہر الوجود زمین کشش ثقل ہے اور باطن الوجود روشنی ہے۔

زمین بھی عقل و شعور رکھتی ہے۔ وہ ادراک بالحواس بھی ہے۔ زمین یہ جانتی ہے کہ انار کے درخت میں امرود نہیں لگے گا اور امرود کے درخت میں انار نہیں لگے گا۔ وہ مٹھاس، کھٹاس، تلخ اور شیریں سے بھی واقف ہے۔ اس کے علم میں یہ بات بھی ہے کہ کانٹے بھرے پودے میں پھول زیادہ حسین لگتا ہے۔ کانٹے سے بغیر پودے میں خنتا ہی خوش رنگ پھول ہو، پھول میں کتنے ہی رنگوں کا امتزاج ہو لیکن پھول کی قیمت وہ نہیں جو کانٹوں کے ساتھ لگے پھول میں ہوتی ہے۔ زمین اس بات کا بھی علم رکھتی ہے کہ اس کو کھ میں رنگ برنگ، قسم قسم بیجوں کی نشوونما ہوتی ہے۔ زمین جہاں بیشمار رنگوں سے مزین پھول پیدا کرتی ہے تلخ و شیریں پھل اگاتی ہے۔ پرندوں، چوپایوں کی تخلیق کرتی ہے وہاں اپنی حرکت کو متوازن رکھنے کے لئے پہاڑ بھی بناتی ہے۔ لیکن یہ میلوں میل طویل

اور آسمانوں سے باتیں کرتے ہوئے بلند و بالا پہاڑ جب ظاہر الوجود میں نظر آتے ہیں تو زمین پر جمے ہوئے نظر آتے ہیں اور جب باطن الوجود پہاڑ دیکھے جاتے ہیں تو اڑتے ہوئے بادل دکھائی دیتے ہیں۔

ظاہر الوجود پتلا نہیں تھا تب بھی زمین تھی۔ ظاہر الوجود پتلا نہیں ہو گا تب بھی زمین رہے گی۔ ظاہر الوجود ایک ذرہ تھا، ذرے میں دوسرا ذرہ شامل ہوا تو ایک سے دو ذرات ہوئے اور ذرات کی تعداد اتنی بڑھی کہ ایک وجود بن گیا۔

قلندر حروف جانتا ہے اور وہ دو حروف یہ ہیں:

کوئی نہیں کبھی نہیں

دانشور سائنس دان، علامہ، مفتی، مشائخ کہتے ہیں لفظ دو ہیں:

نفی اثبات

قلندر کہتا ہے کہ اثبات نہیں صرف نفی ہی مادے کی اصل ہے۔

آیئے! تجزیہ کریں تاکہ تجزیہ مشاہدہ بن جائے۔

سامنے مٹی کا ایک ڈھیلا ہے اس کا وزن دو کلو ہے۔ اس دو کلو وزنی ڈھیلے کو کسی آدمی کی کمر پر مارا جائے تو چوٹ لگے گی۔ مٹی کے ڈھیلے کو پیس کر آٹے کی طرح کر لیں۔ سوال یہ ہے کہ دو کلو وزن کدھر گیا؟ کیا اس پسے ہوئے ڈھیلے کے ذرات کو کسی کی کمر پر مارا جائے تو چوٹ لگے گی؟

تجربہ شاہد ہے کہ چوٹ نہیں لگے گی۔ مشاہدہ یہ بھی ہے کہ مٹی کے ڈھیلے کو کتنا ہی پیس لیا جائے۔ ذرات موجود رہیں گے اور کسی طریقہ پر ان ذرات کو پھر ایک جگہ کر دیا جائے اور کسی آدمی کی پشت پر مارا جائے تو چوٹ لگے گی۔ حقیقت یہ منکشف ہوئی کہ بہت زیادہ ذرات کا جمع ہونا، ایک دوسرے میں پیوست ہو جانا یا باہم دیگر ہم آغوش ہو جانا کشش ثقل یعنی اثبات ہے اور ظاہر الوجود ہے۔ ظاہر الوجود تو رہے گا مگر ظاہر الوجود کی اصل یا بنیاد فنا ہے۔

قلندر جب فنائیت کا ذکر کرتا ہے تو وہ ظاہر الوجود کی نفی کرتا ہے۔ کیوں نفی کرتا ہے؟ اس لئے کہ اس کی نظر باطن الوجود کے علاوہ کچھ ہی نہیں دیکھتی۔

علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے:

قلندر جز دو حرف لاالٰہ کچھ نہیں رکھتا

فقیہہ شہر قاروں سے لغت ہائے حجازی کا

مراقبہ میں دیکھا کہ روزہ دراصل ترک اور نفی ہے یعنی ظاہر الوجود انسان باطن الوجود انسان کے لئے خود کو نفی کرتا ہے۔ جیسے جیسے نفی کا عمل آگے بڑھتا ہے ظاہر الوجود انسان باطن الوجود انسان میں داخل ہوتا رہتا ہے۔ جب کوئی انسان باطن الوجود بن جاتا ہے اور خود کو باطن الوجود دیکھ لیتا ہے تو مادی دنیا سے نکل کر نور کی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ سراغ پالیتا ہے، پتلا ظاہر الوجود ہے اور پتلے کے اندر چابی باطن الوجود ہے۔ چابی ہو گی تو پتلا حرکت کرے گا چابی نہیں ہو گی تو پتلا حرکت نہیں کرے گا۔

تیس دن، تیس راتوں کے ترک سے انسان ایسے حواس میں داخل ہو جاتا ہے جس کی رفتار ظاہر الوجود کے حواس سے ساٹھ ہزار گنا زیادہ ہے۔ یہی وہ حواس ہیں جو غیب کی دنیا میں وسیلہ بنتے ہیں۔ غیب کی دنیا کے مشاہدے کے بعد انسان کے اوپر سرور کیف چھا جاتا ہے اور یہ سرور و کیف ہی تقریب عید ہے۔

اے واعظو! اے منبر نشینو!

خدااس جہنم کامالک ہے جس میں آگ کے سمندر کھول رہے ہیں۔ جس میں آگ کے سمندر کھول رہے ہیں۔ جہنم وہ مقام ہے جہاں سانپوں، اژدھوں اور بچھوؤں کا بسیرا ہے۔ اس گرم تپتی آتش فشاں میں غذا تھوہر ہے۔ آنتوں اور شریانوں کی سیرانی کیلئے جو مشروب ہے وہ پیپ ہے۔

اے لوگوں! خدا سے ڈرو۔ خدا تمہیں ایسی سزا دے گا کہ اس سزا کے تصور سے ہی جسم پانی اور ہڈیاں راکھ بن جائیں گی۔ ایک اژدھا تمہارے اوپر پنجے مارے گا۔ تم جہنم کی تپتی زمین میں اندر ہی اندر دھنستے جاؤ گے۔ وہ اژدھا پھر تمہیں نکال لائے گا پھر تمہیں زمین کی انتہائی گہرائی میں دفن کر دے گا۔ پانی ایسا گرم ملے گا کہ ہونٹ ابل کر لٹک پڑیں گے۔

یہ وہ الفاظ ہیں جو ہمارے کانوں میں پگھلتے سیسہ کی طرح انڈیلے جاتے ہیں۔ ایک کمزور اور ناتواں انسان ایسے خوف ناک خدا سے ڈر ڈر کر خدا کو ایک خوفناک ہستی سمجھنے لگتا ہے۔ خوف ناک خدا کا تصور اسے خوف اور دہشت کے ایسے صحرا میں پھینک دیتا ہے جہاں خدا ایک ڈراؤنا وجود بن جاتا ہے۔

ہمارے دانشور، ہمارے رہنما محراب و منبر سے ہمیں یہ کیوں نہیں بتاتے کہ اللہ وہ ہے جو شکم مادر میں ہمیں نو ماہ تک غذا فراہم کر کے ہماری ہر طرح نشو ونما کرتا ہے۔ ہزار دو ہزار میل چل کر گھٹائیں ہماری خشک زمین پر پانی برساتی ہیں۔ حسین اور رنگین بہاریں زمین کو دلہن کی طرح سجاتی ہیں۔ آسمان پر جگ مگ کرتی قندیلیں ہماری نظر کو نور اور دماغ کو سرور بخشتی ہیں۔ خدا وہ ہے جس نے رنگ برنگے پھولوں کو زمین کی کوکھ سے پیدا کر کے انسان کے شعور میں رنگینی پیدا کر دی ہے۔ قطار در قطار درخت، پھلوں سے لدے ہوئے اشجار ہمارے منتظر ہیں کہ ہم انہیں خدمت کا موقع دیں۔ درخت کے پتے جب ہواؤں کے دوش پر جھولتے ہیں تو دراصل انسان کی تسکین روح کے لئے گیت گاتے ہیں۔ ہوائیں ساز بجاتی ہیں، ٹہنیاں رقص کرتی ہیں اور خود قدرت وجد میں آجاتی ہے۔ برساتیں شرماتی ہیں، برسات کے اندھیروں میں برسات کی روشنی میں نور اور کیف و سرور ہوتا ہے۔ سورج برسات کی لجاجت اور حیا کے پسینے سے آنکھیں موند لیتا ہے، دھوپ جس کا نام جھلسا دینا ہے، نرم و ٹھنڈی ہو جاتی ہے اور فضا دھل جاتی ہے۔ درخت نیا لباس زیب تن کر لیتے ہیں۔

وہ خدا جس نے زندگی کو قائم رکھنے کے لئے اتنے وسائل مہیا کر دیئے ہیں کہ انسان ان وسائل کا شمار بھی نہیں کر سکتا۔ جب تو تھک جاتا ہے تو رات تجھے تھپک تھپک کے نیند کی لوریاں سنا کر سلا دیتی ہے اور جب سوتا رہتا ہے تو دن آہستہ خرام تیرے گرد ساز و آواز کے ساتھ مدہم مدہم دستک دے کر تجھے بیدار کر دیتا ہے۔

اے ہمارے دانشور! اے ہمارے راہنما!

تم اس خدا کا تذکرہ کیوں نہیں کرتے جس نے ہمارے اندر ایک مشین نصب کر دی ہے جس کا ہر پرزہ ہمارے اختیار اور ہمارے ارادے کے بغیر چل رہا ہے۔ دل سارے جسم کو شاداب رکھنے کیلئے خون دوڑا رہا ہے۔ دماغ اعصابی نظام کو بحال رکھنے کے لئے تواتر کے ساتھ زندگی کی اطلاع دے رہا ہے۔ آنتیں غذا کو جزو بدن بنا رہی ہیں۔ آنکھیں مناظر قدرت کی وڈیو فلم بنا رہی ہیں۔

اے ہمارے دانشورو! اے ہمارے رہنما!

تم کیوں صرف ایسے خدا کا تذکرہ کرتے ہو کہ انسان جس خدا کو خوف ناک ہستی، ڈراؤنی ذات سمجھ کر رات دن ڈرتا ہے، لرزتا ہے، جسم کا ہر عضو کانپتا رہے۔ یہ کون نہیں جانتا کہ ڈر اور خوف دوری اور جدائی کا اکسیری نسخہ ہے۔ یہ کون نہیں تسلیم کرے گا کہ ڈر گھٹن ہے، ڈر اضطراب ہے، ڈر بے چینی ہے، ڈر خوف ناکی دو دلوں میں جدائی کی ایک دیوار ہے۔

اے میرے بزرگو! میرے اسلاف کی نیابت کے دعویدارو!

اگر تمہیں یہ یقین ہو جائے کہ تمہارا باپ ایک خوف ناک ہستی ہے اور وہ تمہارے وجود کو جلا کر خاکستر کر دے گا تو کیا تم اس کے قریب جاؤ گے؟

دنیا کا یہ قانون ہے کہ امن پسند شہریوں کی حفاظت کی جاتی ہے۔ حاکم امن پسند شہریوں کو اچھا ہی نہیں سمجھتا بلکہ ان سے محبت بھی کرتا ہے ان کی صحت، ان کی ضروریات کا انتظام کرتا ہے۔

اے ہمارے دانشورو!

تم اپنے پیچھے چلنے والی بھیڑ کو یہ کیوں نہیں بتاتے کہ قانون کی پاسداری کرو۔ حاکم اپنے فداکاروں اور اپنی اطاعت کرنے والوں سے محبت کرتا ہے اگر تم اللہ کے پھیلائے ہوئے وسائل کو صبر و شکر کے ساتھ خوش ہو کر استعمال کرو گے تو اللہ خوش ہو گا۔ اس لئے خوش ہو گا کہ یہ سارے وسائل تمہارے لئے ہی تخلیق کئے گئے ہیں۔ آج کا انسان اگر اچھا لباس پہننا ترک کر دے اور موٹا کھدر کا لباس پہننے لگے تو ہزاروں فیکٹریاں بند ہو جائیں گی، فیکٹریاں بند ہو جانے سے لاکھوں انسان بھوک سے مر جائیں گے۔ آسائش و آرام کے وسائل سے فائدہ اٹھانا منسوخ کر دیا جائے تو اللہ کی مخلوق تہی دست اور مفلوک الحال ہو جائے گی۔

شکر کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استعمال کیا جائے اور صبر یہ ہے کہ بندہ راضی بہ رضا رہے اور جب تک بندے شکر کا کفران کرتے ہیں اور صبر سے خود کو آراستہ نہیں کرتے تو ان کے دلوں میں دنیا کی محبت جاگزیں ہو جاتی ہے۔ اس دنیا کی محبت جو عارضی اور فانی ہے۔ خدا نہیں چاہتا کہ عارضی اور فنا ہو جانے والی دنیا کو مقصد زندگی قرار دے دیا جائے۔ خدا چاہتا ہے کہ انسان سکون کے گہوارے میں ابدی زندگی تلاش کرے اور دنیا کے تمام ساز و سامان اور وسائل کو راستے کا گرد و غبار سمجھے۔

اگر تم سعادت مند ہو تو شر سے بچتے رہو کہ اللہ بچنے والوں پر ہمیشہ رحم کرتا ہے۔ رشتہ داروں، مسکینوں اور مسافروں کا حق ادا کرو اور بے جا دولت خرچ نہ کرو کہ دولت اڑانے والے شیطان کے بھائی ہوتے ہیں۔ اور تم جانتے ہو کہ شیطان اللہ کا باغی ہے۔ اگر تم تہی دست ہو اور کچھ نہیں دے سکتے لیکن خدا سے رحمت کی امید ضرور رکھتے ہو تو ان لوگوں کو نرمی سے ٹال دو۔ تم نہ کنجوس بنو اور نہ اتنے فضول خرچ کہ کل نادم ہونا پڑے اور لوگ تمہیں طعنے دیں۔

وعدوں کو پورا کرو کہ وعدوں کے متعلق باز پرس کی جائے گی۔ جب ناپو پورا ناپو پورے اور صحیح ترازو سے تولو۔ یہ خیر ہے اس کا نتیجہ اچھا ہو گا کسی ایسی خبر کے پیچھے مست چل پڑا کرو جس کے بارے میں تم کو یقینی علم نہ ہو۔ اس لئے کہ کان، آنکھ اور دل ہم سب کے بارے میں جواب طلب کریں گے۔ زمین پر اکڑ کر مت چلو کہ تم نہ تو زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ بلندی میں پہاڑوں کے برابر ہو سکتے ہو۔ یہ وہ حرکات ہیں جنہیں ہم سخت ناپسند کرتے ہیں۔

علم و عمل

یہ دور علم کا دور ہے اور نئی نئی ایجادات کی وجہ سے سائنس کا زمانہ ہے۔ آنکھ کا اندھا بھی اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتا کہ موجودہ زمانے کی ساری ترقی، تحقیق ریسرچ کے اوپر قائم ہے۔ قوموں کے عروج وزوال کی تاریخ واضح طور پر انکشاف کرتی ہے کہ جن قوموں نے جدوجہد کر کے علمی خزانوں سے استفادہ کیا وہ ترقی کے مینار تعمیر کرتی رہیں اور جو قومیں علمی خزانوں سے تہی دست ہو گئیں ذلت اور رسوائی ان کا مقدر بن گئی۔

چودہ سو سال پہلے زمین پر جہالت کی سیاہ چادر پھیلی ہوئی تھی۔ ہر طرف فساد برپا تھا۔ جہالت اور بربریت کی اس سے زیادہ بری مثال اور کیا ہو سکتی ہے کہ والدین اولاد کو قتل کر دیا کرتے تھے۔ بے حیائی اور فحاشی کوئی خلاف عقل بات نہ تھی۔ زمین جب فساد اور خون خرابے سے بھر گئی اور اشرف المخلوقات نے انسانی حدود کو پھلانگ کر حیوانیت کو اپنا لیا اور اللہ کے عطا کردہ انعام ’’فی الارض خلیفہ‘‘ کے منصب کو یکسر بھول گیا تو اللہ نے زمین کو دوبارہ پر سکون بنانے کے لئے اپنے محبوب بندے حضرت محمد ﷺ کو مبعوث فرمایا۔

اس برگزیدہ مقدس اور مطہر بندے نے عجیب و غریب حیرت انگیز محدود لامحدود رنگ رنگ اللہ کی نشانیوں کو اس طرح کھول کھول کر بیان کیا کہ ابتدائی دور میں زمین و آسمان کی حقیقت عربوں پر عیاں ہو گئی۔

قرآن نے بتایا:

’’بیشک زمین و آسمان کی پیدائش رات اور دن کے بار بار ظاہر ہونے اور چھپنے میں ان عقلمندوں کیلئے نشانیاں ہیں جو لوگ اٹھتے، بیٹھتے، لیٹتے اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں غور و فکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں اے اللہ تو نے یہ سب فضول اور بے مقصد نہیں بنایا اور ہمیں دوزخ کی آگ سے محفوظ کر دے۔‘‘

(آل عمران۔۱۹۱)

"کیاان لوگوں نے آسمان کی طرف نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو آراستہ کیااور اس میں کسی قسم کا سقم نہیں ہے اور زمین کو ہم نے پھیلایااور اس میں پہاڑ بنائے اور اس میں سے ہر قسم کی خوشنما چیزیں اگائیں یہ ان لوگوں کیلئے جو دانااور بینا ہیں اور اللہ کی طرف رجوع کرنے والے ہیں۔"

(ق۔۸۔۷)

عربوں پر علم ودانش آشکار ہوگئی اور جب مسلمان علم کی تلاش میں صف بستہ ہوگئے تو انہوں نے علم کا کوئی شعبہ نہیں چھوڑا جوان کی تحقیقات سے تشنہ رہا ہو۔ ان کی تحقیقات پوری امت مسلمہ کے لئے سبق آموز ہیں اور عبرت انگیز بھی۔ مغربی ممالک کی لائبریریاں آج بھی مسلمان اسلاف کی کتابوں سے بھری پڑی ہیں۔ یہ دانشور مسلمان ہیں جنہوں نے تحقیقات کرکے علوم کی شمعیں روشن کیں۔ مسلمانوں نے عالم میں اس وقت روشنی پھیلائی جب دنیا جہالت کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ان میں سے چند محققین مفکرین اور سائنسدانوں کے نام یہ ہیں:

عبدالمالک اصمعی:

انہوں نے علم ریاضی، علم حیوانات، علم نباتات اور انسان کی پیدائش اور ارتقاء پر تحقیق کی۔ عبدالمالک اصمعی علم سائنس کا پہلا بانی ہے اس سے پہلے سائنس کے علم کو وجود تاریخ کے صفحات پر موجود نہیں ہے۔

جابر بن حیان:

جابر بن حیان کی کتابوں کے تراجم پندرھویں صدی عیسوی تک یورپ کی مختلف یونیورسٹیوں میں پڑھائے جاتے رہے ہیں۔ان میں سائنس دان نے کپڑے کو واٹر پروف، لوہے کے زنگ سے محفوظ رکھنے اور شیشے کو رنگین کرنے کا طریقہ ایجاد کیا۔

محمد بن موسیٰ الخوارزمی:

انہوں نے صفر کا اضافہ کرکے ہندسوں کی قدر کو بڑھادیا۔اس نے کرہ ارض اور ستواں نقشے بنائے اور جغرافیہ میں تحقیقات کیں۔

علی ابن سہیل ربان الطبری:

انہوں نے فردوس الحکمت کے نام سے ایک مکمل کتاب لکھی۔

یعقوب بن اسحاق الکندی:

علم فلکیات، کیمسٹری، موسیقی اور طبیعات میں ماہر تھے۔یعقوب بن اسحاق الکندی ۲۶۵ کتابوں کا مصنف ہے۔

ابوالقاسم عباس بن فرناس:

ہوا میں اڑنے کے تجربے کرتا رہا اس کی کوششیں ہوائی جہاز بننے کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔ دھوپ گھڑی بھی اس کی ایجاد ہے۔

ثابت ابن قرۃ:

انہوں نے لیور اور گئیر ایجاد کئے۔ لیور اور گیئر نہ ہوتے تو آج ہم بڑی بڑی مشینوں کے ذریعہ نئی نئی ایجادات نہیں کر سکتے تھے۔

ابو بکر محمد بن زکریا الرازی:

ان کو سرجری میں مہارت حاصل تھی۔ آپریشن کے بعد جلد کو سینے کا طریقہ بن اس کی ایجاد ہے۔

ابوالنصر الفارابی:

انہوں نے موسیقی کا ایک آلہ ایجاد کیا تھا جس کی آواز سے سننے والا کبھی سو جاتا تھا، کبھی روتا تھا اور کبھی ہنستا تھا۔

ابوالحسن المسعودی:

سب سے پہلا شخص ہے جس نے بتایا کہ زمین کی جگہ سمندر تھا اور سمندر کی جگہ زمین۔ یہ بات اس نے اس وقت بتائی تھی جب پیمائش کے لئے کوئی سائنسی آلہ موجود نہیں تھا۔

ابن سینا:

میڈیکل سائنس کا ماہر تھا۔ اس نے علم الابدان کا نقشہ بنایا اور اس کے الگ الگ حصے کر کے اس کی تصویریں بنائیں۔ موجودہ میڈیکل سائنس میں Anatomy اسی کی کتاب کا ترجمہ ہے۔

ابن سینا نے جسمانی حرارت ناپنے کا آلہ ایجاد کیا جو تھرمامیٹر کی صورت میں آج بھی موجود ہے۔

علیٰ ہذا القیاس بیان کردہ سائنس دانوں کے علاوہ انیس یا بیس سائنسدان اور ہیں جنہوں نے تحقیق و تلاش کے بعد سائنسی علوم کی بنیاد رکھی۔

عربوں سے پہلے یورپ، امریکہ، مصر اور ایشیائی ممالک چین، ہندوستان اور جاپان وغیرہ میں سائنس کا عمل دخل نہیں تھا۔ البتہ یونان میں کسی قدر علم موجود تھا۔ علمی تحقیقات اور نئی نئی ایجادات کی طرف رغبت پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات کا نتیجہ تھا۔ قرآن پاک کے نازل ہونے کے بعد سرزمین عرب جب علم کی روشنی سے منور ہوئی۔ اس وقت مغربی ممالک میں تہذیب و تمدن کا

کوئی نشان نہ تھا۔ روس کے لوگ انسانی کھوپڑیوں میں پانی پیتے تھے۔ رسول ﷺ نے علم قرآن سے مسلمان صحرا نشینوں کی زندگی بدل دی۔ قرآن کے علم اور قرآن کے بتائے ہوئے روشن راستے پر چل کر پچاس سال کی مختصر مدت میں مسلمانوں نے آدھے سے زیادہ دنیا فتح کرلی۔ قیصر و کسریٰ کی سلطنتیں مسلمانوں کے قدموں پر جھک گئیں۔ قرآن آیات کے انوار سے روشن دل مسلمانوں نے دنیا میں انقلاب برپا کر دیا اور دنیا کو ایک نئی تہذیب و تمدن سے آراستہ کر دیا۔

قرآنی نظریہ کے مطابق مسلم اسلاف کی لکھی ہوئی کتابوں کے تراجم ہوئے تو ان تحریروں کو یورپ میں اتنی زیادہ پذیرائی حاصل ہوئی کہ وہاں یونیورسٹیاں قائم ہو گئیں۔ مختلف علوم سائنس و فلکیات اور ریاضی پر لکھی ہوئی کتابیں چار سو سال تک وہاں کی یونیورسٹیوں کے نصاب میں داخل رہیں۔ یورپ کے مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ عرب نہ ہوتے تو یورپ علم کی روشنی سے محروم رہ جاتا۔

پانچویں اور چھٹی صدی ہجری کے بعد مسلمانوں کا علمی زوال شروع ہوا۔ امت مسلمہ قرآنی تحقیق و تفکر سے دور ہو گئی اور قرآن کی زبان میں حاصل شدہ علوم کو بھلا بیٹھی۔ جس کے نتیجہ میں مسلمان قرآن کے انوار و حکمت سے دور ہو گئے پھر یہ سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔ قرآنی علوم اور روحانی زندگی کی جو شمع روشن ہوئی تھی قوم نے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں۔ تسخیر کائنات جو قرآن کا پورا اور مکمل تیسرا علم ہے اس کی طرف سے توجہ ہٹ گئی اور عالم اسلام اس شعور سے محروم ہو گیا جو چودہ سو سال پہلے قرآن نے عطا کیا تھا اور جب کوئی قوم تفکر، تحقیق و تلاش، بصیرت و حکمت اور نور علیٰ نور فہم و فراست سے محروم ہو جاتی ہے تو گروہوں اور فرقوں میں تقسیم ہو جاتی ہے اور اس کی اجتماعیت ختم ہو جاتی ہے۔

اس گروہ بندی اور فرقوں میں تقسیم مسلمان قوم کی حالت زار دیکھ کر حضرت عبدالقادر جیلانیؒ نے امت مسلمہ کی شیرازہ بندی کے لئے پروگرام ترغیب دیا۔ انہوں نے یہ بات باطنی اور ظاہری طور پر محسوس کر لی تھی کہ مسلم امہ کا زوال دراصل قرآنی تعلیمات سے انحراف اور روحانی قدروں سے دوری ہے۔ جسمانی تقاضے، جسمانی احساسات کسی بھی قسم کا علم ادراک اسی وقت ممکن ہے جب جسم کو متحرک کرنے والی جسم کو زندگی عطا کرنے والی جسمانی شعور کو فیڈ کرنے والی روح موجود ہو۔

قرآن نے اس حقیقت کو معاد کے نام سے بیان کیا ہے حضرت پیران پیر دستگیر نے ٹوٹے اور بکھرے ہوئے مسلم معاشرہ کی درجہ بندی کے لئے مجلسیں منعقد کیں، وعظ اور نصیحت کی محفلیں سجائیں اور ان کی کاوشوں سے سلسلہ قادریہ کی بنیاد پڑی اور یہ سلسلہ ان کے جانشینوں نے، ان کی اولادوں نے اور رسول اللہ ﷺ کی امت کے علمائے باطن نے جاری رکھا۔

روحانی سلسلوں میں بھی سازشی لوگوں نے اپنا عمل دخل جاری رکھا اور لوگوں کی توجہ کشف و کرامات کی طرف مبذول کر دی۔ اس طرز فکر کو کچھ اس طرح آگے بڑھایا گیا کہ لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ روحانیت کا مطلب کشف و کرامات کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

اس طرح پیران پیر دستگیر کی کاوش اور جدوجہد پر ایک نیا پردہ آ گیا۔ دوسری بات جو حقیقت کے برخلاف بیان کی گئی وہ یہ تھی کہ تسخیر کائنات یا روحانی علوم حاصل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان دنیا بیزار ہو کر جنگل میں جا بیٹھے۔ اس کا بڑا نقصان یہ ہوا کہ مسلمان قوم ریسرچ سے محروم ہو گئی اور غیر مسلم اقوام نے علم کائنات میں ترقی کر لی۔ جب حالات بہت زیادہ دگرگوں ہو گئے، تحقیق و تلاش پر غیر مسلم اقوام نے پہرے بٹھا دیئے تو قدرت نے اس جمود کو ختم کرنے کے لئے حسن اخریٰ، سید محمد عظیم برخیا المعروف قلندر بابا اولیاءؒ کی ذات کو ظاہر کیا۔ آج کے دور میں ہر آدمی یہ بات جانتا ہے کہ سو سال پہلے جو باتیں کرامات کے زمرے میں بیان کی جاتی تھیں وہ سائنسی نظام کے تحت عام ہو گئی ہیں۔ اب یہ کہنا کہ فلاں بزرگ کو پانچ جگہ یا سات جگہ دیکھا گیا تھا ایک بہت کم وزن بات ہے۔

امام موسیٰ رضاؒ کی روح سے فیض یافتہ قلندر بابا اولیاءؒ نے نوع انسانی کی باطنی اور جسمانی ترقی کیلئے نظریہ توحید و رسالت کے تحت پروگرام ترتیب دیا۔ اس پروگرام کو سائنسی بنیاد پر اس لئے استوار کیا گیا کہ اس دور میں کوئی بات اس وقت قابل یقین سمجھی جاتی ہے۔ جب اس کے پیچھے سائنسی بنیاد پر دلیل موجود ہو۔ اس Method کو متعارف کرانے کے لئے سلسلہ عظیمیہ نام تجویز ہوا۔

قلندر باباؒ فرماتے ہیں:

قرآن کی تعلیمات کو اگر مادی شعور کے دائرے میں رہ کر سمجھا جائے تو قرآن کے معنی اور مفہوم میں شدید غلطیاں واقع ہوتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ علماء قرآن جیسی عظیم الشان اور لاریب کتاب کے بارے میں اپنے قائم کردہ مفہوم پر متفق نہیں ہیں۔ روحانی تعلیمات ہمیں بتاتی ہے کہ روحانی انسان ہر لمحہ مرتا ہے اور لمحہ کی موت انسان کے اگلے لمحے کی زندگی کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ تھوڑے سے تفکر سے پتہ چلتا ہے کہ زندگی کی جتنی بھی کاوشیں ہیں، چاہے وہ اعمال ہوں علم ہو فہم ہو، اخلاقیات ہوں، یہ سب قبر تک معمولات ہیں اگر زندگی اور حیات کی ہم آہنگی کا ادراک انسان کر لے تو حیات ابدی کا مزہ اسی زندگی کے لیل و نہار میں حاصل کر لیتا ہے۔ ہم واضح طور پر دیکھتے ہیں آج کا انسان مادی ماحول میں اس قدر کھو چکا ہے کہ وہ مذہب کو جس کا کام ہی انسان پر باطنی دنیا روشن کرنا ہے اس کو بھی مادی لذتوں کا وسیلہ بنانے پر بضد ہے۔

مذہب کا نام استعمال کرنے والے تو بہت ہیں مگر ایمان، یقین اور مشاہدے کی طلب اس دور میں ناپید ہو چکی ہے۔ جب صاحب ایمان ہی ناپید ہو جائیں تو ایمان کی طلب کون کرے گا؟ آج کا سائنسدان موجودہ سائنسی ترقی کو نوع انسان کا انتہائی شعور سمجھتا ہے۔ یہ بلاشبہ ایک گمراہ کن سوچ ہے اس لئے کہ ہمیں قرآن بتاتا ہے کہ انسان کی ترقی حضرت سلیمانؑ کے دور میں اتنی تھی کہ ایک شخص نے جو پیغمبر نہیں تھا پلک جھپکنے کے وقفے میں ڈیڑھ ہزار میل کے طویل فاصلے سے مادی Form میں تخت منتقل کر دیا تھا۔ یہ بات سائنسدانوں کے لئے لمحہ فکریہ ہے کیونکہ وہ اتنی ترقی ہوتے ہوئے بھی کسی معمولی سی چیز کو بغیر مادی وسیلے کے حرکت نہیں

دے سکتا۔ مذہبی دانشوروں کا کردار گذشتہ صدیوں سے آج تک انتہائی مایوس کن رہا ہے۔ انہوں نے کبھی انسانی تفکر کو اس طرف مائل نہیں کیا اور انہوں نے کبھی نہیں بتایا کہ آقائے نامدار ﷺ بغیر کسی وسیلے کے جسمانی طور پر کون سی سائنس کے ذریعے معراج کے شرف سے مشرف ہوئے۔

انسان روشنی سے بنا ہوا ہے اس کے سارے محسوسات الیکٹران کے اوپر قائم ہیں۔ اگر انسان اپنے اندر دور کرنے والی الیکٹر یسٹی سے واقفیت حاصل کرلے تو وہ مادی وسائل کے بغیر کسی بھی مادی شئے کو جہاں چاہے منتقل کر سکتا ہے۔

حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے انسانی شعور کو روحانی سائنس کی بنیاد پر چار شعوروں میں تقسیم کیا ہے اور ان چاروں شعوروں کے اصطلاحی نام تجویز کر کے ان کی اکویشن بنائی ہے۔ اپنی کتاب لوح و قلم میں حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے نوع انسانی کو موجودہ بے سکون زندگی اور پر مصائب حالات سے آزاد ہونے کا نہایت مختصر مگر جامع حل بتایا ہے۔

قیاس کا پیش کردہ کوئی نظریہ کسی دوسرے نظریہ کا چند قدم ساتھ ضرور دیتا ہے مگر پھر ناکام ہو جاتا ہے۔ لوگوں نے بذات خود جتنے طریقے وضع کئے سب کے سب کسی نہ کسی مرحلہ میں غلط ثابت ہوئے ہیں۔ توحید کے علاوہ اب تک جتنے نظام ہائے حکمت بنائے گئے ہیں اور تمام اپنے ماننے والوں کے ساتھ مٹ گئے یا آہستہ آہستہ مٹتے جا رہے ہیں۔ کتاب لوح و قلم میں تحریر ہے کہ آج کی نسلیں گذشتہ نسلوں سے زیادہ مایوس ہیں اور آئندہ نسلیں اور بھی زیادہ مایوس ہونگی۔ نتیجہ میں نوع انسانی کو کسی نہ کسی وقت نقطہ توحید کی طرف لوٹنا پڑے گا۔ موجودہ دور کے مفکر اور سائنٹسٹ کو چاہئے کہ وہ وحی کی طرز فکر کو سمجھے اور نوع انسانی کی غلط رہنمائی سے دست کش ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ مختلف ممالک اور مختلف قوموں کے وظیفے جداگانہ ہیں اور یہ ممکن نہیں ہے کہ تمام نوع انسان کا جسمانی وظیفہ ایک ہو سکے اب صرف روحانی وظائف باقی رہتے ہیں جن کا مقصد صرف توحید اور صرف توحید ہے اگر دنیا کے مفکرین جدوجہد کر کے ان وظائف کی غلط تعبیروں کو درست کر سکیں تو وہ اقوام عالم کو وظیفہ روحانی کے تحت ایک ہی دائرہ میں اکٹھا کر سکے۔ سلسلہ عالیہ عظیمیہ کے امام قلندر بابا اولیاءؒ ایک ایسے عظیم سائنس دان ہیں جن کے پیش نظر نوع انسانی کو بحیثیت مخلوق کے توحید کے پلیٹ فارم پر جمع کرنا ہے۔ قلندر باباؒ کی تعلیمات اور ارشادات کا خلاصہ یہ ہے کہ:

وہ نوع انسانی کو پر سکون دیکھنا چاہتے ہیں خوف و غم کی زندگی سے انہیں نجات دلانا چاہتے ہیں۔ توحید و رسالت کے پلیٹ فارم پر نوع انسانی کو جمع کرنے کا روحانی مشن 1960ء سے شروع ہوا۔ 27 جنوری 1979ء کو قلندر بابا اولیاءؒ نے حیات و ممات کی اس دنیا سے پردہ فرما لیا اور ہم ان کے شاگرد ان کے خادم مسرور ہیں کہ قلندر بابا اولیاءؒ کی روحانی سرپرستی ہمیں حاصل ہے اور تائید ایزدی ہمارے شامل حال ہیں۔

روحانیت

۱۹۱۲عیسوی میں انگلینڈ کے مشہور زمانہ برٹش میوزیم میں ایک انسانی کھوپڑی کی نمائش کی گئی جس کے نیچے لکھا تھا Pitt Down Man۔اس تختی پر یہ بھی لکھا گیا تھا کہ یہ انسان سے ملتی جلتی مخلوق کی کھوپڑی ہے جو پانچ لاکھ سال قبل زندہ تھا اور یہ مخلوق موجودہ انسان کی جد امجد تھی۔ پورے چالیس سال اس کھوپڑی پر بحث ہوتی رہی، کانفرنسیں منعقد کی گئیں اور اس پر کتابیں بھی لکھی گئیں۔ لیکن جب ریڈیو کاربن طریقہ ایجاد ہوا تو یہ انکشاف ہوا کہ یہ کھوپڑی دراصل ایک انسان کی تھی جبکہ جبڑا ایک بندر کا تھا اور انسان کی کھوپڑی ڈیڑھ سو سال پرانی تھی جبکہ بندر کے جبڑے کی عمر صرف چالیس سال تھی۔ دراصل یہ ایک اعلیٰ درجہ کا سائنسی اسکینڈل تھا چنانچہ کھوپڑی کو فوراً شوونڈو میں سے اٹھا لیا گیا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ اس بنیاد پر جو ڈپلومہ دیئے گئے یا کتابیں لکھی گئیں ان کو جھوٹا نہیں کہا گیا ریسرچ کرنے والے عام طور پر ایک قائم شدہ سائنسی نتیجہ لے کر ماضی کو اربوں سال پر پھیلا دیتے ہیں۔

دنیا کی پیدائش کے متعلق تخمینہ بھی قیاس پر مبنی ہیں۔ بتایا جاتا ہے کہ اس وقت تک زمین پر پانچ ارب سال گزر چکے ہیں اور ان پانچ ارب سال کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلا دور تقریباً نصف ارب سالوں پر مشتمل ہے، دوسرا دور سترہ کروڑ سالوں پر محیط ہے، تیسرا دور ساڑھے چھ کروڑ سالوں پر مشتمل ہے، چوتھا دور پچیس لاکھ سالوں پر مشتمل ہے۔

کچھ لوگ زمین پر انسان کے ظہور کو دس لاکھ سال پہلے بتاتے ہیں جب کہ اس کے پیچھے کوئی حتمی دلیل یا سند نہیں۔ جبکہ کچھ سائنسدان انسان کا زمین پر ظہور دس ہزار سے پچاس ہزار سال بتاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تخلیق زمین اور تخلیق انسان کے بارے میں سائنسدان کسی ایک نقطے پر خود کو مجتمع نہیں کر سکے۔ چند سائنسدان تخمینوں اور اندازوں سے بات کرتے ہیں اور نئے سائنسدان ان کی نفی کر دیتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حضرت آدمؑ کے وقت سے تقریباً دس ارب انسان دنیا میں رہ چکے ہیں۔ ہمارے اس دور میں بتایا جاتا ہے کہ زمین پر پانچ ارب انسان اس دنیا میں آباد ہیں، یہ بڑی عجیب بات ہے کہ پانچ ارب سال میں صرف پانچ ارب کی آبادی زمین پر ہوئی ہے۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ بعض سائنسدان ان کو کچھ کہتے ہیں اور خود ہی اس کی نفی کرتے ہیں۔ اس کے پیچھے کیا عوامل ہیں؟ لیکن یہ بات طے ہے کہ زمین بہت طویل عرصہ سے قائم ہے اور زمین پر بستیاں بستی ہیں اور برباد ہو جاتی ہیں۔ ہمارے پاس جو تاریخ ہے وہ پانچ ہزار سال پر محیط ہے۔ ہم حضرت آدمؑ کے زمین پر اترنے کے بعد کی زندگی کا مطالعہ کرتے

ہیں تو زمین کے مختلف ادوار ہمارے سامنے آتے ہیں اور یہ سارے ادوار ارتقائی مراحل طے کر کے پھر اس نقطہ پر آجاتے ہیں جہاں سے شروع ہوئے تھے۔

کسی بھی دور کے ابتدائی مراحل میں ایثار اور خلوص کی نمایاں تصویریں ہوتی ہیں اور جیسے جیسے عمر بڑھتی ہے ایثار اور خلوص کی تصاویر تاریکی میں ڈوب جاتی ہیں۔ روشن اور تاریک تصاویر کے گورکھ دھندے کو سمجھا جائے تو اس کے علاوہ کوئی بات ذہن میں نہیں آتی کہ زندگی کے مختلف شعبوں میں ایک مخصوص گروہ کی ہمیشہ اجارہ داری رہی ہے۔ یہی حال مذاہب عالم کا ہے۔ ہم جب تورات اور زبور کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہاں ہمیں ''ربّی'' کا لفظ ملتا ہے۔ حضرت موسیٰؑ کی تمام تر کوششوں اور جدوجہد کے بعد عوام الناس کو یہ بات باور کرائی گئی کہ ہمارا رب ایک ہے جیسے جیسے حضرت موسیٰؑ کے پیش کردہ مذہب توحید کی عمر بڑھتی گئی اس پر ایک مخصوص گروہ کا تسلط قائم ہوتا رہا اور مذہبی پیشواؤں نے اپنے لئے ''ربّی'' کا نام متعین کر لیا۔

مقدس کتاب انجیل میں فادر کا لفظ حضرت عیسیٰؑ نے استعمال کیا، عیسائی مذہب کے پیشواؤں یعنی پادریوں نے اپنا نام فادر رکھ لیا۔ ''برہما'' خدا کے معنوں میں بولا جاتا ہے مذہبی پیشواؤں نے اپنا نام برہمن رکھ لیا۔ اسلام خالص توحید ہے، مولیٰ کا لفظ آقا کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، دانشوروں نے اپنا تعارف مولانا ''ہمارے آقا'' کے نام سے کرایا یعنی سارے مذہبی پیشوا آقا ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ ہر مذہب کے ساتھ یہی ہوتا رہا ہے اور مذہب کو بعض دانشور اپنی مصلحتوں سے مسخ کر رہے ہیں۔ اس وقت اسلام کی جو صورتحال ہے وہ بھی ان تاریخی شواہد سے مختلف نہیں ہے۔ اہل پاکستان کو یہ جان کر حیرت ہوگی کہ یورپ میں مساجد کے لئے بینک سے سودی قرضہ لیا جاتا ہے اور جمعہ کو چندہ اکٹھا کر کے بینک کا سود ادا کیا جاتا ہے۔

عوام کی حالت زار یہ ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ اس تاریک مذاق پر تبصرہ بھی نہیں کر سکتے۔ ایک مخصوص گروہ نے ہر مذہب پر اپنا تسلط اس طرح قائم کر لیا ہے کہ عوام الناس بکھر گئے ہیں اور ٹوٹ گئے ہیں۔ عوام کے بکھرنے اور ٹوٹنے سے ان کے اندر فرقے بن گئے ہیں۔ اس تفرقہ بازی سے بعض دانشور پورا پورا فائدہ اٹھا رہے ہیں جس میں مالی مفاد بھی ہے، انا کی تسکین بھی ہے اور محدود سوچ کی چھاپ بھی منتقل ہو رہی ہے۔ جس طرح بعض مذہبی دانشوروں نے عوام الناس کو اپنا لقمہ تر سمجھ لیا ہے۔ اس طرح بعض سائنسدانوں نے بھی ترقی کا جال پھینک کر عوام کو اپنا شکار بنا لیا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ اس ترقی کے پیچھے ایک مخصوص گروہ کی تجوریاں زر و جواہر سے بھر رہی ہیں۔

سائنسدان سرمایہ داروں کے لئے کام کر رہے ہیں اور سرمایہ دار سائنسدانوں کو نواز رہے ہیں۔ اس ترقی کے دور میں جتنے امراض ہیں اور جتنے امراض روز بروز دریافت ہو رہے ہیں وہ دراصل سائنسی ایجادات کا منہ چڑانے والی بات ہے۔

کہا جاتا ہے کہ یورپ ایک ترقی یافتہ خطہ ہے لیکن یہاں اگر کسی کو بخار ہو جائے تو ایک ماہ تک ڈاکٹر سے وقت نہیں ملتا۔ ہسپتالوں میں جائیں تو وہاں اتنے مریض ہیں کہ برآمدوں میں بھی مریضوں کے بستر لگے ہوئے ہیں۔ سائنسی ایجادات کے ساتھ ساتھ ایسے ایسے مرض پیدا ہو گئے ہیں کہ جن کے بارے میں میڈیکل سائنس کہتی ہے کہ ان کا کوئی علاج نہیں۔ سائنسی ترقی کی چکاچوند میں ان کی آنکھیں اتنی خیرہ کر دی گئی ہیں کہ انہیں کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ عوام سکون حاصل کرنے کے لئے امراض سے نجات حاصل کرنے کیلئے مذہب کی طرف رجوع کرتے ہیں تو وہاں بھی انہیں سکون اور شفاء نہیں ملتی۔

بات یہ ہے کہ ہر دور میں ایک مخصوص طبقہ نے اپنی ذہانت سے، اپنی چالاکی سے عوام کو بے وقوف بنایا ہے۔ حضور پاک ﷺ سے پہلے ان لالچی لوگوں سے عوام کو تحفظ دینے کے لئے قدرت نبی بھیجتی رہی اور لوگوں کو ذہنی سکون اور امراض سے شفاء ملتی رہی۔ لیکن اب جب کہ نبوت کا سلسلہ ختم ہو گیا ہے سکون و عافیت حاصل کرنے کے لئے نوع انسانی کے پاس روحانیت کے علاوہ کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔

دانشوروں اور سائنسدانوں میں یقیناً ایسے لوگ موجود ہیں جو اللہ کی مخلوق کے لئے اپنے دلوں میں گداز رکھتے ہیں۔ اگر دانشور اور سائنس دان اپنے اس گداز سے اللہ کی مخلوق کو آلام و مصائب اور عدم تحفظ کے احساس سے نجات دلانا چاہتے ہیں تو اس کا ذریعہ صرف اور صرف روحانی علوم ہیں اور روحانی علوم کے لئے بہر حال دانشوروں اور سائنسدانوں کو اخلاص نیت سے کام لینا پڑے گا۔ ایسا خلوص جس میں مادی غرض شامل نہ ہو اگر ایسا نہیں کیا گیا تو قانون قدرت کے مطابق ہر دور شروع ہوتا ہے جب اس میں مصلحت اور خود غرضی آجاتی ہے تو فنا ہو جاتا ہے۔ یہ دنیا جو اب آتش فشاں بن گئی ہے، ختم ہو جائے گی، نہ کوئی دانشور رہے گا اور نہ کوئی سائنسدان۔

اسوۂ حسنہ

یہ دنیا سترہ بار تباہ ہو کر دوبارہ آباد ہوئی ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ سمندر کے نیچے کی زمین اوپر آجاتی ہے اور شہروں میں بسی ہوئی آباد زمین سمندر کے نیچے چلی جاتی ہے۔ سترہ یا اٹھارہ بار یہ زمین زیر سمندر جا چکی ہے یہ سلسلہ ختم نہیں ہوا، ابھی جاری ہے۔

پہلی مرتبہ جب زمین تہہ آب گئی تو انسانی آبادی تھی نہ چوپائے تھے، نہ پرندے تھے۔ کچھ بھی نہیں رہا تھا۔ قدرت نے چاہا کہ بے آباد زمین آباد ہو تو آدم و حوا زمین پر اترے۔ یوں بھی کہا جاتا ہے کہ زمین میں سے مخلوق اگ آئیں جیسے برسات میں گھاس پھونس اگ آتی ہے اور خوبصورت سرخ مخملی بیر بہوٹی زمین پر رینگنے لگتی ہے۔ آدم کی اولاد جیسے جیسے بڑھی بستیاں وجود میں آئیں اور پورے پورے شہر زمین کے ماتھے کا جھومر بن گئے۔

آدم کا شعور بہت کم تھا وہ نہیں جانتا تھا کہ گوشت کا شوربہ اور روٹی کیا ہے؟ اسے آسائش و آرام کے لئے روئی اور فوم کے گدوں اور گداز قالین کا بھی کوئی علم نہیں تھا۔ قانون قدرت کے تحت آدم کی نسل دو چار، چار سے آٹھ اور اسی طرح جب ہزاروں سے تجاوز کر کے لاکھوں تک پہنچی تو شعور بھی لاکھوں گنا ہو گیا۔ شعور کی طاقت میں اضافہ ہوا تو آدم کے بچوں نے جڑیں، ناپختہ پھل اور کچا گوشت کھانے میں کراہیت محسوس کی، ہاضمے کے اوپر زیادہ بار پڑا اور پیٹ درد کی شکایت عام ہو گئی تو شعور نے آدم کی رہنمائی کی۔ گوشت پکا کر کھانا چاہئے، گندم پیس کر آٹے کی روٹی بنانی چاہئے۔ شعور برابر آدم کی رہنمائی کرتا رہا۔ قانون ہے کہ جب شعور ایک ہو یا ہزار ہوں کسی نقطے پر مرکوز ہو جائیں تو قدرت نے اپنے اوپر لازم کر لیا ہے کہ اس کا مظاہرہ ہو گا۔ اجتماعی شعور نے قدرت کے سسٹم میں ہلچل مچا دی لاکھوں آدمیوں میں سے ایک نے غیر اختیاری طور پر دو پتھر اٹھائے ان کو آپس میں ٹکرایا، ٹکرانے سے حرارت پیدا ہوئی تو پتھروں میں سے چنگاری نکلی۔ چنگاری کی چمک نے شعور کو اس طرف متوجہ کیا کہ چنگاری سوکھی گھاس کو جلا ڈالے گی اور دیکھتے ہی دیکھتے آگ بھڑک اٹھی۔

زمین پر انسان کا یہ پہلا دن تھا جب انسان حیوانات سے ممتاز ہوا اور اس نے اس ایجاد سے اپنے لئے کھانے پکانے شروع کئے۔ حیوانات سے ممتاز ہونے کے بعد انسان کے ذہن میں نئے نئے خیالات نے جنم لیا اور ہر خیال اس کے لئے ایک ایجاد بن گیا۔ آدمؑ اور حوا کے آنے سے پہلے بھی زمین موجود تھی۔ زمین کے اصل وارث دو مخلوق ہیں۔ ا۔ جنات۔۔۔۔۔۔ ۲۔ انسان

جنات نے جب زمین پر خون خرابہ کیااور زمین کی کوکھ اجاڑنے کی ہر تدبیر پر عمل کیا تو قدرت نے زمین کو فساد زدہ قرار دے دیا اور جنات سے زمین کی سرداری چھین لی۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہوئی کہ آدم زاد نے وہی کیا جو جنات برسوں سے کرتے چلے آرہے تھے اور جس کی وجہ سے ان سے سرداری چھین لی گئی تھی۔ بھائی نے بھائی کو قتل کر دیا اور سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا۔

حضرت آدمؑ نے زندہ رہنے کے لئے جو قوانین بنائے قوم نے انہیں مسترد کر دیا۔ آدمؑ کو گزرے جب ۱۶۴۲ سال گزر گئے اس وقت نوحؑ پیدا ہوئے۔ ساری نوع انسانی اس وقت بت پرستی میں لگ گئی تھی۔ حضرت نوحؑ ۹۵۰ برس تک توحید کی تبلیغ کرتے رہے، قرآن میں ان کی تعریف ''عبدالشکور'' کہہ کر کی گئی ہے۔ پانی کے ہر گھونٹ اور ہر لقمے پر الحمدللہ کہتے تھے۔ نو سو پچاس برسوں تک تبلیغ کرنے پر اسی (۸۰)

مرد اور عورتیں ایمان لائے باقی قوم نے ان کی نصیحت پر عمل نہیں کیا۔ اس پاداش میں قوم پر عذاب نازل ہوا۔ زمین کو فساد سے پاک کرنے کے لئے آسمان سے اتنا پانی برسا کہ زمین اور سمندر ایک ہو گیا۔ گاؤں، گوٹھ، قصبے، شہر ڈوب گئے سمندر نے زمین کو نگل لیا۔ پوری قوم غرق آب ہو گئی بیٹا بھی ہلاک ہو گیا۔ اسی مرد اور عورتیں جو ایمان لائے تھے عذاب الٰہی سے بچ گئے۔ زمین چھ مہینے تک پانی میں ڈوبی رہی، طوفان ختم ہونے پر کشتی جودی پہاڑی پر ٹھہری۔ ایمان لانے والے سلامتی کے ساتھ کشتی سے اترے لیکن ان کی نسل نہ چل سکی۔ نوحؑ کے تین بیٹے ''حام'' ''سام'' اور ''یافث'' جو کشتی میں سوار تھے۔

ان سے آدم کی نسل کا دوبارہ آغاز ہوا۔ حام چھوٹے بیٹے تھے، سام منجھلے اور یافث بڑے بیٹے تھے، آج کی دنیا میں جہاں بھی جس رنگ کی بھی جو نسل آباد ہے وہ ان ہی تین بھائیوں کی اولاد ہے۔ نوحؑ نے چودہ سو سال کی عمر میں وفات پائی۔

قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ کا ذکر ۷۰ بار آیا۔ ابراہیمؑ سریانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی مہربان باپ کے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ آدمؑ کے تین ہزار تین سو سال کے بعد پیدا ہوئے۔ ان کا باپ بت تراش تھا، باپ نے بیٹے کو گھر سے نکال دیا۔ ابراہیمؑ کو اس کے رب نے کئی باتوں میں آزمایا اور وہ ہر آزمائش میں پورے اترے اور ثابت قدم رہے۔ آدمؑ کے بعد انہوں نے کعبہ شریف بنایا جس پتھر پر کھڑے ہو کر کعبہ کی بنیاد کو اٹھایا وہ پتھر ابھی تک موجود ہے جس کو مقام ابراہیم کہتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۱۷۵ سال کی تھی جب حضرت ابراہیمؑ کی عمر ۸۶ برس کی ہوئی تو حضرت اسمٰعیلؑ پیدا ہوئے۔ اسمٰعیلؑ ایک سو برس کے تھے کہ فرشتوں نے بشارت دی اور حضرت اسحٰقؑ پیدا ہوئے ان کا نام قرآن کریم میں سترہ جگہ ہے، ان کی ایک سو اسی برس عمر ہوئی۔

حضرت عیسیٰؑ کا نام قرآن میں ۳۶ جگہ آیا ہے ان کی والدہ حضرت مریمؑ کا نام قرآن میں ۳۴ جگہ آیا ہے۔ انجیل آسمانی کتاب ان پر نازل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کی ہدایت کے لئے زمین کے چپے چپے پر ہادی اور پیغمبر بھیجے جن کی تعداد کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے جبکہ قرآن کریم میں ۲۵ پیغمبروں کا ذکر آیا ہے۔

نوٹ:(پیغمبران کی عمروں کا تعین روایات کے تحت کیا گیا ہے)

باعث تخلیق کائنات، تاجدار عالم، سید مرسلین خاتم النبیین حضرت محمد ﷺ کا نام انجیل میں ''فارقلیط'' بیان ہوا ہے جس کا ترجمہ احمد ہے۔ ہر آسمانی کتاب میں ان کی آمد کی اطلاع دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ایک نجات دہندہ آئے گا۔ آپ ﷺ کل بنی آدم و جنات کے لئے قیامت تک رحمت العالمین بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ آپ ﷺ کو جو شریعت دی گئی وہ قیامت تک مکمل قانون ہے۔

حضور ﷺ زیادہ تر خاموش رہتے تھے، بیماروں کی عیادت کرتے، جنازے کے ساتھ جاتے، اپنے گھر کا کام کاج خود کرتے، مکہ مکرمہ میں چالیس سال کے بعد جب آپ ﷺ نے نبوت کا اعلان فرمایا تو اہل مکہ کو دعوت توحید سخت ناگوار گزری۔ حضور ﷺ نے جس قدر تکلیفیں اٹھائیں اور جس قدر انہیں صدمے پہنچے وہ بیان سے باہر ہیں۔ جب تکالیف و مصائب کی انتہا ہوگئی تو آپ ﷺ نے اللہ کے حکم سے ہجرت فرمائی اور اپنے عزیز واقارب، گھر بار، مال و متاع کی ذرہ بھر بھی پرواہ نہیں کی۔ جس وقت آپ ﷺ نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ہمراہ مکہ سے مدینے ہجرت فرمائی اس وقت آپ ﷺ کی عمر ۵۳ برس تھی۔ اللہ نے اپنے محبوب کو بڑے بڑے معجزے عطا فرمائے، شق القمر کا معجزہ، معجزہ شق القمر تمام معجزوں سے بڑا معجزہ ہے۔ اللہ نے اپنے آپ کو رب العالمین فرمایا ہے اور رسول اللہ ﷺ کو رحمت اللعالمین بنا کر کائنات سے متعارف کرایا ہے۔

نوع کے افضل بندے حضرت محمد ﷺ کو اللہ نے اپنے پاس بلا لیا اور خود سے اتنا قریب کر لیا کہ دو کمانوں کا فاصلہ رہ گیا یا اس سے بھی کم اللہ نے اپنے بندے سے راز و نیاز میں کہا اور فرمایا:

''ہم نے اپنے محبوب بندے سے راز و نیاز کی باتیں کیں اور ہمارے بندے نے جو دیکھا جھوٹ نہیں دیکھا۔''

سیدنا ﷺ نے نہایت مشقت، مصائب اور پریشانی برداشت کر کے اپنی امت کو پروگرام عطا کیا وہ خالص توحید ہے۔ حضور پاک ﷺ کا ارشاد ہے:

*جو تم اپنے لئے چاہو وہ اپنے بھائی کے لئے بھی پسند کرو۔

*علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔

*جہاں تم چار ہو وہاں پانچواں اللہ ہے۔

*اللہ تمہاری رگ جاں سے زیادہ قریب ہے۔

*اللہ ہر شئے پر محیط ہے۔

*کافر کو برا نہ کہو۔

*دوسرے مذاہب کے علماء کا احترام کرو، انہیں برا نہ کہو ورنہ وہ بھی تمہارے علماء کو برا کہیں گے۔

رسول اللہ ﷺ برائی کا بدلہ برائی سے نہیں دیتے تھے بلکہ معاف اور درگزر فرمادیتے تھے۔ اللہ کی کتاب قرآن کریم میں بڑی وضاحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

''آپس میں تفرقہ نہ ڈالو۔''

سن ۱۱ ہجری ماہ صفر کے آخری دنوں میں آپ ﷺ بیمار ہوگئے بخار کی شدت سے جسم میں ناتوانی اتنی زیادہ ہوگئی کہ باہر نکلنے کی طاقت نہ رہی اور قریباً چار روز بیمار رہ کر پیغمبر آخر زماں اللہ کے محبوب حضرت محمد ﷺ ۱۲ ربیع الاول ۱۱ ہجری بروز پیر بوقت چاشت رحمت العالمین کے تمام اوصاف حمیدہ کے ساتھ اپنے دوست اللہ رب العالمین کے حضور تشریف لے گئے۔

(اناللہ وانا الیہ راجعون)

حضوری کے وقت آپ کی عمر ۶۳ برس اور پانچ دن تھی۔ اس وقت امت مسلمہ کا جو حال ہے وہ یہ ہے کہ سابقہ امتوں کے جن اعمال و کردار کی وجہ سے عذاب الٰہی نازل ہوا وہ سب کے سب امت مسلمہ میں مشترکہ طور پر موجود ہیں۔ جس طرح دوسری امتوں نے اپنے پیغمبروں سے اور اپنے پیغمبروں کی تعلیمات سے روگردانی کی اور برائیوں پر اصرار کیا تھا مسلمان قوم بھی ایسے ہی کردار میں مبتلا ہے۔ جھوٹ عام ہوگیا ہے، کم تولنا، ملاوٹ، بلیک مارکیٹنگ، نفرت، حسد، قتل و غارت گری زندگی میں اس طرح سرایت کرگئی ہے کہ اب اس سے راست کاری کی بھی کوئی صورت نظر نہیں ہوتی۔ ایک کلمہ گو دوسرے مسلمان کو نہ صرف کافر کہتا ہے بلکہ اس کے قتل سے بھی گریز نہیں کرتا۔ ہر شخص مایہ جال میں گرفتار ہونے کو خوش قسمتی سمجھنے لگا ہے۔ موت کے بعد کی زندگی بے وقعت ہوگئی ہے۔ احساس گناہ ختم ہوگیا ہے اللہ نے سود کو اپنے ساتھ دشمنی قرار دیا ہے گویا کہ قرآن کہتا ہے کہ:

''جو لوگ سونا چاندی جمع کرتے ہیں اور اللہ کے لئے خرچ نہیں کرتے ان لوگوں کے لئے عذاب علیم کی بشارت ہے۔''

مگر حال یہ ہے کہ ہمارے علماء، دانشور اور مشائخ اس سلسلے میں کوئی مثبت جدوجہد نہیں کرتے۔ اللہ کا قانون اٹل ہے، تمام حجت کی تکمیل ہونے کے بعد لازماً قانون قدرت حرکت میں آتا ہے۔ بے شک ہمارے نبی رحمت اللعالمین ہیں مگر اللہ کا قانون بھی جاری و ساری ہے۔ اللہ اس قوم کی حالت نہیں بدلتا جو قوم خود اپنی اصلاح کے لئے جدوجہد نہیں کرتی۔ اگر ہم رحمت اللعالمین کی رحمت

کے سہارے آپس میں اتحاد واتفاق کے ساتھ ان برائیوں کو جن برائیوں سے دوسری امت عذاب الٰہی سے ہلاک ہوچکی ہیں، چھوڑ دیں تفرقہ سے باز آجائیں تو عذاب الٰہی سے بچ سکتے ہیں۔

خاتم النبیین دوجگ کے تاجدار حضور پاک ﷺ کے اسوہ حسنہ کو اپنے اوپر محیط کرنے کے لئے ضروری ہے کہ حضور پاک ﷺ نے جس طرح زندگی گزاری ہے ہم بھی اس کا عملی مظاہرہ کریں۔

اولیاءاللہ کی طرز فکر

ایک روز حضرت رابعہ بصریؒ نے بارگاہ الٰہی میں عرض کیا۔اے اللہ! اگر میں تیری عبادت دوزخ کے خوف سے کرتی ہوں تو مجھے اس میں جھونک دے اور اگر میں تیرے حضور جنت کی لالچ میں سجدہ کرتی ہوں تو مجھے اس جنت سے محروم کر دے اور اگر میں صرف تیری ذات کے لئے تیری عبادت کرتی ہوں تو مجھے اپنے دیدار سے نواز دے۔

زاہدوعابد دوزخ سے نجات اور جنت کی ابدی نعمتیں حاصل کرنے کے لئے عبادتیں کرتے ہیں،عبادت روحانی لوگ بھی کرتے ہیں اور ہمہ وقت اللہ کی طرف متوجہ رہتے ہیں لیکن ان کے پیش نظر خوف، طمع،لالچ یا جنت مقصد نہیں ہوتا وہ صرف اس لئے اللہ کے ساتھ وابستہ رہتے ہیں کہ ان کی زندگی کا مقصد اللہ کے علاوہ دوسرا نہیں ہوتا۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں:

''روحانیت یہ ہے کہ اللہ بندے کو اس کی اپنی ذات سے فنا کر دے اور اپنی ذات کے ساتھ زندہ رکھے۔''

امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

''اس منزل کا راستہ یہ ہے کہ پہلے مجاہدہ کرے، بری عادتوں سے خود کو آزاد کرے تمام تعلقات سے آزاد ہو کر پوری طرح اللہ کی طرف متوجہ ہو جائے جب یہ سعادت حاصل ہو جاتی ہے تو اللہ اپنے بندے کے دل کا نگہبان بن جاتا ہے اور علم کے انوار سے بندے کے دل کو منور کر دیتا ہے۔''

روحانی علوم اور روحانی واردات پر ایک طبقہ یہ اعتراض کرتا ہے کہ تصوف کا اسلام میں کوئی عمل دخل نہیں ہے اسے اسلام میں زبردستی داخل کر دیا گیا ہے۔ایک اور طبقہ یہ کہتا ہے کہ تصوف یا روحانی مکتبہ فکر افیون ہے۔ان علوم کو سیکھ کر آدمی مفلوج ہو جاتا ہے اور دنیاوی نعمتوں سے اس لئے فرار حاصل کرتا ہے کہ وہ دنیا میں موجود تلخ حقیقتوں سے دوچار ہونے کے لئے تیار نہیں ہے۔یہ ایک ایسی بحث ہے جو ہزار سال سے زیادہ بلکہ اس سے بھی زیادہ عرصہ سے وجہ اختلاف بنی ہوئی ہے،کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ تصوف یا روحانی مکتبہ فکر بدھ مت سے ماخوذ ہے۔روحانی لوگوں کا دنیا سے قطع تعلق در حقیقت گوتم بدھ کی تقلید ہے،بدھا صاحب

نے تخت وتاج چھوڑ کر فکر وفاقہ کی زندگی اختیار کر لی تھی۔ اسی طرح مسلمان صوفیانے بھی دنیاوی لذتوں، آسائشوں اور راحت و آرام کو ترک کر کے جنگلوں اور غاروں میں بسیرا کیا، کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ بے عملی کی سنہری زنجیروں میں وہ لوگ خود کو گرفتار کر لیتے ہیں جو بے ہمت ہوتے ہیں اور جن کی زندگی میں مصائب و آلام کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں ہوتی، بہر حال یہ ایک بحث ہے جو ایک سو پچاس ہجری سے جاری ہے، جو صاحب سب سے پہلے صوفی کے نام سے متعارف ہوئے وہ عبوالہاشم الکوفی تھے جن کی وفات ایک سو پچاس ہجری میں ہوئی تھی، کہنے والوں نے بہت کچھ کہا اور سننے والوں نے ان معترضین کے اٹھائے ہوئے سوالات کے جوابات بھی دیئے اور اس طرح روحانیت یا تصوف ایک خیالی مسئلہ بن کر رہ گیا، لیکن تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ ہر زمانے میں اہل روحانیت لوگ موجود رہے اور انہوں نے ان علوم کی نہ صرف حفاظت کی بلکہ اپنے شاگردوں میں یہ علوم کبھی کبھی تحریر کے ذریعے، کبھی مکتوبات کے ذریعہ اور کبھی کتابوں کے ذریعہ منتقل کئے۔

کسی بھی مذہب کے عنوان سے جب تاریخ پر نظر جاتی ہے تو وہاں یہ بڑا عجیب "راز" سامنے آتا ہے کہ عقیدہ توحید اور عقیدہ رسالت کو عام کرنے میں انہی صوفیاء حضرات کا عمل دخل ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جب چنگیز خانی طوفان نے دنیائے اسلام کو تہہ و بالا کر کے رکھ دیا تھا، شہر ویران ہو گئے تھے، لوگوں کو قتل کر کے ان کے سروں کے مینار بنا دیئے گئے تھے، بغداد کی آٹھ لاکھ آبادی میں سے چار لاکھ قتل و غارتگری کی بھینٹ چڑھ گئے تھے، علم و حکمت اور ہر قسم کے علوم کی کتابوں کا ذخیرہ آگ کی بھٹیوں میں جھونک دیا گیا تھا، علماء فضلاء اور دانشور اسلام کے مستقبل سے مایوس ہو گئے تھے۔ اس وقت اس سرکش طوفان کا رخ انہی لوگوں (گروہ صوفیاء) نے موڑ دیا تھا۔ طوفانوں کا مقابلہ کر کے ان لوگوں نے اسلام دشمن لوگوں کو اس طرح تربیت کی کہ اسلام کے دشمن شمع اسلام کے لئے پروانہ بن گئے تھے۔ انہی صوفیاء کے گروہ کے ایک آدمی نے ظلم و جبر، بے حیائی، قتل و غارتگری، بدنیتی کی فضاء کو بدل دیا تھا۔

تاریخ کا مطالعہ کرنے والے لوگ جانتے ہیں کہ ایک بزرگ جو سلسلہ عالیہ قادریہ کے درخشاں ستارے تھے، ہلاکو خان کے بیٹے تگودار خان کو دعوت اسلام دینے کیلئے تشریف لے گئے، تگودار خان شکار سے واپس آ رہا تھا۔ اپنے محل کے دروازے پر ایک درویش کو دیکھ کر اس نے ازراہ تمسخر پوچھا:

"اے درویش تمہاری داڑھی کے بال اچھے ہیں یا میرے کتے کی دم؟"

اس بیہودہ طنزیہ اور ذلت آمیز سوال پر درویش برہم نہیں ہوئے، شگفتہ چہرے کے ساتھ نہایت تحمل سے فرمایا:

"اگر میں اپنی جان نثاری اور وفاداری سے اپنے مالک کی خوشنودی حاصل کر لوں تو میری داڑھی کے بال اچھے ہیں ورنہ آپ کے کتے کی دم اچھی ہے جو آپ کی فرمانبرداری کرتا ہے اور آپ کے لئے شکار کی خدمت انجام دیتا ہے۔"

تگودار خان اس غیر متوقع اور انا کی گرفت سے آزاد جواب سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے درویش کو اپنا مہمان بنالیا۔ درویش کے حلم و بردباری اور اخلاق سے اس نے درپردہ اسلام قبول کر لیا لیکن اپنی قوم کی مخالفت کے خوف سے تگودار خان نے درویش کو رخصت کر دیا۔ چنانچہ وہ وطن واپس آگئے، کچھ عرصہ بعد آپ کا انتقال ہو گیا۔ وفات سے پہلے درویش نے اپنے بیٹے کو وصیت کی کہ وہ تگودار خان کے پاس جائے اور اس کو اپنا وعدہ یاد دلائے۔ صاحب زادے تگودار خان کے پاس پہنچے اور اپنے آنے کی غایت بیان کی۔

تگودار خان نے کہا تمام سردار اسلام قبول کرنے پر آمادہ ہیں لیکن فلاں سردار تیار نہیں ہے۔ اگر وہ بھی صراط مستقیم پر آجائے تو یہ مشکل آسان ہو جائے گی۔

صاحب زادے نے جب اس سردار سے گفتگو کی تو اس نے کہا:

''میری ساری عمر میدان جنگ میں گزری ہے۔ میں علمی دلائل کو نہیں سمجھتا۔ میرا مطالبہ ہے کہ آپ میرے پہلوان سے مقابلہ کریں اگر آپ نے اسے پچھاڑ دیا تو میں مسلمان ہو جاؤں گا۔''

صاحب زادے صاحب نہایت لاغر، دبلے اور جسمانی لحاظ سے کمزور تھے۔ تگودار خان نے اس مطالبہ کو مسترد کرنا چاہا لیکن صاحب زادے نے سردار کا چیلنج منظور کر لیا۔ مقابلے کے لئے جگہ اور تاریخ کا اعلان کر دیا گیا۔ مقررہ دن مخلوق کا اژدھام یہ عجیب و غریب دنگل دیکھنے کے لئے جمع ہو گیا۔ ایک طرف نحیف و کمزور ہڈیوں کا ڈھانچہ لاغر جسم تھا اور دوسری طرف گرانڈیل نوجوان اور فیل تن پہلوان تھا۔ تگودار خان نے کوشش کی کہ یہ مقابلہ نہ ہو لیکن درویش مقابلہ کرنے کے لئے مصر رہا اور جب دونوں پہلوان اکھاڑے میں آئے تو صاحب زادے نے اپنے حریف کو زور سے طمانچہ مارا اور وہ پہلوان اس تھپڑ کو برداشت نہ کر سکا اس کا سر پھٹ گیا، خون کا ایک فوارہ ابلا اور پہلوان غش کھا کر زمین پر گر گیا۔ سردار حسب وعدہ میدان میں نکل آیا۔ اس نے صاحب زادے کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔

تگودار خان نے بھی اپنے ایمان کا اعلان کر کے اپنا نام احمد رکھا۔ ہلاکو خان کا چچازاد بھائی بھی شیخ شمس الدین باخوریؒ کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوا۔

قسطنطنیہ کی فتح تاریخ اسلام کا ایک لافانی باب ہے۔ حضرت شمس الدین سلطان محمد کے مرشد کریم تھے۔ انہی کی ترغیب اور بشارت سے سلطان محمد نے قسطنطنیہ کو فتح کیا۔ تاریخ کے صفحات جتنے زیادہ پلٹیئے اہل تصوف اور روحانی لوگوں کا ایک قافلہ ہے جو دین اسلام کو نہ صرف پھیلانے میں نظر آتا ہے بلکہ اللہ نے ان فقراء کو کامیابی اور کامرانی سے نوازا ہے۔

حضرت معین الدین چشتیؒ، خواجہ غریب نوازؒ بھی اسی کارواں کے ایک ممتاز فرد ہیں جن کے دم قدم سے ہندوستان میں اسلام پھیلا۔ حضرت سلطان الہند خواجہ غریب نوازؒ نے روحانی قافلہ کے ایک ممتاز سردار ابوالحسن علی ہجویریؒ کے مزار پرانوار پر ۴۰ دن عبادت کی۔ حضرت علی ہجویریؒ نے حضرت سلطان الہندؒ پر لطف وعنایت، اسرار و رموز کی جو بارش کی اس کا علم تو حضرت غریب نواز ہی کو ہو سکتا ہے لیکن جب آپ آستانہ عالیہ سے رخصت ہوئے تو بے ساختہ فرمایا۔

گنج بخش فیض عالم مظہر خدا

ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

حضرت علی ہجویریؒ ایک بلند پایہ عالم، بالغ نظر محقق تھے۔ آپ کا باطن نور عرفاں سے جگمگ کرتا ہے۔ آپ نے متعدد کتابیں تصنیف کیں۔

۱۔اشعار کا مجموعہ ۲۔ کتاب فناوبقاء ۳۔اسرار الخلق والموٴنات ۴۔ کتاب البیان لاہل العیان

۵۔بحر القلوب ۶۔السر عاتیہ الحقوق اللہ ۷۔ منہاج الدین ۸۔ شرح کلام منصور الحلاج

حضرت داتا گنج بخشؒ نے اپنی زندگی میں وعظ ونصیحت، تحریروں اور کتابوں سے اسلام کی بھرپور خدمت سرانجام دی اور یہ خدمت نو سو پچاس سال سے جاری ہے۔ ۹۵۰ سال گزر گئے آپؒ کا تصرف لوگوں کے قلب پر نقش ہے۔ نقش ہوتا رہا اور نقش ہوتا رہے گا۔ نوع انسانی پر عموماً اور امت مسلمہ پر خصوصاً حضرت علی ہجویری داتا گنج بخشؒ کا جو فیض عام ہے وہ اللہ کی ایسی سنت ہے جس میں نہ تبدیلی ہوتی ہے اور نہ تعطل ہوتا ہے۔ اس عرصے میں بے شمار لوگوں نے حضرت داتا گنج بخشؒ سے روحانی فیض حاصل کر کے اکتساب علم کیا۔ الحمدللہ سلسلہ عالیہ عظیمیہ کو بھی یہ سعادت حاصل ہے کہ یہ سلسلہ بھی حضرت داتا گنج بخشؒ کے فیض سے مالا مال ہے۔

ہم کھلی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں کہ یہ دور مادیت کا دور ہے، مادی لذتوں اور جاہ ومنصب کے حصول کے لئے انسان مادر پدر آزاد ہو کر اخلاقی قدروں کو پھلانگ چکا ہے۔ دل، دنیا کی طمع، حرص، بغض وحسد سے سیاہ ہو گیا ہے۔ انسان انسان کا دشمن بن گیا ہے۔ ترقی کی تعریف اب یہ ہے:

''کہ کون آدمی کون سا ایسا ہتھیار بنا سکتا ہے جو کم وقت میں زیادہ سے زیادہ انسانوں کو ختم کردے۔''

ترقی کی چکاچوند نے آدمی کو عارضی آرام و آسائش تو مہیا کر دی ہے لیکن اس ترقی کے پیچھے نوع انسانی کو ایسی بیماریوں نے گھیر لیا ہے جس کا علاج بھی ہمارے پاس نہیں ہے اور اگر علاج ہے بھی تو وہ ایک مخصوص طبقہ (سرمایہ داروں) کے لئے ہے۔ اس لئے کہ کوئی غریب آدمی دل کی پیوند کاری پر چھ سات لاکھ روپے خرچ نہیں کر سکتا اعلیٰ ہذالقیاس۔

آرام و آسائش کی مادی دوڑ نے نوع انسانی کو نہ صرف ہلا کر رکھ دیا ہے بلکہ ہلاکت کے گڑھے میں دھکیل دیا ہے۔ کوئی یہ نہیں چاہتا کہ اس آسائش و آرام کی دنیا میں انسان محروم زندگی بسر کرے بلکہ یہ حقیقت اظہر من شمس ہے کہ اگر ہم اولیاء اللہ کی طرز فکر پر قائم رہ کر زندگی گزاریں تو دنیا کا ہر کام ہر آسائش ہمارے لئے نعمت بن جائے گی۔ زندگی کا مقصد وہ چیز ہے جو انسان کے ساتھ ہمہ وقت رہے۔ مادی دنیا نے کبھی کسی کا ساتھ نہیں دیا اس لئے مادی دنیا کو بھرپور استعمال کرنا تو چاہئے لیکن اس کو زندگی کا مقصد قرار نہیں دینا چاہئے۔

حضرت داتا گنج بخش ہجویریؒ اپنی کتاب ''کشف المحجوب'' میں لکھتے ہیں:

''فقیر تہی دست کو نہیں کہتے جس کے پاس متاع اور زادراہ نہ ہو۔ فقیر وہ ہے جس کا دل خواہشات سے مغلوب نہ ہو۔ فقیر کی صفت یہ ہے کہ کچھ نہ ہو تو شکوہ نہ کرے اور جب موجود ہو تو خوب خرچ کرے۔ جب کچھ نہ ہو تو صبر کرے اور جب کچھ ہو تو دوسروں کو خود سے زیادہ مستحق سمجھ کر ان پر خرچ کرے۔''

سورج اور چاند کا ملاپ توحید کا اتحاد ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ توحید خداوند کے نور کے سامنے چاند اور سورج کی روشنی بے کار ہے اور دونوں کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا مگر دنیا میں چاند اور سورج سے روشن کوئی چیز نہیں ہے۔ آنکھ آفتاب اور مہتاب کے جلوہ کی متحمل نہیں ہے۔ جب آفتاب و مہتاب اوجِ کمال پر ہوں تو آنکھ آسمان پر دیکھتی ہے تو دل نور معرفت، توحید و محبت کے ذریعہ عرش پر دیکھتا ہے اور دوسرے عالم کے کوائف سے واقفیت حاصل کرتا ہے۔ تمام مشائخ اس پر متفق ہیں کہ جب بندہ مقامات کی قید سے رہائی حاصل کر لیتا ہے اور احوال کی کثافتوں سے آزاد ہو جاتا ہے اور تغیر و تبدل کی بنیاد سے بے نیاز ہو جاتا ہے (بے نیاز ہو جانے کا مطلب ترک نہیں ہے) اور تمام پسندیدہ احوال کے ساتھ مصروف ہو جاتا ہے اور وہ جملہ اوصاف سے جدا ہو جاتا ہے یعنی اپنی کسی پسندیدہ صفت پر نظر رکھ کر اس کے ہاتھوں قید نہیں ہوتا اور اس پر مغرور نہیں ہوتا کہ حال ادراک کی گرفت سے باہر ہو جاتا ہے اور اس کا وقت وسوسوں کے تصرف سے محفوظ ہو جاتا ہے۔

ایثار کی تمثیلات

''اور ہم نے ایسے ہی طور پر ابراہیمؑ کو آسمانوں اور زمین کی مخلوق دکھائیں تاکہ وہ عارف ہو جائیں اور کامل یقین کرنے والوں میں سے ہو جائیں پھر جب رات کی تاریکی ان پر چھا گئی تو انہوں نے ایک ستارہ دیکھا، فرمایا یہ میرا رب ہے، سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپؑ نے فرمایا، میں غروب ہو جانے والوں سے محبت نہیں رکھتا، پھر جب چاند کو چمکتا ہوا دیکھا تو فرمایا یہ میرا رب ہے، سو جب وہ غروب ہو گیا تو فرمایا اگر مجھ کو میرا رب ہدایت نہ کرتا رہے تو میں گمراہ لوگوں میں شامل ہو جاؤں، پھر جب آفتاب کو چمکتا ہوا دیکھا تو فرمایا یہ میرا رب ہے، یہ سب سے بڑا ہے، سو جب وہ غروب ہو گیا تو آپ نے فرمایا۔ اے قوم! بے شک میں تمہارے شرک سے بیزار ہوں، میں اپنا رخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں اور ان سے ان کی قوم نے حجت کرنا شروع کی، آپؑ نے فرمایا تم اللہ کے معاملے میں مجھ سے حجت کرتے ہو حالانکہ اس نے مجھ کو طریقہ بتلا دیا تھا اور ان چیزوں سے جن کو تم اللہ کا شریک بناتے ہو، نہیں ڈرتا۔ ہاں، اگر میرا پروردگار ہی کوئی امر چاہے میرا پروردگار ہر چیز کو اپنے علم کے گھیرے میں لئے ہوئے ہے، کیا تم پھر خیال نہیں کرتے اور میں ان چیزوں سے کیسے ڈروں جن کو تم نے شریک بنایا حالانکہ تم اس بات سے نہیں ڈرتے کہ تم نے اللہ کے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک ٹھہرایا جن پر اللہ تعالٰی نے کوئی دلیل نازل نہیں فرمائی۔ سو ان دو جماعتوں میں سے امن کے زیادہ مستحق کون ہیں؟ اگر تم خبر رکھتے ہو تو جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اور اپنے ایمان کو شرک کے ساتھ مخلوط نہیں کرتے ایسوں ہی کے لئے امن ہے اور وہی راہ ہدایت پر چل رہے ہیں۔ یہ ہماری محبت تھی جو ہم نے ابراہیمؑ کو ان کی قوم کے مقابلے میں دی تھی، ہم جس کو چاہتے ہیں رتبہ میں بڑھا دیتے ہیں، بے شک آپ کا رب بڑا علم والا بڑی حکمت والا ہے۔''

(سورۃ انعام۔ آیت ۷۶ تا ۸۴ پارہ ۷)

حضرت ابراہیمؑ کے والد آذر بت تراش تھے۔ اپنے فن میں یگانہ روزگار تھے۔ فن بت تراشی میں انہیں اس درجہ کمال حاصل تھا کہ ان کے بنائے ہوئے بتوں کو بادشاہ پوجتے تھے۔ فرزند آذر حضرت ابراہیمؑ نے ایسے گھر میں آنکھ کھولی جہاں انہیں آسائش کی سب چیزیں میسر تھیں۔

زر و جواہرات سے خزانے بھرے ہوئے تھے، اس آسائش و آرام کی زندگی میں انہوں نے سوچا کہ میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ اور میری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ اگر میرا باپ آذر ایک بہترین بت تراش ہے تو میرے باپ نے بت تراشی کا انتخاب کیوں کیا؟ بادشاہ کو فہم و عقل کا اعلیٰ کردار سمجھا جاتا تھا، یہ کیسا بادشاہ ہے کہ اپنے جیسے فانی انسان کے ہاتھ سے تراشے ہوئے پتھر کو خدا مانتا ہے اور اس کے سامنے سربسجود ہو جاتا ہے۔

روایت ہے کہ ایک دفعہ حضرت ابراہیمؑ کسی سوچ میں گم کھڑے تھے کہ ایک کتا آیا اور اس نے ٹانگ اٹھا کر ان کے سب سے بڑے بت پر پیشاب کر دیا اور وہاں سے چلا گیا۔

حضرت ابراہیمؑ نے سوچا کہ بناوٹی خدا کے لئے اس سے زیادہ بڑی دلیل کوئی اور نہیں ہو سکتی اور حضرت ابراہیمؑ نے اس سوال کا جواب ڈھونڈنا شروع کر دیا کہ میں کون ہوں؟ کہاں سے آیا ہوں؟ مجھے کس نے پیدا کیا ہے؟ اور میری زندگی کا مقصد کیا ہے؟ حضرت ابراہیمؑ نے زمین کے اوپر موجود اللہ کی بے شمار تخلیقات پر غور و فکر کیا تاکہ انہیں یقین کی قوت حاصل ہو جائے، ذہن گہرائی کی حدود میں پہنچا تو گہرائی میں "علو"

پیدا ہوا اور آنکھیں آسمان کی طرف اٹھ گئیں اور انہوں نے رات کی تاریکی میں ایک ستارہ دیکھا فرمایا۔ یہ میرا رب ہے جب وہ غروب ہو گیا تو اس سے زیادہ چمک دمک والے سیارے چاند کو دیکھا اور فرمایا یہ میرا رب ہے وہ بھی غروب ہو گیا تو سورج کے بارے میں فرمایا۔ یہ سب سے زیادہ روشن اور تابناک ہے سو جب سورج بھی غروب ہو گیا تو فرمایا کہ میں اپنا رخ اس کی طرف کرتا ہوں جس نے زمین و آسمان کو پیدا کیا۔

یعنی زندگی پر غور و فکر کرتے وقت یقیناً یہ بات حضرت ابراہیمؑ کے سامنے آئی ہو گی کہ انسان کے اوپر ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ مر جاتا ہے، اگر انسان کی زندگی کا دار و مدار پانی، ہوا، آکسیجن اور فضاء میں موجود دوسری گیسز پر ہے تو مردہ حالت میں بھی یہ سب چیزیں موجود رہتی ہیں۔

اگر ہوا، پانی اور غذا ہی انسانی زندگی کا سبب ہے تو کسی مردہ جسم کو ان چیزوں کے ذریعے زندہ کرنا ناممکن نہ ہوتا۔ اس تفکر سے یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ انسانی زندگی کا سبب ہوا، پانی غذا نہیں بلکہ کچھ اور ہے۔ ہم جب آدمی کی پوری زندگی کا تجزیہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انسانی زندگی برابر برابر دو حصوں میں تقسیم ہے۔ ایک حصہ سارا کا سارا مادی ہے اور دوسرا حصہ سارا کا سارا مادیت کی نفی ہے، مادیت کی نفی دراصل غیر رب کی نفی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ میں مادیت یا غیر رب کی نفی کی روشن اور واضح مثالیں ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے حضرت اسمٰعیلؑ کو ذبح کر رہے ہیں چونکہ یہ عمل انہوں نے خواب (غیر مادی شعور) میں دیکھا اس لئے مادی شعور کی نفی کر کے

اس خواب کو پورا کر دیکھایا یعنی اپنے عمل سے غیر رب کی نفی کر دی۔ اللہ تعالیٰ نہایت رحیم و کریم ہے کہ اللہ کو غیر رب کی نفی کا یہ عمل اتنا زیادہ پسند آیا کہ انہوں نے حضرت ابراہیمؑ کے اس ایثار کو اس قربانی کو اور مادیت کی نفی کو قبول کیا اور پوری امت مسلمہ پر قربانی فرض کر دی گئی۔

حضرت ابراہیمؑ جب حضرت حاجرہ اور حضرت اسمٰعیلؑ کو بے آب و گیاہ وادی مکہ میں چھوڑ کر جانے لگے تو حضرت حاجرہ نے پیچھے سے آواز دی، حضرت ابراہیمؑ رک گئے، حضرت حاجرہ نے اپنے ہم سفر، رفیق اپنے مقدس و منور شوہر سے کہا:

"میں صرف اتنا پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا یہ عمل اللہ کی طرف سے ہے؟"

حضرت ابراہیمؑ نے کہا "ہاں" حضرت حاجرہ پانی کی تلاش میں صفا سے مروہ کی طرف اور مروہ سے صفا کی طرف دوڑتی رہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ ہمارے ساتھ اللہ کا ہونا کافی ہے، اللہ کو اتنا پسند آیا کہ زمین سے آب زمزم کا چشمہ ابل پڑا اور اللہ تعالیٰ نے اپنی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے حضرت حاجرہ کے اس عمل کو حج اور عمرہ قرار دے دیا اور فرمایا:

"ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ"

قربانی، حج، صفا مروہ پر سعی طواف کعبہ سب دراصل غیر رب کی نفی اور ایثار کی تمثیلات ہیں۔ عید الاضحیٰ کی تقریب ایک ارب مسلمانوں کو یہ پیغام دیتی ہے کہ اپنے جد امجد حضرت ابراہیمؑ اور اپنی دادی محترمہ حضرت حاجرہ کی طرز فکر کے مطابق متحد ہو کر مسلمان غیر رب کی نفی کے لئے ایثار کریں تو ان کے اوپر بھی اللہ کی رحمت اور خوشنودی عام ہو جائے گی۔

ارکان اسلام پر غور کرنے سے یہ بات ایک بچہ بھی جان لیتا ہے کہ اسلام مکمل طور پر اجتماعی پروگرام ہے، چھوٹے چھوٹے اجتماعی پروگرام (مساجد میں پانچ وقت باجماعت صلوٰۃ، جمعہ کی نماز، سحر و افطار) کی کامیابی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے عید الفطر، حج اور عید قرباں کا اجتماعی پروگرام عطا کیا ہے تا کہ ایک ارب مسلمان یہ بات اچھی طرح سمجھ لیں کہ اگر اجتماع امت ہے تو ترقی ہے، عروج ہے، حکمرانی ہے، اختراعات و ایجادات ہیں، علوم میں فروغ ہے۔

اس کے برعکس آج اجتماعیت امت میں نہیں ہے، دیوبندی، بریلوی، غیر مقلد، شیعہ، سنی، نجدی، وہابی اور نامعلوم کتنے فرقوں میں لوگ بٹے ہوئے ہیں۔ یہ عمل تفرقہ ہے، حکمرانی کے عمل سے فرار ہے، عروج کی جگہ ذلت و مسکینیت ہے، حاکمیت کی جگہ غلامی ہے، قوم کی تذلیل ہے اور علم سے محرومی ہے۔

"اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو۔"

درخت زندگی ہیں

یہ بات تو مجھے معلوم نہیں میرا نام کب اور کیوں رکھا گیا؟ البتہ یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ دنیا میں کوئی بھی چیز بغیر نام کے نہیں ہے اور نام کسی شئے کی شناخت کے لئے ضروری ہے، جس طرح دنیا میں لاکھوں کروڑوں چیزوں کے نام ہیں اور یہ نام ان چیزوں کی شناخت کراتے ہیں اسی طرح میرا نام بھی رکھا گیا، لاکھوں کروڑوں سال سے میں اسی نام سے جانا پہچانا جاتا ہوں، نام جس طرح انسان کی شناخت کے لئے مجبوری ہے اسی طرح پرندوں، چرندوں، درندوں، حشرات الارض اور درختوں کی شناخت کے لئے بھی مجبوری ہے۔

دیکھئے نا! ایک جگہ، بادام، انار، امرود، ناشپاتی، چیکو، چکوترہ، سنگترہ، کیلا، آم اور لیچی پڑے ہوئے ہوں اور الگ الگ نام نہ ہوں تو ہم بادام کو بادام نہیں کہہ سکتے ہیں۔ یہ حقیقت بھی سامنے ہے کہ جس طرح کبوتر کے انڈے سے کبوتر اور مرغی کے انڈے سے مرغی نکلتی ہے، بادام کے درخت پر بادام ہی لگتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ بادام کے درخت پر آم اور آم کے درخت پر کبھی امرود لگے ہوں، چوپائے اور دو پیروں پر چلنے والے افراد میں بھی نسلی سلسلہ تسلسل سے قائم ہے، دو پاؤں پر چلنے والے آدمی کے بچے دو ہی پیروں پر چلتے ہیں اور چار پیروں پر چلنے والے چوپائے کے بچے چار پیروں پر چلتے ہیں۔

دو پیروں پر چلنے والے آدمی کی جڑ اوپر ہوتی ہے جب کہ درختوں کی جڑیں نیچے زمین میں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں، درخت اور آدمی کا تجزیہ کیا جائے تو اس بات سے انکار کی مجال نہیں کہ آدمی ایک درخت کی طرح ہے، درخت ہی کی طرح نشوونما ہوتی ہے، درخت ہی کی طرح آدمی کی نسل چلتی ہے، میری کہانی کا آغاز یہ ہے کہ میں جنگل میں بے شمار درختوں کے ساتھ رہتا تھا، میں پیدا ہوا اور جوان ہونے کے بعد میری نسل کا سلسلہ شروع ہوا۔ آدمی کی نسل تو ایک ایک کرکے پھیلتی ہے مگر میری نسل کے بیج ایک وقت میں ہزاروں کی تعداد میں ہوتے ہیں، آدمی کے اندر ریڑھ کی ہڈی دراصل ایک تنا ہے جس پر آدمی کا سراپا قائم ہے اور درخت میں یہی ریڑھ کی ہڈی درخت کا تنا بن جاتی ہے۔ جوانی میں جب میں تناور ہوا تو سینکڑوں شاخوں پر لاکھوں پتے نکل آئے جیسے انسانوں کے چہرے اور جسم پر بال آجاتے ہیں۔ اس وقت پھر میری ان شاخوں پر پھل لگ گئے تو چڑیوں کے لئے راشن کا بندوبست ہو گیا، نہیں معلوم کہاں کہاں سے پرندے آتے اور میرے دسترخوان پر سے خوب سیر ہو کر کھاتے اور اڑ جاتے، ایک من موہنی چھوٹی سی چڑیا آئی اس نے خوب سیر ہو کر کھایا اور پھر پھر سے اڑ گئی، فضاء میں معلق اڑتی رہی اور ہزاروں میل دور جا کر اسے آدمی کی طرح

رفع حاجت کی ضرورت پیش آئی، فراغت کے بعد میرا ایک بیج زمین پر گرا تو زمین نے اسے اپنی گود میں سمیٹ لیا، زمین کی گود میں حرارت اور برودت سے میرے اندر ایک نئی زندگی دوڑ گئی اور بالکل اس طرح جس طرح آدمی ماں کے بطن سے پیدا ہوتا ہے۔ میں نے بھی زمین کی کوکھ سے جنم لیا لیکن فرق یہ تھا کہ آدمی کے بچے کو اس کی ماں گرمی، سردی، بھوک، پیاس سے محفوظ رکھتی ہے مگر میری ماں کے پاس سردی، گرمی سے بچاؤ کے لئے کپڑے نہیں تھے، بھوک پیاس رفع کرنے کیلئے زمین کے سینے میں دودھ نہیں تھا۔ مجھے بھوک پیاس کا تقاضا پورا کرنے اور سردی گرمی سے حفاظت کے لئے خود ہی انتظام کرنا تھا میں نے یہ بات جان لی تھی کہ درخت کی ماں صرف بیج پیدا کرنے تک ماں ہوتی ہے، پیدائش کے مراحل سے گزر کر درخت کو خود اپنے ایک پیر پر کھڑا ہونا پڑتا ہے، میں نے مردانہ وار نہیں اس لئے کہ مرد عضو ضعیف ہے، درختانہ وار بارش، آندھی، طوفان کا مقابلہ کیا اور ایک درخت بن گیا۔ جس کے نیچے ایک، دو، دس، بیس نہیں پچاس آدمی دھوپ کی تمازت سے بچنے کے لئے میرے سائے میں ٹھہرتے تھے، بیٹھتے تھے اور آرام کرتے تھے۔ میں خوش تھا کہ میں اس حیثیت سے آدمیوں میں افضل ہوں کہ کوئی درخت کبھی کسی آدمی کے سائے میں نہیں رہتا۔ میں نے ابھی جوانی کی پوری بہاریں بھی نہیں دیکھی تھیں کہ ایک دن ایک مکروہ شکل آدمی آیا اور بغیر کسی قصور کے پے در پے میرے اوپر کلہاڑی کے وار کئے، میں بہت چیخا، بہت شور مچایا۔

اے میرے دوست آدمی! میں نے آندھیوں اور طوفانوں کا مقابلہ کر کے خود کو اس قابل بنایا ہے کہ تو اور تیری اولاد میرے سائے میں رہے اور تو میرے خون سے بنے پھل کھائے اور ان کے رس سے اپنے خون میں اضافہ کرے لیکن اس ظالم آدمی نے میری کسی التجا پر کان نہیں دھرے اور میری کوئی بات نہیں سنی، میرے اندر کلہاڑی سے پڑنے والے گھاؤ میں سے رسنے والے خون سے وہ اتنا بھی متاثر نہیں ہوا کہ اس کی آنکھوں سے ایک آنسو ہی ڈھلک پڑتا، وہ دیوانہ وار میرے وجود کو تیز دھار کلہاڑے سے زخمی کرتا رہا یہاں تک کہ میں روتا بلکتا زمین پر گر گیا۔ آدم زاد نے اس پر بھی بس نہیں کی، میری بڑی بڑی شاخوں کو جو میرے جسم میں ہڈیوں کی قائم مقام تھیں، اس بے رحم آدمی نے الگ الگ کر کے چولہے میں جھونک دیا اور مجھے خاکستر کر دیا۔

میری اولاد ابھی زندہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ انسان سے انتقام نہیں لے گی اس لئے کہ انتقام جیسی بدہیئت عادت تو آدمی کو ہی زیب دیتی ہے۔

میں ایک درخت ہوں میرا اصل مسکن جنگل ہے جہاں درندے بھی رہتے ہیں۔ میں نے نہیں دیکھا کہ کسی درندے نے کسی پرندے کو پھاڑ کھایا ہو، کسی درندے نے کسی درندے کو قتل کر دیا ہو۔ یہ بدنمائی آدم زاد ہی کے حصے میں آئی ہے کہ وہ اپنے بھائی آدم کو قتل کر دیتا ہے۔

جب آدم خود اپنا قاتل بن گیا ہے تو اس سے شکوہ شکایت کوئی کیا کرے۔۔۔۔۔۔اور کیوں کرے؟

میرا کام خدمت ہے، محبت ہے، میرے بچے درخت اسی وصف کو قائم رکھیں گے۔

اے اشرف المخلوقات آدمی! یادرکھ! محبت زندگی ہے، انتقام عقوبت ہے۔ ظلم ہلاکت ہے، حلم عافیت ہے۔

قتل پاپ اور بزدلی ہے۔ معاف کر دینا بہادری ہے۔

فقط آدمیوں کا جانثار دوست ایک درخت

صلوٰۃ کا مفہوم

صلوٰۃ اس عبادت کا نام ہے جس میں اللہ کی بڑائی، تعظیم اور اس کی ربوبیت و حاکمیت کو تسلیم کیا جاتا ہے، صلوٰۃ ہر پیغمبر اور اس کی امت پر فرض کی گئی ہے۔ صلوٰۃ قائم کر کے بندہ اللہ سے قریب ہو جاتا ہے۔ صلوٰۃ فواحشات اور منکرات سے روکتی ہے۔ صلوٰۃ دراصل اللہ کے لئے ذہنی مرکزیت کے حصول کا یقینی ذریعہ ہے۔ صلوٰۃ میں ذہنی یکسوئی (Concentration) حاصل ہو جاتی ہے۔

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو مکہ کی بے آب و گیاہ زمین پر آباد کیا تو اس کی غرض یہ بیان کی۔

''اے ہمارے پروردگار! تاکہ وہ صلوٰۃ (آپ کے ساتھ تعلق اور رابطہ) قائم کریں۔''

حضرت ابراہیمؑ نے اپنی نسل کے لئے یہ دعا کی:

''اے میرے پروردگار! مجھ کو اور میری نسل میں سے لوگوں کو صلوٰۃ (رابطہ) قائم کرنے والا بنا۔''

''حضرت اسماعیلؑ اپنے اہل و عیال کو صلوٰۃ قائم کرنے کا حکم دیتے تھے۔''

(سورۃ مریم آیت۔ ۵۵)

حضرت لوطؑ، حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ اور ان کی نسل کے پیغمبروں کے بارے میں قرآن کہتا ہے:

''اور ہم نے ان کو نیک کاموں کے کرنے اور صلوٰۃ قائم کرنے کی وحی کی۔''

(سورۃ انبیاء۔ ۷۳)

حضرت لقمانؑ نے اپنے بیٹے کو نصیحت کی:

''اے میرے بیٹے صلوٰۃ قائم کر۔''

(سورۃ لقمان۔ ۱۷)

اللہ نے حضرت موسیٰؑ سے کہا:

"اور میری یاد کیلئے صلوٰۃ قائم کر (یعنی میری طرف ذہنی یکسوئی کے ساتھ متوجہ رہ)۔"

(سورۃ طٰہٰ۔۱۴)

حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارونؑ کو اوران کے ساتھ بنی اسرائیل کو اللہ نے حکم دیا:

"اور اللہ نے صلوٰۃ کا حکم دیا ہے۔"

(سورہ مریم۔۳۱)

آخری آسمانی کتاب قرآن میں بتایا گیا ہے کہ عرب میں یہود اور عیسائی قائم صلوٰۃ تھے۔

ترجمہ: "اہل کتاب میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راتوں کو کھڑے ہو کر اللہ کی آیتیں پڑھتے ہیں اور وہ سجدہ (الہ کے ساتھ سپردگی) کرتے ہیں۔"

(آل عمران۔۱۱۳)

"اور وہ لوگ جو حکم پکڑتے ہیں کتاب (اللہ کے بنائے پروگرام اور آسمانی قانون) کو اور قائم رکھتے ہیں صلوٰۃ، ہم ضائع نہیں کرتے اجر نیکی کرنے والوں کے۔"

(اوراف۔۱۲۰)

بندہ جب اللہ سے اپنا تعلق قائم کر لیتا ہے تو اس کے دماغ میں وہ دروازہ کھل جاتا ہے جس سے وہ غیب کی دنیا میں داخل ہو کر وہاں کے حالات سے واقف ہو جاتا ہے۔

صلوٰۃ کے معنی، مفہوم اور نماز کے اعمال پر تفکر کرنے سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ صلوٰۃ دراصل ذہنی صلاحیت (Concentration) کو بحال کر دیتی ہے۔ انسان ذہنی یکسوئی کے ساتھ شعوری کیفیات سے نکل کر لاشعوری کیفیات میں داخل ہو جاتا ہے۔ مراقبہ کا مفہوم بھی یہی ہے کہ بندہ ہر طرف سے ذہن ہٹا کر، شعوری دنیا سے نکل کر لاشعوری دنیا غیب کی دنیا سے آشنا ہو جائے۔

صلوٰۃ (نماز) میں یکسوئی حاصل کرنے اور اللہ سے تعلق قائم کرنے اور اللہ کے سامنے سجدۂ حضوری کرنے کے لئے یہ مراقبہ کرایا جاتا ہے۔

صلوٰۃ قائم کرنے سے پہلے آرام دہ نشست میں قبلہ رخ بیٹھ کر تین مرتبہ درود شریف، تین بار کلمہ شہادت پڑھ کر آنکھیں بند کر لیں۔

ایک منٹ سے تین منٹ تک یہ تصور قائم کریں۔

"عرش پر اللہ تعالیٰ موجود ہیں، تجلیات کا نزول ہو رہا ہے اور میں عرش کے نیچے ہوں۔"

اس کے بعد کھڑے ہو کر صلوٰۃ قائم کریں۔

مراقبہ کی طرح آدمی جب گردوپیش سے بے خبر ہو کر نماز میں یکسوئی حاصل کر لیتا ہے تو یہی قیام صلوٰۃ کا مراقبہ ہے۔

قرآن پاک اللہ کا کلام ہے اور ان حقائق و معارف کا بیان ہے جو اللہ تعالیٰ نے بوسیلہ حضرت جبرائیلؑ، آنحضرت ﷺ کے قلب اطہر پر نازل فرمائے۔ قرآن مجید کا ہر لفظ انوار و تجلیات کا ذخیرہ ہے۔ بظاہر مضامین غیب عربی الفاظ میں سامنے ہیں لیکن ان الفاظ کے پیچھے نوری تمثیلات اور معانی کی وسیع دنیا موجود ہے۔ تصوف اور روحانیت میں یہ کوشش کی جاتی ہے کہ روح کی آنکھ سے الفاظ کے نوری تمثلات کا مشاہدہ حاصل کیا جائے تاکہ قرآن پاک اپنی پوری جامعیت اور معنویت کے ساتھ روشن ہو جائے۔ قرآن مجید میں بھی اس حقیقت کی طرف اشارہ موجود ہے اور اسے حاصل کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔

جب بھی قرآن مجید کی تلاوت کی جائے، چاہے نماز میں، تہجد کے نوافل میں یا صرف تلاوت کے وقت، آدمی یہ تصور کرے کہ اللہ اس کلام کے ذریعے سے مجھ سے مخاطب ہیں اور میں اسی کی معرفت اس کلام کو سن رہا ہوں۔ اس تلاوت کے وقت وہ یہ خیال قائم رکھے کہ رحمت الٰہی الفاظ کے نوری تمثیلات اس پر منکشف کر رہی ہے۔

جب آدمی اس ذہنی توجہ (مراقبہ) کے ساتھ تلاوت کلام اللہ کرتا ہے تو اس نسبت میں انہماک ہوتا ہے جس نسبت سے قرآن مجید کا نزول ہوا ہے۔ نسبت کے بار بار دور کرنے سے آدمی کا قلب ملاءِ اعلیٰ سے ایک ربط پیدا کر لیتا ہے۔ چنانچہ جب وہ قرآن مجید پڑھتا ہے تو جس قدر اس کے قلب کا آئینہ صاف ہوتا ہے اسی مناسبت سے معانی و مفاہیم کی نورانی دنیا اس کے اوپر ظاہر ہونے لگتی ہے۔

پانی کی فطرت

بتایا جاتا ہے کہ زمین تین حصے پانی ہے اور ایک حصہ خشکی ہے، زمین طبقات یا پرت در پرت بنی ہوئی ہے۔ جس طرح پیاز میں بے شمار پرت در پرت ہیں اسی طرح زمین بھی طبقات یا پرت در پرت تخلیق کی گئی ہے۔ زمین کو ادھیڑا جائے تو نظر آتا ہے کہ زمین کا ہر پرت ایک نئی تخلیق ہے۔ کسی پرت کا نام ہم لوہا رکھتے ہیں۔ کسی پرت کا نام ہم کوئلہ رکھتے ہیں، کسی پرت کا نام ہم تانبہ یا پیتل رکھتے ہیں، کسی پرت کو ہم یورینیم کے نام سے جانتے ہیں۔

جیالوجسٹ یہ بات جانتا ہے کہ زمین کے ذرات دراصل نئی نئی تخلیقات کے فارمولے ہیں۔ یہی صورتحال مٹی کی بھی ہے۔ زمین پر مٹی کہیں سرخ ہے، کہیں سیاہ ہے، کہیں بھربھری ہے، کہیں چکنی ہے، کہیں پہاڑ کی طرح سخت ہے اور کہیں دلدل ہے۔ زمین کی ایک خاصیت جو ہر جگہ خود اپنا مظاہرہ کرتی ہے یہ ہے کہ زمین ماں کی طرح اپنے بطن میں کسی بیج کو نشوونما دیتی ہے جس طرح ایک ماں پہلے دن سے بچے کو اپنے بطن میں ایک نظام کے تحت ایک تخلیقی پروسیس کے مطابق نشوونما دے کر پیدا کرتی ہے اسی طرح زمین بھی بے شمار بیجوں کو الگ الگ تخلیق کر رہی ہے۔ ہم جب زمین کے اوپر موجود تخلیقات کے اوپر غور و غوض کریں تو یہ بات یقین کا درجہ حاصل کر لیتی ہے کہ زمین دراصل کسی تخلیق کو مظہر بنانے کیلئے بنیادی مسالہ فراہم کرتی ہے۔ جس طرح کسی کھلونے کی ڈائی میں پلاسٹک ڈال کر کھلونا بنالیا جاتا ہے۔ زمین کو اللہ تعالیٰ نے یہ وصف بخشا ہے کہ وہ ہر ڈائی کے مطابق خود کو ڈائی کے اندر ڈھال لیتی ہے۔ جب ہم بیج کے اوپر غور کرتے ہیں تو ہمارے شعور پر یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ ہر بیج ایک ڈائی ہے۔

زمین کا وصف یہ ہے کہ وہ جب کسی ڈائی کو استعمال کرتی ہے تو اس ڈائی کو جتنا چاہے پھیلا لیتی ہے، جتنا چاہے سکیڑ لیتی ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے بیج کو جو رائی کے دانے سے بھی چھوٹا ہوتا ہے۔ اس طرح وسعت دے دیتی ہے کہ وہ بہت بڑا درخت بن جاتا ہے۔ زمین کا ایک وصف یہ بھی ہے کہ تین حصے پانی کی ترسیل اس طرح کر دیتی ہے کہ وہ پانی ڈائی کے مطابق خود کو ڈائی میں تحلیل کر دیتا ہے۔

پانی کا وصف ہے بہنا لیکن اگر پانی کا بہاؤ ختم ہو جائے تو پانی سڑ جاتا ہے۔ اس میں بدبو اور تعفن پیدا ہو جاتا ہے۔ ہر انسان کے اندر تین حصے پانی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کی فطرت وہ ہے جو پانی کی فطرت ہے۔ جب تک انسان اپنی فطرت یعنی مسلسل حرکت

میں وقت گزارتا ہے وہ فطرت سے قریب رہتا ہے اور جب کوئی فرد اپنی فطرت یعنی حرکت سے انحراف کرتا ہے تو اس کے اوپر جمود طاری ہو جاتا ہے اور جمود تعفن کے علاوہ کچھ نہیں۔ زمین اور زمین کے اندر اور اوپر جتنے بھی طبقات ہیں یا اشجار ہیں، نباتات ہیں، معدنیات ہیں، اگر ان کی فطرت کو سمجھا جائے تو حرکت کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

اس وقت زمین پر چھ ارب کی آبادی ہے۔ یہ اس آبادی کا ذکر ہے جو زمین کا تیسرا حصہ ہے۔ زمین پر آباد بستیوں اور شہروں کو دیکھا جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ آبادیاں اور شہر دراصل Vallies ہیں۔ کہیں یہ گھاٹیاں اور Vallies چھوٹی ہیں اور کہیں یہ بڑی ہیں، شمال میں پہاڑیاں ہیں۔ جنوب میں گھاٹیاں یا کھلے میدان ہیں۔ ان گھاٹیوں اور کھلے میدانوں کو پہاڑوں سے دبا دیا گیا ہے۔ اور اطراف میں سمندر ہیں۔ سمندر کے اندر جزیرے ہیں اور یہ چھوٹے بڑے جزیرے ہی شہروں میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اندر کی آنکھ دیکھتی ہے کہ جو آبادی معلوم دنیا کہلاتی ہے۔ آبادیاں اس کے علاوہ بھی ہیں۔

سائنس نے بہت ترقی کی اور موجودہ دور پانچ سے دس فی صد تک انسانی صلاحیتوں کا مظاہرہ ہے۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ انسان اپنی صلاحیتوں کا صرف دس فیصد استعمال کرتا ہے تو ہمارے لئے یہ لمحہ فکریہ ہے کہ نوے فی صد صلاحیتیں کیا ہیں؟ کھربوں سال میں انسان اس قابل ہوا ہے کہ وہ دس فیصد صلاحیتوں کا استعمال کر سکا ہے۔ نوے فیصد صلاحیتیں اگر استعمال کی جائیں تو اس کے لئے کتنا وقت درکار ہوگا؟

"اور وہی ہے ذات جو اتارتی ہے پانی کو آسمانوں سے اور نکالتی ہے اس میں سے ثمرات (Food) اور یہ ثمرات تمہارے لئے رزق ہیں۔"

یعنی انسان کی زندگی کا دار و مدار وہ انرجی ہو، توانائی ہو، فوڈ ہو، پانی کے اوپر ہے اور پانی کا وصف ہے مسلسل اور متواتر حرکت کرنا۔

معاشرے میں وہی فرد ممتاز ہوتا ہے جو پانی کی فطرت کے مطابق اپنی زندگی گزارتا ہے اور جو پانی کی فطرت (تین حصے زندگی) سے انحراف کرتا ہے اس پر جمود طاری ہو جاتا ہے جہاں جمود طاری ہو جاتا ہے وہاں تعفن پیدا ہو جاتا ہے اور یہ تعفن ہی اضطراب، پریشانی، بے چینی اور بیماری ہے۔

حرکت کے دو رخ ہیں۔ ایک رخ تخریب ہے اور دوسرا رخ تعمیر ہے۔ تخریب رخ شیطنت ہے اور تعمیر رخ رحمت ہے۔ موجودہ ترقی کا دور تعمیر سے زیادہ تخریب ہے۔ اس لئے کہ یہاں ہر ترقی کے پیچھے کسی نہ کسی لالچ اور زر پرستی ہے۔ اس دور کی ترقی کا ایک گھناؤنا رخ یہ بھی ہے کہ چالاک و عیار لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی تہی دست مخلوق کو اپنے لئے ذریعہ معاش بنا لیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔

مخلوقات

زمین پر تین مخلوق آباد ہیں۔ دو مکلف اور ایک غیر مکلف۔ مراقبہ میں دیکھا کہ تینوں مخلوق ایک کھلی جگہ پر ہیں جس کا نہ تو کوئی سرا ہے اور نہ ہی کوئی حد ہے۔ تینوں کے خدوخال ایک جیسے ہیں، تینوں نے لباس زیب تن کیا ہوا ہے۔ ناک نقشہ ایک جیسا ہے لیکن نقوش میں نمایاں فرق ہے۔

ایک مخلوق کی ایک آنکھ مخروطی ہے، ناک چپٹی اور کھڑی ہے، چہرا کتابی یا گول ہے۔

دوسری مخلوق کی آنکھیں بادام کی طرح ہیں۔ پتلی میں گہرے رنگ کے ڈورے ہیں، ستواں ناک کی نوک غائب ہے، چہرہ بیضوی اور سر کشکول کی طرح ہے۔

تیسری مخلوق کی آنکھ سانپ کی چھتری کی طرح گول ہے، ناک گلدستہ، چہرہ نصف النہار سورج کی طرح، سر میں پیشانی سانپ کے سر کے مشابہ ہے۔

ایک مخلوق قد میں بارہ سے سولہ فٹ دراز یا اس سے بھی زیادہ۔

دوسری مخلوق عنفوان شباب جوانوں کی طرح متوازن قد۔

تیسری مخلوق پانچ سے چھ فٹ کوتاہ یا دراز، جسم روشنیوں کا مرقع۔

ایک مخلوق کے جسم میں ڈبل برقی رو دوڑتی ہے۔

دوسری مخلوق کے جسم میں اکہری برقی رو دوڑتی ہے۔

تیسری مخلوق میں ایسی روشنی ہے جسے روشنی نہیں کہا جا سکتا۔

ایک مخلوق کے حواس محدود۔

دوسری مخلوق کے حواس محدودیت میں لامحدود۔

تیسری مخلوق کے حواس لامحدود۔

ایک مخلوق کے دماغ میں دس ارب خلئے چارج ہیں۔

دوسری مخلوق کے دماغ میں نوے ارب خلئے کام کرتے ہیں۔

تیسری مخلوق کے دماغ میں دس کھرب خلئے متحرک ہیں۔

ایک مخلوق ایک گھنٹے میں تین میل کی مسافت طے کرتی ہے۔

دوسری مخلوق ایک گھنٹے میں ستائیس میل چلتی ہے۔

تیسری مخلوق کی پرواز ایک سواسی ہزار میل ہے۔

پہلی مخلوق مادیت کے خول میں بند ہے۔

دوسری مخلوق روشنی کے خول میں بند ہے۔

تیسری مخلوق روشنی کی رفتار (ایک لاکھ چھیاسی ہزار دوسو بیاسی میل فی سیکنڈ) میں قید ہے۔

ایک مخلوق کی بساط زمین، دوسری مخلوق کی بساط خلاء، تیسری مخلوق کی بساط زمین کے اوپر خلاء کی بساط ہے۔

ایک مخلوق کو کھانے اور پینے کی اشتہا کو پورا کرنے کے لئے اربعہ عناصر کی ضرورت ہے۔

دوسری مخلوق کی اشتہا پوری ہونے میں فاسفورس کا عمل دخل ہے۔

تیسری مخلوق میں اشتہا کا تقاضا بے رنگ روشنیوں سے پورا ہوتا ہے۔

خلاء ایک تانا بانا ہے اس تانے بانے میں مخلوق نقش ہے۔ کپڑے پر پھول، قالین پر شیر کی طرح۔

خلاء کا دوسرا رخ محض تانا ہے اس پر بھی نقوش ہیں۔

خلاء کا تیسرا رخ ایسی لہروں سے مرکب ہے جس میں تانا بانا نظر نہیں آتا۔

تینوں مخلوقات میں لمس کا احساس ہے، خوش ہونے اور ناخوش ہونے کے جذبات ہیں لیکن یہ احساس کہیں بھاری اور کہیں لطیف ہے، جہاں بھاری اور بہت بھاری ہے وہاں کشش ثقل ہے۔ جہاں ہلکا ہے، وہاں کشش ثقل تو ہے لیکن خلاء کا سفر کرنے میں مزاحم نہیں ہوتی، جہاں لطافت ہے وہاں کشش ثقل Gravity ختم ہو جاتی ہے۔

تینوں مخلوقات میں مشترک قدریں ہیں۔ ایک دوسرے کے کام آتی ہیں۔ ایک دوسرے سے تعاون کرتی ہیں اور ایک دوسرے سے عدم تعاون بھی ہوتا ہے۔

غرض یہ کہ تینوں مخلوقات کے افراد ایک جگہ جمع تھے۔ اسپیس میں بند ایک بندے نے خود کو ان تینوں کے سامنے پیش کیا، ایک فرد ٹھوس اور دوسرا ٹرانسپیرنٹ نظر آیا۔ تیسرا فرد اس بندے کی طرف متوجہ ہوا تو بغلوں کے نیچے جڑے ہوئے خوبصورت اور کئی رنگوں سے مزین پر کھل گئے۔ ان پروں سے رنگین روشنیاں سرچ لائٹ کی طرح نکلیں کہ فضا رنگین ہو گئی۔ قوس قزح کے رنگ ان رنگوں کے سامنے ہیچ اور دم بخود ہیں۔

اسپیس میں بند شعور کا ایک فرد تینوں افراد سے اس طرح مخاطب ہوا۔

یہ جو تخلیق کے اتنے سارے روپ ہیں، اتنے سارے رنگ اور اتنے سارے نقوش ہیں، کیوں ہیں؟ الگ الگ رفتار کے تعین میں کیا حکمت ہے؟ ان میں سے ایک نے پوچھا، دلہن کو کیوں سجایا جاتا ہے؟ اس بندے نے کہا کشش پیدا کرنے کے لئے، نامکمل روح کی تکمیل کے لئے، دنیا میں رنگینی اجاگر کرنے کے لئے۔

پوچھا۔ دلہن بوڑھی کیوں ہو جاتی ہے؟

اسپیس میں بند شعور مخلوق کے فرد نے کہا:

ماضی سے رشتہ استوار رہنے کے لئے۔ دلہن بوڑھی نہیں ہو گی تو ماضی کی طرح نئی دلہن نہیں بنے گی، ماضی کا رشتہ ہی اس ساری کائنات کی اصل ہے۔

تخلیق کے روپ بہروپ دراصل دوشیزاؤں اور دلہنوں کے روپ ہیں۔ کسی جگہ زمین پر پھول دلہن ہے، کہیں زمین پر خوبصورت درخت دلہن کا روپ ہیں۔ آسمانوں پر یہ دلہن ستاروں بھرا جھومر پیشانی پر رکھے ناظرین کو اپنی طرف متوجہ کر رہی ہے۔

کائناتی سسٹم میں مخلوق جب تک دلہن کے روپ میں رہتی ہے، خوش رہتی ہے۔ ہر فرد اپنے اندر پھول کھلتے دیکھتا ہے، فوارے سے ابلتے نظر آتے ہیں، آبشاریں اندر گرتی ہیں، آبشاروں کے مدھم اور سریلے گیت اسے لطیف حس سے مانوس کر دیتے ہیں۔

تینوں مخلوقات میں ہر مخلوق کے اندر لطیف حس موجود ہے، فرق درجہ بندی کا ہے۔

ایک مخلوق کے اوپر کثافت کا پردہ زیادہ ہے۔

دوسری مخلوق پر کثافت کا پردہ یا خول کم ہے۔

تیسری مخلوق پر کثافت کا پردہ نہیں ہے۔

دونوں مخلوقات تیسری مخلوق کی طرح کثافت کے پردے اور تاریکی کے خول سے خود کو آزاد کر دیں تو وہ اپنے اندر گرتی آبشاروں کو دیکھ لیتی ہے۔ اور یہ آبشاریں خود کو نور کے بہتے دریا کے سپرد کر دیتی ہیں۔

نور کا بہتا دریا کیا ہے؟

وہ خول ہے جو ساری کائنات کی بساط ہے۔

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے اس نور کی مثال ایسی ہے جیسے او طاق میں چراغ، چراغ شیشے کی قندیل میں ہے۔ قندیل گویا کہ موتی کی طرح چمکتا ہوا ستارہ ہے۔ زیتون کے مبارک درخت سے روشن کیا جاتا ہے۔ نہ شرقی ہے نہ غربی ہے قریب ہے کہ روشن ہو جائے اگرچہ آگ نے اسے نہ چھوا ہو، نور اعلیٰ نور ہے۔ اللہ جسے چاہتا ہے اپنے نور کو دکھا دیتا ہے۔ اور اللہ لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔''

شک

آدمی زندگی کے تمام مراحل وقت کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں طے کرتا ہے مثلاً ایک سیکنڈ کا کوئی فریکشن، آدمی کی زندگی خواہ سو برس کی کیوں نہ ہو لیکن وہ ان ہی لمحوں میں تقسیم ہوتی رہتی ہے۔ غور طلب امر یہ ہے کہ آدمی اپنی زندگی بسر کرنے کے لئے ذہن میں وقت کے یہ ٹکڑے جوڑتا ہے اور ان ہی ٹکڑوں سے کام لیتا ہے انہی ٹکڑوں کے گرداب میں جن کو ہم سوچنا یا فکر کرنا کہتے ہیں، ہم یا تو ایک ٹکڑے سے آگے دوسرے ٹکڑے پر آجاتے ہیں یا وقت کے اس ٹکڑے سے پلٹتے ہیں، اس کو اس طرح سمجھنا چاہئے کہ آدمی جب یہ سوچتا ہے کہ میں کھانا کھاؤں گا لیکن اس کے پیٹ میں گرانی ہے اس لئے وہ ارادہ ترک کر دیتا ہے کب تک وہ اس ترک پر قائم رہے گا؟ اس کے بارے میں اسے کچھ نہیں معلوم۔ بیشمار افکار ہی اس کی زندگی کے اجزائے ترکیبی ہیں جو اسے ناکام یا کامیاب بناتے ہیں، ابھی وہ ایک ارادہ کرتا ہے پھر اسے ترک کر دیتا ہے، چاہے منٹوں میں کرتا ہے، چند گھنٹوں میں ترک کرتا ہے یا مہینوں اور سالوں میں ترک کرتا ہے۔

بتانا مقصود یہ ہے کہ ترک آدمی کی زندگی کا جزو اعظم ہے کیونکہ وہ بالطبع آرام طلب واقع ہوا ہے، بہ سی باتیں ہیں جن کو آدمی دشواری، مشکل، بیماری، بیزاری، بے عملی، بے چینی وغیرہ وغیرہ کہتا ہے، ان کیفیات کے بالمقابل ایک ایسی کیفیت ہے جس کا نام وہ سکون رکھتا ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ سب کیفیتیں حقیقی ہیں۔ درحقیقت ان میں سے زیادہ تر کیفیات مفروضات پر مبنی ہیں۔ انسان کے دماغ کی ساخت ہی ایسی ہے کہ وہ ہر آسانی کی طرف دوڑتا ہے اور محنت سے جی چراتا ہے، ظاہر ہے یہ وہ سمتیں ہیں اور ان سمتوں میں آدمی ہمیشہ افکار کے ذریعہ سفر کرتا ہے، اس کی حرکت کا منبع ان سمتوں میں سے ایک سمت ہے، ہوتا یہ ہے کہ ابھی ہم نے ایک تدبیر کی پھر اس کی تنظیم کی یہاں تک کہ وہ مکمل ہو گئی اس کی سمت بھی صحیح تھی لیکن صرف دس قدم چلنے کے بعد ہمارے ذہن میں تبدیلی ہو گئی، چنانچہ ہم جس منزل کی طرف رواں دواں تھے وہ غیب میں چلی گئی، ہمارے پاس باقی کیا رہا؟ ٹٹولنا اور ٹٹول کر قدم اٹھانا، واضح رہے کہ یہ تذکرہ یقین اور شک کی درمیانی راہوں کا تھا، ہمیں یہ نہیں بھولنا چاہئے کہ انسان کی بنیاد وہم اور یقین پر ہے، مذہب کی اصطلاح میں اس کو شک اور ایمان کہا گیا ہے، اللہ تعالیٰ دماغ میں شک کو جگہ دینے سے منع فرماتے ہیں اور ذہن میں یقین کو پختہ کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

''لاریب'' ہے یہ کتاب اور اس کو ہدایت دیتی ہے جس کا یقین غیب پر ہے، جس شک کو اللہ تعالیٰ نے ممنوع قرار دے دیا ہے، یہ وہی شک ہے جس سے آدم کو باز رہنے کا حکم دیا گیا تھا بالآخر شیطان نے بہکا کر یہ شک آدم کے دماغ میں ڈال دیا جس کے لئے آدم جنت سے نکالا گیا۔''

اسی مقام سے آدم کے دماغ میں دو سمتوں کا تعین ہوا یعنی شک اور یقین، بیان کردہ حقیقت کی روشنی میں انسان کے دماغ کا محور یقین اور شک پر ہے۔ یہی وہ شک اور یقین ہے جو دماغی خلیوں میں ہمہ وقت عمل کرتا رہتا ہے، جس قدر شک کی زیادتی ہو گی اسی قدر خلیوں کی ٹوٹ پھوٹ واقع ہو گی۔ یہ بتانا بہت ضروری ہے کہ یہی وہ دماغی خلئے ہیں جن کے زیر اثر تمام اعصاب کام کرتے ہیں اور اعصاب کی تحریکات ہی انسانی زندگی ہے۔

کسی چیز پر انسان کا یقین کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا فریب کو جھٹلانا، مثال اس کی یہ ہے کہ انسان جو کچھ ہے وہ خود کو اس کے خلاف پیش کرتا ہے وہ ہمیشہ اپنی خامیاں چھپاتا ہے اور اس کی جگہ مفروضہ خوبیاں بیان کرتا ہے جو اس کے اندر موجود نہیں ہیں۔

مشکل سب سے بڑی یہ ہے کہ وہ جس معاشرے میں تربیت پا کر جوان ہوا ہے وہ معاشرہ اس کا عقیدہ بن جاتا ہے اس کا ذہن اس قابل نہیں رہتا کہ وہ اس عقیدہ کا تجزیہ کر سکے، وہ عقیدہ یقین کا درجہ حاصل کر لیتا ہے حالانکہ وہ محض فریب ہے، سب سے بڑی وجہ اس کی یہی ہے کہ:

آدمی خود کو جو ظاہر کرتا ہے ایسا نہیں ہے بلکہ اس کے برعکس ہے۔

اس قسم کی زندگی گزارنے میں اسے بہت مشکلات پیش آتی ہیں ایسی مشکلات جن کا حل آدمی کے پاس نہیں ہے، اس زندگی میں اسے قدم قدم پر خطرہ محسوس ہوتا ہے کہ اس کا عمل تلف نہو جائے گا اور بے نتیجہ ثابت ہو گا، بعض اوقات آدمی یہ سمجھتا ہے کہ اس کی پوری زندگی تلف ہو رہی ہے، اگر تلف نہیں بھی ہو رہی تو سخت خطرہ میں ہے، یہ سب ان دماغی خلیوں کی وجہ سے ہوتا ہے جن میں شک کی بنا پر تیزی سے ٹوٹ پھوٹ واقع ہو رہی ہے۔ دماغی خلیوں کی تیزی سے ٹوٹ پھوٹ اور ردوبدل قدم قدم پر اس کے عملی راستوں میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے، عمل بے نتیجہ ثابت ہوتا ہے اور اعصاب کو نقصان پہنچتا ہے۔

آدمی کا دماغ دراصل اس کے اختیار میں ہے، وہ خلیوں کی ٹوٹ پھوٹ کو یقین کی طاقت سے کم اور زیادہ کر سکتا ہے، دماغی خلیوں کی ٹوٹ پھوٹ کی کمی سے اعصابی نقصان کے امکانات بہت ہی کم ہو جاتے ہیں۔

تاریخ میں ایسا کوئی دور نہیں آیا کہ جب آدمی چند فی ہزار سے زیادہ صحت مند رہا ہو، دراصل ہونا یہ چاہئے تھا کہ وہ زیادہ سے زیادہ روشنی کی قسمیں اور روشنیوں کا طرز عمل معلوم کرتا لیکن اس نے کبھی اس کی طرف توجہ نہیں دی، یہ چیز ہمیشہ پردے میں رہی،

آدمی نے اس پردے میں جھانکنے کی کوشش اس لئے نہیں کی کہ یا تو اس کے سامنے روشنیوں کا پردہ ہی نہیں تھا یا اس نے روشنی کے پردے کی طرف توجہ ہی نہیں دی، اس نے وہ قاعدے معلوم کرنے کی طرف خیال ہی نہیں کیا جو روشنیوں کے خلط ملط سے تعلق رکھتے تھے۔ اگر آدمی یہ طرز عمل اختیار کرتا تو اس کے دماغ میں خلیوں کی ٹوٹ پھوٹ کم سے کم ہو سکتی تھی، اس حالت میں زیادہ سے زیادہ یقین کی طرف قدم اٹھاتا، فضول عقائد اور توہم میں مبتلا نہ ہوتا، شکوک اسے اتنا پریشان نہ کرتے جتنا اب کئے ہوئے ہیں اور اس کی تحریکات میں جو عملی رکاوٹیں واقع ہوتی ہیں وہ کم سے کم ہوتیں لیکن ایسا نہیں ہوا، اس نے روشنیوں کی قسمیں معلوم نہیں کیں اور نہ ہی روشنیوں کی طبیعت کا حال معلوم کرنے کی کوشش کی وہ یہ بھی نہیں جانتا کہ روشنیاں بھی طبیعت اور ماہیت رکھتی ہیں اور روشنیوں میں رجحانات بھی موجود ہوتے ہیں اسے یہ بھی علم نہیں کہ روشنیاں ہی اس کی زندگی ہیں اور اس کی حفاظت کرتی ہیں۔ وہ تو صرف مٹی کے پتلے سے واقف ہے اس پتلے سے جس کے اندر اپنی کوئی حیثیت نہیں ہے جس کے لئے اللہ نے فرمایا کہ وہ سڑی ہوئی مٹی سے بنایا گیا ہے اور دوسری جگہ بھی ارشاد ہے کہ وہ مٹی بجنی ہے یعنی خلاء ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا:

''انسان ناقابل تذکرہ شئے تھا ہم نے اس کے اندر اپنی روح ڈال دی پس یہ بولتا، سنتا، سمجھتا اور محسوس کرتا انسان بن گیا۔''

روح کی تعریف یہ ہے کہ وہ امر رب ہے امر کی بہت مختصر تشریح ہے:

''اس کا امر یہ ہے کہ جب وہ ارادہ کرتا ہے کسی بات کا تو کہتا ہے ''ہوجا'' اور وہ ہو جاتی ہے۔''

یعنی انسان روح ہے، روح امر رب ہے۔

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے ناواقفیت وہم اور شک کو بڑھاتی ہے نتیجہ میں ایمان اور یقین ٹوٹ جاتے ہیں۔ قرآن پاک نے قوم کو ایک فرد کی حیثیت دی ہے چنانچہ اس کے ساتھ بھی یہی عمل ہوتا ہے جو فرد کے ساتھ ہوتا ہے۔ قوم میں اگر یقین کی نسبت شک زیادہ ہو جائے تو یہ عمل دو رخ اختیار کر لیتا ہے، جب اس کا رخ عروج کی طرف ہوتا ہے تو آفات سماوی کے آنے کا احتمال ہوتا ہے اور جب نزول کی طرف ہوتا ہے تو آفات ارضی آتی ہے۔

جب آفات آسمان سے نازل ہوتی ہیں تو بکھر کر پوری قوم کے ذہن اور اعصاب کو متاثر کرتی ہیں، ان سے بچنے کی سوائے اس کے کوئی ترکیب نہیں کہ قوم کے یقین کی راہ ایک ہو، الگ الگ نہ ہو یہی انبیاء کا سبق ہے، جب قوم گروہوں میں منتشر ہو جاتی ہے اور گروہوں کا یقین مختلف ہوتا ہے تو شک زمین کی سطح پر پھیل جاتا ہے اس انتشار سے آفات ارضی حرکت میں آ جاتی ہیں اور پھیل جاتی

ہیں چنانچہ سیلاب، زلزلے، وبائیں وغیرہ ظہور میں آتی ہیں، کبھی کبھی خانہ جنگی بھی ہوتی ہے جس سے قوم اور افراد کا اعصابی نظام تباہ ہو جاتا ہے جو طرح طرح کی بیماریاں پھیلنے کا موجب ہوتا ہے۔

خود آگاہی

جب ہم اپنی زمین، چاند، سورج، کہکشانی نظام اور کائنات کی ساخت پر غور کرتے ہیں تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ سارا نظام ایک قاعدے، ضابطے اور قانون کے تحت کام کر رہا ہے اور یہ قانون اور ضابطہ ایسا مضبوط اور مستحکم ہے کہ کائنات میں موجود کوئی شئے اس ضابطے اور قاعدے سے ایک انچ کے ہزارویں حصے میں بھی اپنا رشتہ منقطع نہیں کر سکتی۔ زمین اپنی مخصوص رفتار سے محوری اور طولانی گردش کر رہی ہے۔ اس کو اپنے مدار پر حرکت کرنے کے لئے بھی ایک مخصوص گردش اور رفتار کی ضرورت ہے اور اس میں ذرہ برابر فرق نہیں ہوتا، پانی کا بہنا، بخارات بن کر اڑنا، شدید ٹکراؤ سے اس کے مالیکیول کا ٹوٹنا، بجلی کا پیدا ہونا اور ماحول کو منور کرنا یہ سب ایک مقررہ قاعدے اور ضابطے کے تحت ہے، اسی طرح حیوانات، نباتات کی پیدائش اور افزائش بھی لگے بندھے قانون کی پیروی کر رہی ہے، انسانی دنیا میں بھی پیدائش اور نشوونما کا نظام ایک ہی چلا آرہا ہے، وہ پیدا ہو کر بڑھتا ہے، لڑکپن اور جوانی کے زمانوں سے گزر کر بڑھاپے کی حدود میں داخل ہو جاتا ہے، غور طلب بات یہ ہے کہ کوئی نہیں چاہتا کہ میں بوڑھا ہو جاؤں لیکن ہر شخص بوڑھا ہونے پر مجبور ہے، کوئی شخص پسند نہیں کرتا کہ اس کے اوپر موت وارد ہو لیکن دنیا میں ایک بھی ایسی مثال موجود نہیں ہے کہ آدمی نے موت سے نجات حاصل کر لی ہو، ان باتوں پر گہرے غور و خوض کے بعد یہی نتیجہ سامنے آتا ہے کہ اس قدر منظم اور مربوط نظام چلانے والی کوئی ہستی ضرور موجود ہے۔

کوئی اس ہستی کو بھگوان کہتا ہے، کوئی اس لازوال ہستی کا نام گاڈ رکھتا ہے، کسی صحیفہ میں اسے نروان کے نام سے پکارا گیا ہے، آسمانی کتابوں میں اس کا نام اللہ ہے، نام کچھ بھی رکھا جائے، بہر حال ہم یہ ماننے اور یقین کرنے پر مجبور ہیں کہ ایک طاقت اور لامتناہی ہستی ہمیں سنبھالے ہوئے ہے اور ساری کائنات پر اس کی حکمرانی ہے، وہ لوگ جو اس عظیم ہستی کا اقرار نہیں کرتے وہ زندگی کی شکست و ریخت کا ذمہ دار قدرت کو قرار دیتے ہیں۔ درحقیقت ان کے انکار میں بھی اقرار کا پہلو نمایاں ہے اس لئے کہ جب تک کوئی چیز موجود نہیں ہوتی اس کا انکار اور اقرار زیر بحث نہیں آتا، کوئی بندہ جب اپنی دانست میں اس ہستی کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کی سمجھ میں کچھ نہیں تو اس کا ذہن انکار کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔

ہر شئے کسی نہ کسی پروگرام کے ساتھ تخلیق ہوئی ہے۔ بلا مقصد یا کھیل کے طور پر کوئی چیز وجود میں نہیں آئی۔ عام طور پر انسان کی دلچسپیاں گوشت پوست کے جسم پر مرکوز رہتی ہیں۔ جبکہ گوشت پوست کا جسم اصل نہیں ہے۔ اصل انسان وہ ہے جو اس جسم کو متحرک رکھتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے۔

ہم اپنے مادی جسم کی حفاظت کے لئے لباس بناتے ہیں۔ لباس خواہ کسی کا ہو جب تک گوشت پوست کے جسم پر موجود رہتا ہے اس میں حرکت ہے۔ لباس کی حرکت جسم کے تابع ہے۔ لباس میں اپنی ذاتی کوئی حرکت واقع نہیں ہوتی۔ اسی طرح جب کوئی آدمی مر جاتا ہے تو لباس کی طرح اس کے اندر بھی کوئی ذاتی حرکت یا قوت مدافعت موجود نہیں رہتی۔ ہم گوشت پوست کے جس جسم کو انسان کہتے ہیں۔ وہ انسان نہیں ہے۔ بلکہ اصل انسان کا لباس ہے۔

نظریہ رنگ و نور اور عقل و شعور ہمیں اس بات کی دعوت دیتے ہیں کہ ہم تلاش کریں کہ انسان کی اصل کیا ہے۔ وہ کہاں سے آکر اپنے لئے جسمانی لباس تیار کرتا ہے اور پھر اس لباس کو اتار کر کہاں چلا جاتا ہے۔ قدرت نے انسان کو اصل انسان سے متعارف کرانے کے لئے بہت اہم اور مختصر فارمولے بنائے ہیں تاکہ نوع انسانی خود آگاہی حاصل کر کے اپنی اصل سے واقف ہو جائے۔

ہر مخلوق باشعور اور باحواس ہے اور اپنی خداداد صلاحیتوں سے قائم، زندہ اور متحرک ہے۔ نباتات، جمادات آپس میں گفتگو کرتے ہیں۔ نباتات، جمادات اور زمین پر موجود دوسری مخلوق کی آپس میں گفتگو ہمیں اس طرف متوجہ کرتی ہے کہ زمین اور زمین کے اندر تمام ذرات شعور رکھتے ہیں۔ زمین ایک ماں کی طرح تخلیقی قوتوں کی حامل ہے۔ جس طرح ایک ماں اپنے بچے کو جنم دیتی ہے اس طرح زمین تخلیقی عوامل سے گزر کر ایسے ایسے رنگ بکھیرتی ہے جو عقل و دانائی کے لئے لمحہ فکریہ ہے، دھوپ ایک ہے، ہوا ایک ہے، چاندنی ایک ہے اور فضا میں بکھری ہوئی گیسیں ایک ہیں مگر جب پانی زمین کی کوکھ میں جذب ہو جاتا ہے تو اتنی تخلیقات ظہور پذیر ہوتی ہیں جن کا شمار انسان کے بس سے باہر ہے۔ زمین کے پیٹ میں کروڑوں سانچے ہیں، جس سانچے میں پانی ٹھہر جاتا ہے پانی ڈائی کے مطابق نیا رخ اختیار کر لیتا ہے یہی پانی کبھی کیلا بن جاتا ہے، کبھی سیب بن جاتا ہے، کبھی انگور بن جاتا ہے اور کبھی پھولوں کے نقش و نگار بن کر سامنے آتا ہے، برگد کا ایک بیج جو خشخاش کے دانے سے بھی چھوٹا ہوتا ہے جب زمین کے پیٹ میں ڈال دیا جاتا ہے تو زمین اس بیج کی پرورش کر کے تناور درخت بنا دیتی ہے، ایسا تناور درخت جس کے سائے میں سینکڑوں آدمی قیام کرتے ہیں، زمین پر موجود پھیلی ہوئی مادی کائنات نے انسان کو اس بات کا شعور بخشا ہے کہ انسان اپنی عقل و شعور کو استعمال کرے اور یہ سوچے کہ انسان، حیوانات، نباتات اور جمادات سے کس طرح ممتاز ہے۔

سائنسی دنیا نے جو علمی اور انقلابی ایجادات کی ہیں ان ایجادات میں فزکس اور فزیالوجی ہیں اور پیراسائیکالوجی (روحانیت) کا علم ہے، روحانیت دراصل تفکر، فہم اور ارتکاز کے فارمولوں کی دستاویز ہے۔ اس دستاویز کا مطالعہ کرنے کا بہترین ذریعہ مراقبہ ہے۔

روشن چراغ

یہ دنیا ایک طرف بقا ہے تو دوسری طرف فنا ہے، ایک طرف فنا ہے تو دوسری طرف بقا ہے، فنا و بقا کا یہ کھیل ریت کے گھروندے سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ یہی وہ سربستہ راز ہے جس کو بتانے، سمجھانے اور عام کرنے کے لئے قدرت روشن اور منور لوگوں کو دھرتی پر بھیجتی ہے اور دھرتی کے یہ روشن چراغ زمین پر بسنے والے لوگوں کو روشنی اور نور سے متعارف کراتے ہیں۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ ایسے ہی پاکیزہ اور مقدس گروہ کے افضل ترین ایک فرد ہیں۔

قلندر بابا اولیاءؒ نے فرمایا:

*نوع انسان میں مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے سب آپس میں آدم کے ناطے خالق کائنات کے تخلیقی راز و نیاز ہیں۔ آپس میں بھائی بہن ہیں، نہ کوئی بڑا ہے اور نہ کوئی چھوٹا، بڑائی صرف اس کو زیب دیتی ہے جو اپنے اندر ٹھاٹھیں مارتے ہوئے اللہ کی صفات کے سمندر کا عرفان رکھتا ہو، جس کے اندر اللہ کی صفات کا عکس نمایاں ہو جو اللہ کی مخلوق کے کام آئے، کسی کو اس کی ذات سے تکلیف نہ پہنچے۔

*یہ کیسا الم ناک اور خوفناک عمل ہے کہ ہم دوسروں کو نقصان پہنچا کر خوش ہوتے ہیں، جب کہ آدم و حوا کے رشتے کے پیش نظر ہم خود اپنی جڑیں کاٹتے ہیں۔ درخت ایک ہے شاخیں اور پتے لاتعداد ہیں۔

*خوشی اگر ہمارے لئے معراج کی تمنا ہے تو ہم اپنے نفسوں کو تکلیف پہنچا کر کس طرح خوش رہ سکتے ہیں۔

*دوستو! ایسے کام کیجئے کہ آپ خود مطمئن ہوں، آپ کا ضمیر مردہ نہ ہو جائے اور یہی وہ راز ہے جس کے ذریعے آپ کی ذات دوسروں کے لئے رہنمائی کا ذریعہ بن جائے گی۔

*آدمی حالات کے ہاتھ کھلونا ہے، حالات جس طرح چابی بھر دیتے ہیں آدمی اسی طرح زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔

*موجودہ سائنس تلاش و جستجو کے راستے پر چل کر اس نتیجہ پر پہنچی ہے کہ پوری کائنات ایک ہی قوت کا مظاہرہ ہے۔ یہ انکشاف نیا نہیں ہے ہمارے نبی کریم ﷺ چودہ سو سال پہلے اس بات کا اعلان کر چکے ہیں کہ کائنات کے تمام مظاہر کو ایک ہستی کنڑول کرتی ہے۔ قرآن اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"اللہ آسمان اور زمین کی روشنی ہے۔"

ہم جانتے ہیں کہ آدم زاد کی طرح چوپائے اور پرندے بھی اللہ کی مخلوق ہیں، ان کے اندر بھی احتیاج ہے، انہیں بھی بھوک پیاس لگتی ہے، اے آدم زاد! کبھی تو نے سوچا ہے کہ روزی رساں اتنی بڑی مخلوق کو کس طرح روزی فراہم کرتا ہے؟

*ہر انسان کے گرد سطحی گہری سوچ موجود ہے، تفکر جب گہرا ہوتا ہے تو بجز اس کے کوئی بات سامنے نہیں آتی کہ ہر آدمی جنت اور دوزخ اپنے ساتھ لئے پھرتا ہے اور اس کا تعلق طرز فکر سے ہے، طرز فکر انبیاء کے مطابق ہے تو آدمی کی ساری زندگی جنت ہے، طرز فکر میں ابلیسیت ہے تو تمام زندگی دوزخ ہے۔

*ترقی کے خوشنما اور پر فریب جال میں دنیا کی عمر گھٹ رہی ہے، زمین بیمار ہو گئی ہے، کراہتے ہوئے روتے ہوئے کہہ رہی ہے:

"خدارا! میرے اور اپنے اوپر رحم کرو۔"

مگر کوئی انسان ایسا نہیں ہے کہ اس کی سسکتی ہوئی اور غم میں ڈوبی ہوئی آواز سنے۔

*اے لوگو! اے دانشورو!

کچھ تو ہوش و خرد سے کام لو یہ کیسی ترقی ہے کہ آدمی خود اپنی نسل کو برباد کرنے کیلئے مسلسل کوشاں ہے اور تباہی کا نام اس نے ترقی رکھ چھوڑا ہے اور ترقی کے خوشنما پردوں میں ذہنی سکون، اطمینان اور تحفظ کے احساس کو چھپا دیا ہے۔

*اے آدم زاد! میری بات پر دھیان دے، میں جو تیرا ضمیر ہوں، تیرے اندر کی آواز ہوں، تیرے باطن کی پکار ہوں، دیکھ میرا گلا نہ گھونٹ، میری طرف متوجہ ہو ورنہ تو اسی طرح مصائب کے اندھیروں میں بھٹکتا رہے گا۔

*اے واعظو! اے منبر نشینو! اے قوم کے دانشورو! برائے خدا سوتی قوم کو جگاؤ اور یہ بتاؤ کہ بے عمل قومیں غلام بن جاتی ہیں۔

*آدمی جب اپنی روح کا عرفان حاصل کر لیتا ہے تو اس کی رفتار کے آگے بجلی کی رفتار صفر ہو جاتی ہے، ہزاروں لاکھوں سال پہلے یا بعد کی باتیں اس کے سامنے آجاتی ہیں۔

*کوئی چیز براہ راست ہم سے ہم رشتہ نہیں ہے بلکہ ہر رشتہ میں اللہ کی صفت کا عمل دخل ہے۔

*من سے دوستی کا رشتہ مستحکم کرنے کے لئے ہمارا انر ہمیں راستہ دکھاتا ہے اور وہ راستہ یہ ہے کہ یہاں ہمارا نہ دشمن ہے اور نہ کوئی دوست ہے، ہم خود ہی اپنے دوست ہیں اور خود ہی اپنے دشمن ہیں۔

*روح رہنمائی کرتی ہے کہ ساری کائنات ایک ڈرامے کی طرح ہے، کوئی باپ ہے، کوئی ماں ہے، کوئی بچہ ہے، کوئی دوست ہے، کوئی دشمن ہے، کوئی گنہگار ہے، کوئی پاکباز ہے۔ دراصل یہ اسٹیج پر کام کرنے والے کرداروں کے مختلف روپ ہیں، جب ڈراپ سین ہو جاتا ہے تو کوئی کچھ نہیں رہتا۔

*فتح کی آنکھ دیکھتی ہے کہ اللہ کی ساری مخلوق ایک نقطہ میں بند ہے جس طرح ٹھہرے ہوئے پانی میں جھانکنے سے پانی کے اندر اپنی شکل نظر آتی ہے اسی طرح اس نقطے کے اندر دیکھنے سے کائنات کے سارے افراد فرشتے، جنات، انسان اور دوسری تخلیقات باہم دیگر جڑے ہوئے ملے ہوئے اور ایک دوسرے کے ساتھ پیوست نظر آتے ہیں۔

*حقیقی مسرت سے ہم آغوش ہونے کے لئے انسان کو سب سے پہلے یہ جاننا چاہئے کہ زندگی کا دارومدار صرف جسم پر ہی نہیں ہے بلکہ اس حقیقت پر ہے جس حقیقت نے خود اپنے لئے جسم کو لباس بنالیا ہے۔

*ہم جب یہ کہتے ہیں کہ فلاں آدمی مر گیا ہے تو دراصل کہنا یہ چاہتے ہیں کہ فلاں آدمی کا کردار فلاں آدمی کی زندگی یا فلاں آدمی کی آواز ایک دستاویزی ریکارڈ بن گئی ہے۔

*جب تک آدمی کے یقین میں یہ بات رہتی ہے کہ چیزوں کا موجود ہونا یا چیزوں کا عدم میں چلے جانا اللہ کی طرف سے ہے، اس وقت تک ذہن کی مرکزیت قائم رہتی ہے اور جب یہ یقین غیر مستحکم ہو کر ٹوٹ جاتا ہے تو آدمی ایسے عقیدے اور ایسے وسوسوں میں گرفتار ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ ذہنی انتشار ہوتا ہے۔ پریشانی ہوتی ہے، غم اور خوف ہوتا ہے، ٹوٹ پھوٹ کا شکار انسان روزانہ مرتا ہے اور روزانہ جینے کے بعد پھر مر جاتا ہے۔

*روح اور جسم کے مشترکہ نظام سے جب کوئی بندہ واقف ہو جاتا ہے تو وہ خود کو خوشی اور ایثار کے جذبے میں ڈوبا ہوا محسوس کرتا ہے، وہ ہر اس فرد کو اس نظر سے دیکھتا ہے جس نظر سے ماں اپنے بچوں کو دیکھتی ہے۔

*سکون ایک حقیقت ہے ایسی حقیقت جس حقیقت سے پوری کائنات بندھی ہوئی ہے۔ حقیقت فکشن نہیں ہوتی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ بندے کے اندر وہ کونسی طاقت ہے جو ٹوٹ پھوٹ، گھٹنے بڑھنے سے محفوظ ہے۔ وہ طاقت ہر بندے کی اس کی اپنی روح ہے۔ نسلی اعتبار سے اگر ہم اپنے بچوں کو ان کے اندر روح سے آشنا کریں تو وہ مذہب سے دور نہیں ہونگے۔

*اس رنگ و بو کی طرف ایک اور دنیا بھی ہے جو مرنے کے بعد ہمارے اوپر روشن ہوتی ہے۔ ہم کتنے بدنصیب ہیں کہ کبھی اس نادیدہ دنیا کی طرف سفر نہیں کیا۔ اگر ہم اس دنیا سے روشناسی حاصل کر لیں تو اس بات کی توقع کی جاسکتی ہے کہ ناشاد و نامراد زندگی کو مسرت و شادمانی میسر آجائے گی۔

*یہاں ہر چیز لہروں کے دوش پر رواں دواں ہے، یہ لہریں جہاں زندگی کو خوش آرام بناتی ہیں، مصیبت و ابتلا میں بھی مبتلا کرتی ہیں، نور کے قلم سے نکلی ہوئی ہر لکیر نور ہے اور نور جب مظہر بنتا ہے تو روشنی بن جاتا ہے، روشنی کم ہو جائے تو اندھیرا ہو جاتا ہے، آدم نے اس اندھیری دنیا میں قید ہونے کو سب کچھ سمجھ لیا ہے۔

*انسانی نگاہ کے سامنے جتنے مناظر ہیں وہ شعور کی بنائی ہوئی مختلف تصویریں ہیں۔ اس لئے کہ اس کے مشاہدات اور تجربات سب مفروضہ ہیں۔ ایک چیز کے بارے میں سینکڑوں لوگوں کی سینکڑوں آراء ہوتی ہیں حالانکہ حقیقت ایک اور صرف ایک ہوتی ہے۔ عام مشاہدہ ہے کہ ہماری نگاہ کے سامنے مظاہر میں ہر وقت تغیر رہتا ہے، آبادی ویرانہ میں اور ویرانہ آبادی میں بدل جاتا ہے۔ یہ متغیر دنیا حقیقت کس طرح ہوتی ہے؟ جب کہ حقیقت میں تغیر نہیں ہوتا۔

کہکشاں

یہ اس وقت کی بات ہے جب زمین پر آدم کا وجود نہیں تھا، زمین اپنے حدود اربعہ میں موجود تھی، زمین کی ساخت ایسی تھی کہ اس کی تقسیم در تقسیم یکساں تھی، وسعت بے کراں پر پھیلی ہوئی زمین طبقات پر مشتمل تھی، طبق در طبق زمین اس طرح پھیلی ہوئی تھی کہ زمین کے ہر حصے پر ایک ہی زمین کا گماں ہوتا تھا، ہر جگہ سطح زمین کے ساتھ ساتھ ندی، پہاڑ، آبشار اور برف پوش پہاڑیاں تھیں۔ زمین کی شمالی اور جنوبی ہیئت ایک جیسی تھی، ہر خطے کے شمال میں پہاڑ، بادل، جھیلیں، چشمے اور ٹھنڈک کا سماں تھا، اس کے برعکس جنوب میں جس کے کنارے مشرق و مغرب سے ملتے تھے، کھلے میدان، کھیت کھلیان اور باغات زمین کی رونق بنے ہوئے تھے۔ اگر اس صورتحال کو ماضی کے پیمانے سے ناپا جائے اور محدود شعور میں رہتے ہوئے وقت کا تعین کیا جائے تو یہ وقت لاکھوں سال اور کروڑوں سال پر محیط کہا جاتا ہے، لاکھوں، کروڑوں سالوں سے زمین اپنی آغوش پھیلائے ہوئے انسانوں کے لئے وقف ہے، سطح زمین پر مرقع آسمان کی روشن قندیلیں، کہکشانی جھرمٹیں بھی زمین کو زینت بخشنے میں اپنا کردار پورا کر رہی ہیں۔ زمین رنگ برنگ پھولوں سے اپنا سنگھار کر کے نوع انسانی کے لئے دلہن بنی ہوئی ہے اور یہ عمل لاکھوں کروڑوں سال سے جاری ہے اور نہیں معلوم کس وقت تک جاری رہے گا۔

کہا جاتا ہے کہ انتظار موت سے زیادہ سخت ہے۔ انتظار میں وقت کی نبض ڈوب ڈوب کر دوبارہ ابھرتی ہے۔ انتظار ایک ایسی کیفیت جس کیفیت میں کوئی بھی بندہ پہلے ناخوش ہوتا ہے، پھر بے زار ہوتا ہیاس کے بعد مایوسی کی انتہا کو پہنچ جاتا ہے، جب زمین اس کیفیت میں داخل ہوئی تو زمین کو پیدا کرنے والی ہستی کو رحم آیا، مایوس اور بے حال زمین کو مایوسی کے عمیق غاروں سے نکالنے کے لئے زمین کے مالک نے زمین کے محبوب آدم کو زمین پر بھیج دیا۔ یہ بھیجنا اس طرح عمل میں آیا کہ زمین کی کوکھ کھلی اور اس کوکھ میں سے معصوم اور کومل بچہ وجود میں آگیا۔ جیسے بارش کے چھینٹے پڑنے سے زمین پر پھیلی ہوئی چکنی مٹی پھیل جاتی ہے اور زمین کی نظر نہ آنے والی دراڑوں سے بیر بہوٹی جنم لیتی ہے۔

جیسے بارش کی چھینٹیں زمین پر پڑنے سے ایک مخصوص گیس فضا میں اڑتی ہے اور اس مخصوص گیس سے بارش کے قطرے ہم جان ہوتے ہیں تو فضا سے مینڈک کے چھوٹے چھوٹے بچے زمین پر برستے ہیں۔ جیسے پودوں کے پتوں پر بارش برستی ہے تو پتوں میں موجود رگیں ٹڈے کی صورت اختیار کر لیتی ہیں اور ٹڈا اس پتے کا ہم شکل ہو کر ہوا میں اڑتا پھرتا ہے۔

قانون یہ ہے کہ جب جان سے جان ملتی ہے تو تیسری جان خدوخال بن جاتی ہے۔ آدم کی جان جب زمین کی جان سے ملی تو تیسری جان آدم کا شعور تخلیق ہوا اور اس شعور نے آدم کو اسپیس میں رہنے پر مجبور کر دیا، آدم کی مجبوری اپنی جگہ لیکن زمین نے آدم کی خدمت گزاری میں کمی نہیں کی اور آدم کے لئے خورد و نوش کا انتظام کیا، آدم کے لئے روئی اور اون کی شکل میں لباس فراہم کیا، آدم کے لئے اپنا دامن پھیلا کر دھوپ سمیٹی، آدم کے لئے سر پر سیاہ پلو لے کر ٹھنڈی، میٹھی، مسرور و مخمور، شاعرانہ تخیل کے ساتھ چاند کی چاندنی کو اپنے اوپر پھیلا لیا۔ اپنے اوپر سایہ دار درختوں کو پہریدار بنایا، نرم و نازک اور دبیز گھاس کو قالین بنا کر اپنے اوپر بچھا دیا۔

انسان کی ساری زندگی اور غلاظت کو زندگی میں چھپایا اور مرنے کے بعد بھی انسان کو بے حرمت نہیں ہونے دیا۔ دیکھنا یہ ہے کہ انسان نے اپنی محسن زمین کے احسانات کا کیا بدلہ چکایا؟ پانچ ہزار سال کی تاریخ سے زیادہ انسان کچھ نہیں جانتا اور پانچ ہزار سال کی تاریخ میں بھی اسی سے نوے فی صد قیاس آرائی شامل ہے، بہر حال انسان کی خود نوشت تاریخ پر اگر غور کیا جائے تو ظلم و بربریت، جبر و تشدد کے علاوہ انسان نے زمین کو اور کچھ نہیں دیا جس طرح ایک اچھا ڈاکٹر آپریشن کر کے وہ اعضاء نکال دیتا ہے جو اعضاء پورے جسم کو ناکارہ کر دیتے ہیں، زمین نے بھی انسانی قیاس کے مطابق سترہ اٹھارہ مرتبہ انسان کے مفلوج اور زہریلے جسم کو نابود کر کے اپنے اندر محفوظ کر لیا اور پھر ماں کی ممتا کے ساتھ زمین نے انسانوں کی پرورش دوبارہ شروع کر دی، یہ سلسلہ جاری ہے، جاری رہے گا، کب تک جاری رہے گا، یہ بات زمین بھی نہیں جانتی۔

زمین ہم سب کی ماں ہے،

یہ ماں ہماری ہر ضرورت کی کفالت کرتی ہے،

یہ ماں ہماری تربیت کر کے ہمیں شعور بخشتی ہے۔

زمین نے آدم کو آگ کے استعمال کا شعور بخشا، پھر اس شعور میں اچھائی اور برائی کا تصور منتقل کیا، اچھائی اور برائی کے تصور کو قائم رکھنے کے لئے وسائل استعمال کئے، مثلاً اگر شعور میں یہ بات راسخ ہو گئی کہ ستر پوشی ضروری ہے زمین نے ستر پوشی کے لئے کپڑا بنانے کی چیزیں مہیا کیں، شعور میں ارتقاء ہوا کہ علم کی افادیت ہے اور علم کی بنیاد پر ہی آدم زاد حیوانات سے ممتاز ہو سکتا ہے تو زمین نے اپنے اندر مخفی صلاحیتوں کو اس طرح ظاہر کر دیا کہ آدم زاد علم سیکھ سکے۔

انسان اور زمین کے رشتے پر غور کیا جائے تو اس بات سے چھ ارب آدمیوں میں سے ایک آدمی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ زمین نے ہر قدم پر آدم کی مدد کی ہے، زمین آج بھی یہ چاہتی ہے کہ زمین پر بسنے والی اس کی اولادوں میں سے ایک ممتاز اولاد آدم خوش رہے، خوشی دینے کے لئے زمین انسان سے کوئی قیمت طلب نہیں کرتی، انسان بھی دوسروں سے توقع قائم کرنے کے بجائے زمین کی

طرح دوسروں کی مفت خدمت کو اپنا شعار بنالے تو انسانی زندگی مسرت و شادمانی، خوشی اور سکون، راحت و آرام اور مخمور زندگی کا گہوارہ بن جائے گی۔

حضور قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں:

شمع جب اپنے وجود میں دوڑنے والی انرجی کو دوسروں کے لئے جلاتی ہے تو دوسروں کی روشنی کا انعکاس ملتا ہے، اندھیرا چھٹ جاتا ہے، ماحول روشن و منور ہو جاتا ہے، آدمی کا چہرہ ایک دوسرے کا آئینہ بن جاتا ہے، اس کے برعکس اگر انسان کے اندر شمع کا ایثار موجود نہیں ہوتا اور شمع خود کو پگھلا کر اپنی توقعات منقطع نہیں کرتی تو اندھیرا گھپ اندھیرا بن جاتا ہے، تاریکی چھا جاتی ہے، راستہ نہیں ملتا، مسافر بھٹکتا رہتا ہے اور بالآخر مر جاتا ہے۔

ماضی

تاریخی شواہد یہ ہیں کہ ساری دنیا ایک ڈرامہ ہے۔ ایسا ڈرامہ جس میں الگ الگ کرداروں کے ساتھ بے شمار کہانیاں ہیں، ہر کہانی کا آغاز ایک طرح ہوتا ہے اور ہر کہانی ایک ہی انجام پر ختم ہوتی ہے، کہانی در کہانی یہ دنیا عجیب دنیا ہے، کہانی کا ہر کردار سمجھتا ہے کہ میں ایک نئی دنیا ہوں لیکن یہاں کوئی بھی بات نئی نہیں ہے، انسان نے تاریخ کے نام پر کتابوں کے اتنے انبار لگا دیئے ہیں کہ اگر ان سب کو سمندر میں ڈال دیا جائے تو سمندر میں ایک جزیرہ بن جائے گا اور عربوں کھربوں کتابوں کے مطالعے سے انسانی ذہن نے یہ نتیجہ اختراع کیا ہے کہ زمین پر تین زمانے محیط ہیں:

ماضی

حال

مستقبل

بڑے بڑے دانشور، فلسفی، حکماء، سائنسدان، ماہر نفسیات، ماہر ارضیات اور نہیں معلوم کتنے شعبوں کے ماہرین یہ بات ثابت نہیں کر سکے کہ تین زمانے ماضی، حال اور مستقبل کی کیا حیثیت ہے؟ کیا واقعتاً زمین ان تین دائروں میں مقید ہے؟ کیا کوئی بھی پیدا ہونے والا انسان ماضی، حال اور مستقبل کے دائروں میں بند ہے؟

میں ایک بندہ بشر ہوں، میری زندگی ایک کتاب ہے، اس کتاب میں زندگی کے نشیب و فراز، ماہ و سال شب و روز چھپے ہوئے ہیں، اس طرح زمین پر موجود ہر بشر ایک کتاب ہے، جتنے سال یہ بشر دنیا میں رہتا ہے کتاب زندگی میں اتنے ہی ورق ہیں، میں اگر ستر سال کا بوڑھا ہوں تو میری کتاب زندگی میں ستر ورق ہیں، ورق کا ایک صفحہ مظاہراتی دنیا ہے اور دوسرا صفحہ ماورائی دنیا ہے۔

زندگی کا پہلا ورق یہ ہے کہ میں نے اس دنیا میں قدم رکھا، ایک سال تک اس ورق پر نقش ابھرتے رہے اور نقوش زندگی بنتے رہے، دوسرے سال بھی پہلے سال کے نقوش گہرے ہوتے رہے، نتیجہ میں زندگی کے دو سال دو ورق بن گئے، پھر ان اوراق میں اضافہ ہوتا رہا لیکن نقوش میں تبدیلی واقع نہ ہوئی۔ کتاب زندگی دس صفحہ کی ہوئی، بیس صفحہ کی ہوئی، تیس صفحہ کی ہوئی، چالیس صفحہ کی ہوئی، ساٹھ صفحہ کی ہوئی اور جب ستر اسی سال کے اوراق پورے ہوئے تو کتاب بند ہو گئی۔ اس عمل کو اہل دانش ارتقائی عمل قرار دیتے ہیں، ارتقائی عمل بھی خوب ہے کہ کسی ایک نقطے پر جا کر ختم ہو جاتا ہے اور اس طرح ختم ہو جاتا ہے کہ وجود ناپید اور ہستی عدم

ہو جاتی ہے، دانشوروں کے ارتقائی عمل پر غور و فکر کیا جائے تو ذہن کی اسکرین پر یہ سوال ابھرتا ہے کہ ستر، اسی سال کی زندگی، حال اور مستقبل کس طرح ہوئی؟ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ زمین پر موجود ہر شئے، ہر تخلیق، ہر نوع انسانی کا ہر فرد ماضی ہے اور سارا ارتقائی عمل ماضی کا دہرانا ہے۔

ہمیں پیاس لگتی ہے لیکن اگر ماضی میں پانی موجود نہ ہو تو پیاس نہیں بجھتی، بھوک لگتی ہے لیکن اگر ماضی میں خورد و نوش کا سامان نہ ہو تو اور تسلسل نہ رہے تو بھوک رفع نہیں ہوتی، نوع انسان کا پہلا فرد ابو بشر آدم اگر ماضی میں نہ ہوتا تو نسل انسانی کے وجود کا تذکرہ ہی نہ ہوتا، یہ کیسی منطق ہے کہ ماضی کے دہرانے کو حال اور مستقبل کا نام دیا جا رہا ہے، جبکہ ماضی پھیل رہا ہے اور سمٹ رہا ہے، ماضی پھیلتا ہے تو اس کو ارتقاء کہہ دیا جاتا ہے اور ماضی سمٹتا ہے تو اس کا نام تنزل رکھ دیا جاتا ہے، اندرون بین نظر سے دیکھا جائے تو زمین اور پوری کائنات ماضی کے علاوہ کچھ نہیں ہے، زمین پر پیدا ہونے والا بچہ ابو بشر آدم کی تصویر ہے جو مثبت سے منفی بن رہی ہے۔ مثبت سے منفی تصویر کو حال اور مستقبل کیسے کہا جا سکتا ہے؟

آج پیدا ہونے والا بچہ میں ستر، اسی سال چھپے ہوئے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اس بچے میں کیمیائی تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ یہ کیمیائی تبدیلیاں پہلے سے موجود روشنیوں میں تبدیلیاں ہیں، ان تبدیلیوں کی وجہ سے بچہ دو دائروں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ ایک کو محسوس دنیا اور دوسری کو غیر محسوس دنیا سمجھا جاتا ہے۔

دانشوروں کے نزدیک محسوس دنیا قابل اعتماد ہے اور غیر محسوس دنیا اس لئے قابل اعتماد نہیں ہے کہ وہ آنکھوں کے سامنے مظہر نہیں بنتی، حالانکہ غیر محسوس دنیا پیدا ہونے والے بچے کے لئے بنیاد ہے۔ اس لئے کہ جو بھی بچہ اس دنیا میں آتا ہے وہ اس دنیا سے آتا ہے جو نظروں کے سامنے نہیں ہے۔

بچے کے اندر بتدریج جب کیمیائی یا شعاعی تبدیلیاں ہوتی ہیں تو رفتہ رفتہ طبیعت کے لئے یہ تبدیلیاں معمول بن جاتی ہیں، کبھی حواس کے اوپر ان کا غلبہ زیادہ ہوتا ہے اور کبھی یہ غلبہ کم ہو جاتا ہے، تبدیلیوں کا کم یا زیادہ ہونا رد عمل ہے۔ جب تک رد عمل رہتا ہے، طبیعت اس کو نہیں دہراتی اور جب رد عمل ہو چکتا ہے تو طبیعت دہرانے لگتی ہے، قانون یہ ہے کہ رد عمل محض وقتی ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ:

"لوگوں کی یہ پرانی عادت ہے کہ جب ہمارا قاصد پیام لے کر ان کے پاس ہوتا ہے تو وہ اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان لوگوں کی بے یقینی کا یہ عالم ہے کہ اگر ہم آسمان کے دروازے کھول دیں اور چڑھنے کے لئے ان کو زینہ مل جائے اور یہ سارا دن چڑھتے رہیں مگر یہی کہتے جائیں گے کہ ہماری نگاہ پر جادو کر دیا گیا ہے، ہم تو نظر بندی میں مبتلا ہو گئے ہیں۔ حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ ہم نے آسمانوں کے الگ الگ حصے کر دیئے ہیں اور ان کو مختلف طرزوں پر آباد کیا ہے البتہ اس آبادکاری کو نظر والے ہی دیکھ سکتے ہیں اور شیطان مردود

بے یقین ہے اس کی نگاہ سے ان آبادیوں کو مخفی کر دیا ہے، وہ ان بستیوں کو نہیں دیکھ سکتا لیکن جو لوگ چور دروازوں سے ان آسمانوں میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں انہیں آگ کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔"

(القرآن)

کائنات میں ہر چیز کا ایک تشخص ہے۔ یہ تشخص ہی پھیلتا اور سمٹتا رہتا ہے۔ یہ تشخص کائنات کی تخلیق سے پہلے ہی متعین کر دیا گیا ہے۔ جب ہم کائنات کی تخلیق سے پہلے کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب ماضی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ یہ تشخص ہی حقیقی ہے، خواہ وہ ذرے میں ہو، ستارے میں ہو، چاند میں ہو، سورج میں ہو، زمین میں ہو یا انسان میں ہوں، انسان کا کوئی بھی کردار پہلے سے ماضی میں ریکارڈ ہے۔ ماضی میں موجود کسی بھی کردار یا صلاحیت کو انسان جتنا بیدار کرے اتنی ہی وہ صلاحیت بیدار ہو جاتی ہے، مطلب یہ ہے کہ یہاں پر انسان ڈاکٹر بھی ہے، انجینئر بھی ہے، ٹیچر بھی ہے اور جو شخص انجینئر ہونا چاہئے وہ اپنے اندر موجود ریکارڈ انجینئر نگ کی صلاحیت کو بیدار کر لے تو وہ انجینئر بن جاتا ہے، اگر کوئی شخص ڈاکٹر بننا چاہتا ہے تو وہ اپنے اندر موجود ڈاکٹر کی صلاحیت کو بیدار کر لے تو ڈاکٹر بن جاتا ہے۔ جو شخص اپنی ذات (ماضی) سے بے خبر ہو جاتا ہے وہ ایسی دنیا میں داخل ہو جاتا ہے جہاں رنج والم، عدم تحفظ، پریشانی، بے سکونی اور ذہنی انتشار نہیں ہے، جس درجے میں جدوجہد اس صلاحیت کو بیدار کرنے میں اجاگر ہو گی اس ہی مناسبت سے وہ کامیاب ہو جائے گا اور جب کوئی شخص اپنی صلاحیتوں کی حقیقت اور مکمل کارکردگی سے بے خبر رہتا ہے تو اپنی ذات کا جائزہ نہیں لے سکتا، وہ یہ نہیں جان سکتا کہ اس کی ذات کہاں تک محیط ہے اور یہی انسان کی سب سے بڑی محرومی ہے۔

عقل و شعور

علم کیا ہے؟ علم کا مطلب جاننا کسی چیز کے بارے میں معلومات حاصل کرنا ہے، زمین و آسمان میں آباد مخلوق میں سے کوئی ایک مخلوق بھی ایسی نہیں ہے جو علم کے دائرے سے باہر ہو۔ ہر مخلوق وائرس مخلوق ہو، چیونٹی مخلوق ہو، شہد کی مکھی مخلوق ہو، ہرن مخلوق ہو، نقش و نگار سے مزین خوبصورت پروں والا پرندہ مور ہو، زیبرا ہو، شیر ہو، ہاتھی ہو یا ہزاروں سال پہلے جسم میں ہاتھی سے بھی بڑی مخلوق ڈائینا سار ہو، سب علم کے دائرے میں بند ہیں یا سب کو اپنی زندگی گزارنے اپنی خورد و نوش کا سامان حاصل کرنے اور اس سامان سے استفادہ کرنے کا علم حاصل ہے۔

ہم جب شہد کی مکھی برادری کے رہائشی کمروں اور حفاظتی انتظامات دیکھتے ہیں تو ہمیں مکمل ضابطہ حیات اور بھرپور ایڈمنسٹریشن نظر آتا ہے۔ یہی صورتحال چیونٹی کی بھی ہے، حضرت سلیمان علیہ السلام کے قصے میں مذکور ہے کہ :

”چیونٹیوں کی ملکہ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کے عظیم الشان لشکر کو دیکھ کر اپنی رعایا چیونٹیوں سے کہا کہ تم فوراً اپنے بل میں گھس جاؤ ورنہ سلیمانؑ بادشاہ کے گھوڑوں اور پا پیادہ لوگوں کے قدموں کے نیچے آکر ہلاک ہو جاؤ گی۔“

(القرآن)

مزدور چیونٹیاں گلہ جمع کرتی ہیں اور زمین کی تہہ میں بنے ہوئے الگ الگ خانوں میں ذخیرہ کرتی ہیں، مزدور چیونٹی کے اندر اپنے جسم سے دس گنا زیادہ وزن اٹھانے کی صلاحیت ہوتی ہے، انجینئر چیونٹیاں اپنی ملکہ کے لئے شاہی محل تیار کرتی ہیں، یہ شاہی محل گیلریوں کے ذریعے ہر طرف سے ملا ہوا ہوتا ہے، انجینئر چیونٹیوں کا بنا ہوا قلعہ اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ اس پر پانی کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور شدید گرمی بھی اثر انداز نہیں ہوتی یعنی یہ قلعہ اور قلعے کے اندر محل، محل کے اندر گیلریاں، سینٹرلی ایئر کنڈیشنڈ ہوتی ہیں، چیونٹیوں میں ایک قسم ایسی ہے جو لہروں میں منتقل ہونے کا علم جانتی ہے۔ جس طرح کسی ٹی وی سٹیشن سے تصویر لہروں میں منتقل ہو کر ٹی وی اسکرین پر نظر آتی ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ سائنٹسٹ چیونٹی اب سے لاکھوں سال پہلے روشنیوں میں تحلیل ہونے کا عمل جانتی تھی۔ آسمانی کتاب قرآن پاک میں ملکہ سبا کا واقعہ بڑا دلچسپ ہے اور اس واقعہ میں ایک پرندے کے عقل و شعور کا تذکرہ ہے۔ اس طرح زمین کے اوپر موجود ہر مخلوق علم کی دولت سے مالا مال ہے، کسی میں عقل و شعور زیادہ ہے، کسی میں کم ہے لیکن

زمین پر موجود تقریباً ساڑھے گیارہ ہزار مخلوق اوران مخلوقات میں کھربوں لاکھوں افراد میں سے ایک فرد بھی ایسا نہیں ہے جو علم نہ رکھتا ہو۔

کہا جاتا ہے کہ انسان معاشی جانور ہے، معاشی جانور سے مراد اگر یہ ہے کہ انسان گروہی سسٹم کا پابند ہے یعنی انسان انسان کے ساتھ رہتا ہے، انسان انسان کے ساتھ بات کرتا ہے، انسان انسان کے ساتھ نفرت کرتا ہے، محبت کرتا ہے، ایک انسان جو کچھ کھاتا ہے دوسرا انسان بھی وہی نوش جان کرتا ہے۔ دراصل یہ طرز تکلم انسان کی انا پرستی ہے جب کہ ہر انسان یہ دیکھتا اور جانتا ہے کہ بھیڑ بھی معاشی جانور ہے، بھیڑ ہمیشہ بھیڑ کے گلہ میں بیٹھتی ہے، بکری ہمیشہ اپنے ریوڑ کے ساتھ رہتی ہے، ہاتھی ہاتھی کے ساتھ رہتے ہیں، ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ہاتھی بھینس کے ساتھ بیٹھا ہو، بھینس اونٹ کے ساتھ بیٹھی ہوئی نظر آئی ہو، یہ سب جانور یا حیوانات ایک دوسرے کی خبر گیری رکھتے ہیں، ایک دوسرے کے کام آتے ہیں، ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں شریک ہوتے ہیں۔

انسان چونکہ بذات خود احساس برتری کا مریض ہے اس لئے اس نے اپنا گروہ کو معاشی جانور کے نام سے متعارف کرایا، ایک گائے یا ہرن کا بچہ جب مر جاتا ہے تو گائے اور ہرن آنسوؤں سے روتے ہیں، حیوانات کے گروہ میں جب پیدائش ہوتی ہے تو اس گروہ کے افراد خوش ہوتے ہیں اور ان کے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑتی ہوئی باآسانی نظر آتی ہے۔ انسان یہ بھی کہتا ہے کہ علم کی فضیلت حاصل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انسان میں عقل و شعور زیادہ ہے۔ اگر حیوانات کی زندگی پر تفکر کیا جائے تو انسان کا یہ دعویٰ بھی بالکل بے بنیاد ہے، حیوانات میں چھوٹے چھوٹے حشرات الارض کئی معاملات میں انسان سے کہیں زیادہ ذہین، ہوشیار اور عقل مند ہیں۔

ہمیں یہ سوچنا ہے کہ علم کے حصول میں جب تمام حیوانات بشمول انسان جسے حیوان ناطق کہتا ہے جبکہ ہر حیوان بھی ناطق ہے، کس طرح دوسری مخلوق پر افضل واشرف ہے، علم کیا ہے؟ علم دراصل یقین کا پیٹرن ہے، ایسا پیٹرن جس کی بنیاد پر زندگی رواں دواں ہے۔ حیات و ممات قائم ہے، ترقی وارتقاء موجود ہے۔

یقین کیا ہے؟ یقین وہ مرکزیت ہے جس میں شک اور ابہام نہیں ہوتا، دنیا میں کھربوں افراد میں یقین کا یہ پیٹرن موجود ہے کہ پانی پینے سے پیاس بجھتی ہے۔ موجود نہ ہو تو پانی معدوم ہو جائے گا، پانی سے پیاس اس لئے بجھتی ہے کہ پانی موجود ہے، یقین کا پیٹرن یہ بتاتا ہے کہ پانی اگر نہیں ہو گا تو پیاس بھی نہیں بجھے گی۔ یقین ایک ایسا عمل ہے جس کے اوپر ظاہر اور باطن متحرک ہیں۔ یقین علم کے بغیر ممکن نہیں ہوتا اور علم یقین کی آبیاری میں مکمل کردار ادا کرتا ہے۔ قرآن پاک میں یقین اور علم کی پوری طرح وضاحت کی گئی ہے، پیغمبران کی ساری زندگی علم اور یقین ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے علم اور یقین یعنی نور فراست سے نوازا تھا۔ ان کے علم نے یقین کا درجہ حاصل کر لیا تھا، بت سن سکتے ہیں اور نہ دیکھ سکتے ہیں اور کسی کو نفع نقصان نہیں پہنچا سکتے، ان کے

علم نے انہیں بتایا کہ بے جان مورتیوں کو میرا باپ اپنے ہاتھوں سے بناتا ہے پھر یہی مورتیاں عبادت گاہوں میں سجادی جاتی ہیں۔ جہاں بادشاہ، بادشاہ کے مصائب، بڑے بڑے عہدے دار اور عوام پتھر سے تراشی ہوئی ان بے جان مورتیوں کو سجدہ کرتے ہیں اور حاجت روائی کے لئے ان کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہیں اور دعا کرتے ہیں۔

ایک روز انہوں نے اپنے والد آذر سے پوچھا:

"اے میرے باپ! کیوں پوجتا ہے جو چیز نہ سنے، نہ دیکھے اور نہ کام آوے تیرے کچھ۔"

(سورۃ مریم)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد نے جو کچھ جواب میں کہا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کی نفی کر دی، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اندر علم کے بعد تفکر اور تفکر کے بعد یقین کا پیٹرن متحرک ہوا۔ انہوں نے سوچا کہ:

"ہر شئے مقررہ قاعدے اور ضابطے کے تحت خود بخود کیسے متحرک ہے؟ کون ہے جو روزانہ سورج کو طلوع کرتا ہے؟ کون ہے جو دن کے اجالے کو تاریکی میں بدل دیتا ہے؟ کون ہے جو درختوں کی شاخوں میں سے پھل نمودار کرتا ہے؟ بارش کون برساتا ہے؟ لہلہاتی کھیتیاں کون اگاتا ہے؟ کون ہے وہ جس کی عمل داری میں کائنات کا ہر فرد اپنے کام میں لگا ہوا ہے، آپس میں کوئی ٹکراؤ نہیں ہوتا اور کبھی کوئی اختلاف بھی واقع نہیں ہوتا۔"

نتیجہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے لکڑی سے بنائے ہوئے کھلونے، پتھر سے بنائی ہوئی مورتیوں اور مٹی چونے سے بنائی ہوئی دوسری چیزوں کو خدا ماننے سے انکار کر دیا اور کہا:

"میں اپنا رخ اس طرف کرتا ہوں جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔"

(سورۃ انعام)

تفکر کی راہوں پر چلتے ہوئے تاروں بھری ایک رات میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک روشن ستارہ دیکھا فرمایا۔ یہ میرا رب ہے، جب وہ روشن ستارہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا میں چھپ جانے والے کو معبود نہیں مانتا پھر ٹھنڈی ٹھنڈی میٹھی روپہلی چاندنی سے بھرپور چاند کو دیکھا جیسے جیسے طلوع آفتاب کا وقت قریب آیا چاند بھی نگاہوں سے اوجھل ہونے لگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چاند کے رب ہونے کی بھی نفی کر دی، طلوع آفتاب کے بعد سورج بھی زوال پذیر ہونے لگا اور اس پر اتنا زوال غالب آیا کہ وہ نظروں سے مخفی ہو گیا، تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے دیئے ہوئے علم اور علم کے نتیجے میں یقین سے کہا:

''میرا رب وہ ہے جو نہ کبھی چھپتا ہے اور نہ اسے کبھی زوال ہے۔''

بات بادشاہ وقت نمرود تک پہنچی۔ نمرود خود کو رعایا کا رب اور مالک سمجھتا تھا۔ رعایا نمرود کو خدا مانتی تھی اور اس کی پرستش کرتی تھی، دربار شاہی میں سجدہ کرنے کا رواج عام تھا، بالکل بالکل عقائد کی تکذیب اور باطل عقائد کا پرچار کرنے والے مذہبی پیشواؤں، ارباب اقتدار اور عوام کو دعوت حق دیتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ :

''تم کائنات کے مالک اور مختار کل اللہ کو چھوڑ کر باطل معبودوں کو پوجتے ہو، تم عقل وشعور کیوں نہیں استعمال کرتے۔''

بارش

اس رنگ رنگ دنیا کو رونق بخشنے کے لئے قدرت نے حیات و ممات کا ایک مکمل نظام بنایا ہے۔ زمین پر جو بھی چیز موجود ہے وہ حیوانات ہوں، جمادات ہوں، نباتات ہوں، حیوانات میں پرندے ہوں، چرندے ہوں، درندے ہوں یا انسان ہوں اور زمین کے اوپر یا زمین کے اندر حشرات الارض ہوں۔

زمین پر تین حصے پانی کی حکمرانی ہے۔ پانی کی مخلوق میں گھونگے ہوں، سیپ ہوں، موتی ہوں، مرجان ہوں، دریائی گھوڑا ہو اور بے شمار پانی سے جنم لینے والی مخلوقات ہوں، نباتات میں درخت ہوں، پودے ہوں، پھل ہوں، کھانے پینے کے لئے گھاس ہو، ترکاریاں اور سبزیاں ہوں، جمادات میں معدنیات ہوں، معدنیات میں ہیرے جواہرات ہوں، زینت و زیبائش کے لئے طرح طرح کے خوبصورت اور قیمتی پتھر ہوں، تانبہ ہو، پیتل ہو، ایلومینیم ہو، گیس ہو، پیٹرول ہو، چاندی ہو یا سونا ہو سب کی تخلیق کا قانون ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ ہر چیز پیدا ہوتی ہے، جوان ہوتی ہے اور کہن سالی میں منتقل ہو کر اس دنیا سے غائب ہو جاتی ہے، پیدائش کا نظام ہو اس نظام میں جوانی بڑھاپا یا موت ہو، سب ایک معین قانون کے تحت حرکت کرتے ہیں اور یہ حرکت اس دنیا سے نکل کر دوسری دنیا میں بھی جاری رہتی ہے۔ قدرت کا نظام جس طرح پیدا کرنے کا پابند ہے اسی طرح ہر چیز کی حفاظت بھی اس نظام کی ذمہ داری ہے۔

زمین کے اوپر اللہ تعالیٰ نے ایک چھت بنائی ہے اور اس چھت کو ستاروں سے چاند سے، سورج سے ایسا مزین کیا ہے کہ انسان دیکھ کر خوش بھی ہوتا ہے اور حیران بھی ہوتا ہے۔

حسن کا معیار یہ ہے کہ کوئی خوبصورت ہوتا ہے اور کوئی کم خوبصورت ہوتا ہے، کوئی بدصورت ہوتا ہے، یہ خوبصورتی، کم خوبصورتی اور بدصورتی زمین پر موجود ہر نوع کے افراد میں موجود ہے۔ جس طرح انسانوں میں لوگ خوبصورت ہوتے ہیں، کم خوبصورت ہوتے ہیں، مضبوط ہوتے ہیں، کمزور ہوتے ہیں، اسی طرح نباتات میں بھی مضبوط درخت، نازک درخت، بدصورت درخت ہر وقت آنکھوں کے سامنے ہیں، زمین کے اوپر اگر نباتات کی دنیا نہ بسی ہوئی ہوتی تو زمین اجاڑ لگتی، زمین کے اندر کشش باقی نہ رہتی، نباتات کی دنیا نہ ہوتی تو انسان کو کھانے کے لئے اجناس میسر نہ آتیں، درخت نہ ہوتے تو کوئلہ نہ بنتا، کوئلہ نہ ہوتا تو خورد و نوش میں انسان اور شیر برابر ہو جاتے، کوئلہ یا لکڑی یا گیس کھانا پکانے میں کام آتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ آگ سے انسان کی ایجادات کا براہ

راست تعلق ہے، یہ آگ ہی ہے جو لوہے کو پگھلا کر انسانی زندگی کے لئے آرام و آسائش میسر کرتی ہے، یہی کوئلہ جو انسان کو زندگی فراہم کرتا ہے۔ اگر کسی کمرے میں جلا کر کھڑکیاں اور دروازہ بند کر دیا جائے تو آدمی کا دم گھٹ جائے گا، کوئلہ کو خوبصورتی کا نام نہیں دیا جا سکتا لیکن اس بدصورت شئے کے اندر قدرت نے جو صلاحیت محفوظ کر دی ہے اس سے مردہ اقوام زندہ ہو گئی ہیں اور زندہ اقوام جنہوں نے کوئلہ کی صلاحیت کا سراغ نہیں لگایا اور کوئلہ کی صلاحیت سے اجتماعی فوائد حاصل نہیں کئے وہ مردہ ہو گئیں۔

انسان مر جاتا ہے، قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے، جب قبر میں انسان کا گوشت پوست اور ہڈیاں مٹی میں تبدیل ہو جاتی ہیں تو یہی مٹی بن جاتی ہے اور یہی مٹی پھول بن جاتی ہے اور یہی مٹی پھلوں کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے ایک قصہ سنایا تھا:

ناناتاج پوریؒ کی خدمت میں کھانے کے لئے ایک امرود پیش کیا گیا، قاش جب ہونٹوں سے لگی تو انہوں نے فرمایا:

"یہ کسی مردے کا گوشت ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے امرود کی قاش پھینک دی، حاضرین مجلس میں سے کچھ لوگوں کو تجسس ہوا کہ امرود کی قاش سے مردہ گوشت کا کیا تعلق ہے۔ دو معزز حضرات مجلس میں سے اٹھے اور فروٹ کی اس دوکان پر پہنچے جہاں سے امرود خریدے گئے تھے، دوکاندار نے سبزی منڈی میں آڑھتی کا پتہ بتایا، آڑھتی نے اس زمیندار کا پتہ بتایا جہاں سے امرود اس کے پاس آئے تھے، زمیندار نے بتایا کہ جس باغ کے یہ امرود ہیں یہاں ایک قبرستان تھا، قبرستان میں ہل چلا کر امرود کا باغ لگایا گیا ہے۔

قطار در قطار درختوں پر اور چھتری کی طرح سایہ دار درختوں اور پودوں پر سائنس نے ریسرچ کی ہے اور یہ ریسرچ اب اتنی زیادہ ہو گئی ہے کہ زرعی یونیورسٹیاں قائم ہو گئیں، پودے کی دو اقسام ہیں، ایک وہ جو بیج میں سے دو پتے بن کر نمودار ہوتے ہیں، دوسری قسم یہ ہے کہ اس میں سے ایک پتہ نکلتا ہے، جب پودا جڑ پکڑ لیتا ہے تو یہ پتے سوکھ جاتے ہیں، نباتات میں بھی خلئے ہوتے ہیں، ہر خلیہ کی بیرونی دیوار آکسیجن، ہائیڈروجن اور کاربن سے تیار ہوتی ہے، اس بات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ جڑ کے آخری کنارے اور پوری جڑ پر ایک غلاف چڑھا ہوا ہوتا ہے، جڑ کی نوک میں اتنی طاقت ہوتی ہے کہ وہ سخت پہاڑوں کو بھی چیر کا نکل جاتی ہے۔

ہر شئے کی بنیاد پانی ہے، پانی کے اوپر ہر تخلیق کا پورا نظام چل رہا ہے، پانی نہ ہو تو زمین بے آب و گیاہ بنجر بن جائے گی۔ پودوں، درختوں اور نباتات کی، دوسری چیزوں کی نشوونما کے لئے نمی، ہوا اور گرمی کا ہونا ضروری ہے اس کے ساتھ ساتھ فاسفورس، پوٹاشیم اور نائٹروجن نہ ہو تب بھی نشوونما نہیں ہو گی اور یہ سب چیزیں قدرت نے پانی میں جمع کر دی ہیں۔ جب پانی زمین میں دوڑتا ہے تو جڑیں پانی چوس کر اپنے اندر جذب کر لیتی ہیں، درختوں کے ساتھ اگر پتے نہ ہوں تو انہیں درخت نہیں کہا جاتا۔ درختوں

کی زیبائش ہی پتوں کے ساتھ ہے لیکن یہ پتے صرف زیبائش کا ہی کام نہیں کرتے، ان کے اوپر درخت کی زندگی کا انحصار بھی ہے، ہر پتے میں رگیں ہوتی ہیں، مسامات ہوتے ہیں، یہ مسامات کاربن کو پتوں کی رگوں میں دوڑاتے ہیں اور یہی مسامات آکسیجن کو باہر نکالتے ہیں۔

پتوں کی بھی ایک پوری دنیا ہے، پتے درخت کو زندہ بھی رکھتے ہیں اور یہی پتے اگر بیمار ہو جائیں تو درخت بھی بیمار ہو کر ختم ہو جاتا ہے۔ یہی پتے جب زمین پر گرتے ہیں تو زمین کے اوپر نباتات کے لئے کھاد کا کام دیتے ہیں۔

انسان کے پاس کوئی طاقت نہیں ہے کہ وہ اتنی بڑی زمین پر کھاد ڈال سکے اور بارش برستی ہے، بجلی کڑکتی ہے، بجلی کی کڑک سے اور بارش کی بوندوں سے کھیتوں کو بیش بہا نائٹروجن مہیا ہوتی ہے۔ دنیا میں ہر چیز ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہے، ہر چیز دوسری چیز کے لئے ایثار کر رہی ہے، ہر چیز دوسری چیز کی خدمت میں مصروف ہے، پھولوں میں رنگ و بو بھنورے اور مکھیوں کو اپنی طرف کھینچ رہی ہیں۔

انجیر کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ انجیر کے درخت میں پھول نہیں لگتا، انجیر کے اندر ایک زوجین چھوٹا سا غنچہ ہوتا ہے، ایک خاص قسم کی بھڑ نر اور مادہ غنچوں میں انڈے دے جاتی ہے، جب بچے نکلتے ہیں تو انجیر مادہ انجیر میں چلے جاتے ہیں، بعض بیلیں براہ راست زمین سے غذا حاصل نہیں کرتی بلکہ دوسرے درختوں کے رس پر پلتی ہیں اور یہ درخت رفتہ رفتہ خشک ہو جاتے ہیں، درختوں کی جڑیں کیونکہ پانی جذب کر لیتی ہیں اس لئے زمین پر دلدل نہیں بنتی، فضاء جب درختوں کے سانس سے بھر جاتی ہے تو بادل وزنی ہو کر برسنے لگتے ہیں۔

حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے فرمایا:

''ریگستان میں اگر بے شمار بانس کھڑے کر دیئے جائیں اور ان بانسوں کو مختلف رنگوں سے رنگ دیا جائے تو قانون یہ ہے کہ ریگستان میں بارش برسے گی اور جب تک یہ بانس لگے رہیں گے تب تک بارش برستی رہے گی تا آنکہ ریگستان نخلستان اور جنگل میں تبدیل ہو جائے۔''

سمندر کی اندر کی دنیا پر غور کیا جائے تو وہاں بھی یہی نظام عمل کارفرما ہے ہر چیز دوسری چیز کے کام آ رہی ہے، ہر چیز دوسری چیز کی خوراک بن رہی ہے۔ غیر حقیقی طرز گفتگو یہ ہے کہ انسان گندم کھا رہا ہے جب کہ مشاہدات یہ ہیں کہ گندم کھانے والا انسان مر جاتا ہے اور گندم باقی رہتی ہے۔ حقیقی طرز تکلم یہ ہے کہ گندم انسان کو کھا رہی ہے۔

حیوانات کی زندگی کا دارومدار آکسیجن پر ہے اور نباتات کی زندگی کا انحصار کاربن پر، اگر آکسیجن کم ہو جائے تو حیوانات ہلاک ہو جائیں گے اور کاربن کا ذخیرہ نہ رہے تو نباتات فنا ہو جائیں گے۔ کائناتی سسٹم نے کاربن کو نباتات کی آکسیجن کو حیوانات کی غذا بنا دیا ہے۔ سائنسدانوں نے اندازہ لگایا ہے کہ حیوانات ایک سال میں ساٹھ کروڑ ٹن کاربن سانس کے ذریعے خارج کرتے ہیں جس میں بیس کروڑ ٹن خالص کوئلہ ہوتا ہے، اسی طرح حیوانات ایک سال میں آٹھ کھرب مکعب میٹر آکسیجن استعمال کرتے ہیں۔

الحمدللہ رب اللعالمین، ہر قسم کی تعریف اللہ کے لئے ہے جو ایسا منتظم اعلیٰ ہے جس نے عالمین کے لئے ایک مکمل نظام ربوبیت قائم کیا ہے، زمین کے اوپر موجود مخلوقات کی یہ بہت مختصر روئداد اس لئے لکھی گئی ہے کہ ہمارے اندر تفکر پیدا ہو، ہم یہ دیکھ سکیں اور سمجھ سکیں اور اس بات پر یقین کریں کہ نظام کائنات میں یہ قدر مشترک ہے کہ ہر چیز دوسری چیز سے ایک مخفی رشتے سے بندھی ہوئی ہے اور یہ مخفی رشتہ ایسا مضبوط رشتہ ہے کہ مخلوق میں سے کوئی ایک فرد بھی اس رشتے سے انکار نہیں کر سکتا اور نہ اس رشتے کو توڑ سکتا ہے۔ جب تک کوئی شئے دوسری شئے کے کام آرہی ہے اس کا وجود ہے ورنہ پھر وہ شئے مٹ جاتی ہے۔ یہ پورا نظام ہے جو پانی کی دنیا میں، فضاء میں، خلاء میں، آسمانوں میں اور انسانوں میں جاری و ساری ہے۔

قدرت یہ بھی چاہتی ہے کہ زمین کا کوئی خطہ کوئی حصہ قدرت کے فیض سے محروم نہ رہے۔ قدرت نے اس لئے درختوں کو دور دراز زمین تک پہنچانے کے لئے وسائل بنائے ہیں، ہوا نے بیجوں کو اپنے دوش پر بٹھا کر دور دراز مقامات تک پہنچایا، نالوں، ندیوں اور دریاؤں نے بیجوں اور جڑوں کو زمین کے ہر خطے تک پہنچا دیا۔ جب کوئی قوم اس سسٹم سے تجاویز کرتی ہے اور ایثار سے خود کو محروم کر دیتی ہے تو قدرت اس کو مٹا دیتی ہے۔

"اگر تم نے کائناتی سسٹم سے منہ پھیر لیا تو یہ زمین کسی اور کو قبضہ میں دے دی جائے گی۔"

(القرآن)

جو قوم غیروں کے دستر خوان کے لقموں پر پلتی ہے، محنت اور ایثار سے کام نہیں لیتی صرف دعاؤں اور وظیفوں میں مصروف رہتی ہے اور عملی اقدام نہیں کرتی وہ خشک درخت کی طرح ہو جاتی ہے جس کا کوئی سایہ نہیں ہوتا، جس پر کوئی پھل نہیں لگتا، وہ صرف جلانے کے کام آتا ہے، اس خوبصورت زمین پر صرف وہی قومیں باقی رہتی ہیں جو مظاہر فطرت کے جاری و ساری قانون سے واقف ہوں اور حیرت انگیز تخلیق اور نظام آفرینش کا مطالعہ کرتی ہوں، ظالم اور جاہل نہ ہوں، سب سے بڑا ظلم اور جہالت یہ ہے کہ انسان کو یہ معلوم نہ ہو کہ آسمانی دنیا کا مشاہدہ کئے بغیر کوئی قوم کائناتی سسٹم سے واقف نہیں ہوتی اور اپنی ذات کا عرفان نہ ہو تو انسان اور حیوان ایک گروہ کے دو افراد ہیں۔

انسان کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ زمین کے خزانوں کو استعمال کئے بغیر کوئی قوم زندہ نہیں رہ سکتی، زمین کے خزانوں کے استعمال کا عمل اور طریقہ قرآن میں تفکر اور زندگی میں ایثار کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور اس کی مثال ہمارے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کا یقین و ایثار ہے۔‘‘

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے باطل عقائد کی تکذیب کی، کائنات میں تفکر اور اللہ وحدہ لاشریک کی پرستش کو اپنے لئے، اپنی اولاد کے لئے اور اپنی امت کے لئے منتخب کیا تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

’’میں تجھے بنانے والا ہوں انسان کے لئے امام۔‘‘

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی اولاد کے لئے پوچھا تو فرمایا:

’’تیری اولاد میں سے ظالم لوگ محروم ہو جائیں گے۔‘‘

(القرآن، سورۃ بقرہ)

احسن الخالقین

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بیان فرمایا ہے کہ:

''انسان ہماری بہترین صناعی ہے۔''

بہترین صناعی کا مفہوم یہ ہے کہ کائنات میں جتنی بھی مخلوقات ہیں انسان ان سب سے افضل ہے، انسان کو مخلوقات میں فضیلت اس بنیاد پر قائم ہے کہ اس کے اندر مخفی علوم جاننے، سمجھنے اور ان سے استفادہ کرنے کے لئے صلاحیتیں موجود ہیں۔ اب سے صدیوں پہلے کی سائنسی ایجادات ہوں یا موجودہ دور میں سائنسی ایجادات، یہ سب دراصل مخفی صلاحیتوں کے استعمال کا مظاہرہ ہیں، زمین پر موجود ہر شئے روشنی کے غلاف میں بند ہے اور روشنی کے غلاف میں مقداریں کام کر رہی ہیں۔ انسان جب مخفی صلاحیتوں کو بیدار کر کے کسی شئے میں خواہ وہ ایٹم ہی کیوں نہ ہو تفکر کرتا ہے تو اس کے اوپر کی شئے کے اندر چھپی ہوئی قوتوں کا انکشاف ہوتا ہے، موجودہ سائنسی ترقی بھی اسی ضابطے اور قاعدے پر قائم ہے۔

سائنسدانوں نے جیسے جیسے تفکر سے کام لیا ان کے اوپر شئے کے اندر کام کرنے والی تخریبی اور تعمیری قوتیں آشکار ہو گئیں۔ جس کے نتیجے میں ایٹم کے بارے میں سائنسدانوں کا یہ خیال ہے کہ کائنات میں جتنی بھی اشیاء ہیں خواہ وہ مائع ہوں یا ٹھوس ہوں یا گیس کی صورت میں ہوں، سب کی سب ایٹموں سے بنی ہوئی ہیں اور خود ایٹم زیادہ تر خلاء پر مشتمل ہے، بعض اشیاء میں تمام کے تمام ایٹم ایک جیسے ہوتے ہیں، ایسی اشیاء کو عناصر کہا جاتا ہے جن میں ہائیڈروجن، کاربن، لوہا، سونا، سیسہ اور یورینیم جیسے قدرتی عناصر اور پلاٹینم جیسے انسان کے بنائے ہوئے عناصر شامل ہیں۔ عناصر کے علاوہ مرکبات میں مختلف عناصر کے ایٹم ایک دوسرے میں جذب اور گندھے ہوئے ہوتے ہیں اس طرح عناصر کی باہمی پیوستگی سے باضابطہ اور باقاعدہ سانچے میں ڈھلے ہوئے سالمات بنتے ہیں۔

ایٹم یونانی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی ناقابل تقسیم شئے کے ہیں، یونانی زبان میں ٹوم تقسیم کرنے کو کہتے ہیں، آریائی زبانوں میں ''آ'' نفی کا کلمہ ہے۔ ایٹم کا نام دمقراط نامی سائنسدان کا وضع کردہ ہے، دمقراط نے یہ نظریہ پیش کیا کہ دنیا کی ہر شئے نہایت چھوٹے چھوٹے ناقابل تقسیم ذروں یعنی ایٹموں سے بنی ہوئی ہے۔ ایٹم کا سائز ایک انچ کا ڈھائی کروڑواں حصہ یا ایک سینٹی میٹر کا ایک کروڑواں حصہ ہوتا ہے۔ چھوٹی سوئی کی نوک پر لاکھوں ایٹم رکھے جا سکتے ہیں، ہلکی اشیاء کے ایٹم ہلکے اور بھاری اشیاء کے ایٹم

بھاری ہوتے ہیں۔ بشمول انسان تمام جانداروں کی روح بھی ایٹوں سے مرکب ہے، روح کے ایٹم باقی تمام تر اشیاء کے ایٹموں سے چھوٹے اور لطیف ہوتے ہیں۔

موت کے بارے میں دمقراط کا خیال تھا کہ جب روح کے تمام ایٹم جسم سے نکل جاتے ہیں تو موت واقع ہو جاتی ہے، اس حالت میں جسم میں روح کا ایٹم بھی باقی نہیں رہتا جو خارج شدہ ایٹوں کو واپس لا سکے، اس لئے روح نکل جانے کے بعد آدمی زندہ نہیں رہ سکتا۔ ایٹم پر ریسرچ کرنے والے محققین نے تحقیق کی ہے کہ ہر ایٹم میں الیکٹران کی تعداد مختلف ہوتی ہے، الیکٹران ایک ترتیب اور توازن سے مرکز کے گرد تہہ در تہہ مداروں میں گردش کرتے رہتے ہیں، الیکٹران کی گردش کے حوالے سے یہ سوالات ابھرے کہ وقت کے ساتھ ساتھ الیکٹران بتدریج تھکتے کیوں نہیں، ان کی توانائی میں کمی کیوں نہیں ہوتی؟ وہ تھک کر ٹوٹ پھوٹ کر مرکزے میں کیوں نہیں گر جاتے؟ ان سوالات کا یہ جواب دیا گیا کہ:

الیکٹران مرکزے کے ارد گرد توانائی کے مختلف سطحوں پر ایک خاص ترتیب سے بکھرے ہوئے گھوم رہے ہیں وہ ایک سطح سے چھلانگ لگا کر دوسری سطح میں داخل ہو سکتے ہیں لیکن دو سطحوں میں معلق نہیں رہ سکتے، جب کوئی ایٹم کسی بھی قسم کی شعاع "حرارت" کو کاسمک ریز روشنی کی شعاعوں کے زیر اثر آ جاتا ہے تو اس کے الیکٹرانوں میں توانائی آ جاتی ہے اور وہ چھلانگ لگا کر واپس قریب کی نچلی سطح میں آ جاتے ہیں، توانائی ضائع یا فنا نہیں ہوتی اس لئے وہ روشنی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے، روشنی کا طول موج توانائی کی اس مقدار کے مطابق ہوتا ہے جو الیکٹران نے قبول کی تھی۔ ایٹم کی تحقیق میں ایک نئے باب کا اضافہ اس انکشاف سے ہوا کہ بعض عناصر سے شعاعوں کی صورت میں توانائی خود بخود خارج ہوتی رہتی ہے ایسے عناصر میں دریافت ہونے والا سب سے پہلا عنصر یورینیم تھا لیکن توانائی کا اس سے بڑا منبع ریڈیم ہے۔

پائرے کیوری اور مادام کیوری نے دریافت کیا کہ ریڈیم سے شعاعیں نکلتی ہیں یعنی ریڈیم تابکار دھات ہے۔ یہ شعاعیں دیکھی جا سکتی ہیں اور ان کی پیمائش بھی کی جا سکتی ہے۔

لارڈ تھر فورڈ فریڈرک سوڈی کے نظریہ سے اب تک کی جانے والی ایٹم کی تعریف تبدیل ہو گئی ہے، سینکڑوں برس سے یہ کہا جا رہا ہے کہ ایٹم ناقابل تقسیم ہے لیکن انہوں نے ثابت کر دیا کہ ایٹم قابل تقسیم ہے، انہوں نے ثابت کیا کہ ریڈیم کا ایٹم مسلسل انتشار اور تقسیم در تقسیم کی حالت میں رہتا ہے، فعال ذرات ایک طرف ہو جاتے ہیں اور ایک ہلکا پھلکا ایٹم باقی رہ جاتا ہے جو طبعی اور کیمیائی لحاظ سے اصلی ریڈیم سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔

ایٹم پر ریسرچ کرنے والی لیبارٹری میں مصروف کار سائنٹسٹوں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ ایٹم کی اندرونی صورتحال پیش کرنے والی تصاویر اتار لی گئی ہیں، اس سلسلے کا پہلا فوٹو پینسلوانیا یونیورسٹی کی جانب سے جاری کیا گیا ہے۔ یہ تصویر اصل سائز سے دو لاکھ پچہتر ہزار گنا بڑی کر کے دکھائی گئی۔

تحقیق و تجربات سے یہ بات سامنے آئی کہ مادہ اور توانائی ایک ہی شئے کے دو روپ ہیں کیونکہ یہ تمام ذرات جواب تک معلوم کئے گئے ہیں، توانائی کی صورت میں سامنے آئے ہیں یعنی ان بنیادی ذرات پر تجربات سے یا ان کی تقسیم اور ٹوٹ پھوٹ سے آخر کار توانائی ہی حاصل ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ مالیکیولز، ایٹم یا بنیادی ذرات جواب تک دیکھے نہیں جا سکے ہیں ان کے بارے میں اتنی مفصل معلومات کن بنیادوں پر حاصل کی گئی ہیں؟ سائنسدان اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ تجربات کے نتائج سے حاصل ہونے والے تاثر یا خصوصیت کے مظاہرے کی صورت میں یہ اخذ کیا گیا ہے کہ ایٹم اور اس کے ذرات کیا ہیں؟ مثلاً ٹی وی اسکرین پر جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ الیکٹران کے ذرات کے بہاؤ کی وجہ سے ہوتا ہے جبکہ الیکٹران یا الیکٹران بیم دکھائی نہیں دیتی، اس طرح تجربات میں ایٹم کو جب کسی بیرونی قوت یا شعاع کے زیر اثر لایا جاتا ہے تو ایٹمی ذرات پر اس کی اثر پذیری کے نتائج ایک اسکرین پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسکرین پر نظر آنے والا یہ عمل اسکرین کے دھبے، رنگ یا ٹمٹماہٹ کی صورت میں ہوتا ہے۔ روشنی کا دھبہ گہرا ہوتا ہے، بڑا ہوتا ہے، چھوٹا ہوتا ہے، رنگ میں ٹمٹماہٹ کی صورت میں ہوتا ہے اس طرح ذرات کی خصوصیات معلوم کر لی جاتی ہیں۔

الیکٹران ایک ایسا دھبہ ہے جواب تک ناقابل تقسیم ہے، باقی دونوں ذروں کا قابل تقسیم ہونا ثابت کیا جا چکا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا:

''اور جو بہت سی رنگ برنگ کی چیزیں اس نے تمہارے لئے زمین میں پیدا کر رکھی ہیں ان میں نشانی ہے ان کے لئے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں یعنی ریسرچ کرتے ہیں۔''

''اللہ روشنی ہے آسمانوں اور زمین کی۔''

''چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس کی قرآن میں وضاحت نہ ہو۔''

''اے پیغمبر! کہہ دیجئے کہ اس کتاب کو اس نے اتارا ہے جو زمین و آسمان کے بھیدوں کو جاننے والا ہے۔''

یعنی کائنات کا ایک ایک ذرہ یعنی اس کا ایک ایک ایٹم اور اس کا ایک ایک سالمہ اس کے علم میں ہے۔

"پاک اور بلند مرتبہ ہے وہ ذات جس نے مقداروں کے ساتھ تقسیم کیا اور پھر اس تخلیقی فارمولے سے آگاہ کیا۔"

اس کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر شئے کو معین مقداروں (ایٹم) سے بنایا اور یہ معین مقداریں دراصل اس شئے کے ظاہر و باطن میں کام کرنے والی صلاحیتیں جو ایک قانون اور نظم کے تحت ایک واحد ہستی کی نگرانی میں برقرار ہیں، بڑے بڑے اجرام سماوی معمولی اور ننھے سے ایٹم، ایٹم کے اندرونی خول یا اجراء، الیکٹران، پروٹان، نیوٹران اس ذات واحد کی نظر کے سامنے ہے، کوئی بھی ذرہ ہو وہ چھوٹا ہو یا بڑا اس کے احاطہ قدرت سے باہر نہیں ہے۔

قرآن پاک میں ہے:

"وہ ہر پوشیدہ چیز سے واقف ہے، اس کے علم سے کوئی رتی برابر چیز بھی باہر نہیں، وہ چیز آسمان میں ہوں یا زمین میں اور ان تمام چھوٹی بڑی چیزوں کا اور چیزوں کی تمام اقسام کے فارمولے کھلی کتاب میں موجود ہیں۔"

(سباء۔۳)

سورۃ سباء کی اس آیت میں تین قسم کے ذرات کا بیان ہوا ہے

۱۔رتی برابر ذرہ

۲۔اس سے چھوٹا

۳۔نسبتاً اس سے بڑا

تخلیق میں تین قسم کے ذرات پائے جاتے ہیں۔

۱۔ایٹم

۲۔ایٹم کے اندرونی اجزاء

۳۔سالم ایٹم کے مرکبات

۱۔مثقال ذرہ یونی وہ رتی برابر چیز جس میں وزن ہے، جب ہم مادی تخلیق یا کسی بھی عنصر کا تذکرہ کرتے ہیں یا میٹر کا لفظ استعمال کرتے ہیں اس کا مطلب یہی ہے کہ وہ چیز جس میں وزن ہو اور معین مقدار یا مقداریں ہوں، ایٹم چونکہ ایک ایسی اکائی ہے جس کے اندر الیکٹران، پروٹان اور نیوٹران موجود ہوتے ہیں، اس لئے اس میں مقدار اور وزن دونوں ہیں۔ فزکس کے طلباء و طالبات یہ

جانتے ہیں کہ ایٹم کا وزن کر لیا گیا ہے، ہائیڈروجن کے ایک ایٹم کا وزن اس کے ایک گرام مقدار کا ایک ہزار چوبیسواں حصہ ہوتا ہے، بتایا جاتا ہے کہ ایک گرام مادے میں کھربوں ایٹم ہوتے ہیں۔''

۲۔اس سے چھوٹا یعنی ایٹم سے نسبتاً چھوٹا، الیکٹران، پروٹان اور نیوٹران وغیرہ اور ایٹموں کے مرکزوں سے خارج ہونے والی الفا، بیٹا اور گیما شعاعیں۔

۳۔اور اس سے بڑا یعنی ایٹم سے بڑا یعنی قیامت تک دریافت ہونے والے ہر ایٹم کے ذرات اور اجزاء خواہ وہ کتنے ہی چھوٹے ہوں اور کتنے ہی بڑے ہوں، قرآن میں تفکر کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایٹم کا خالق، ایٹم کے اندرونی اجزاء کا خالق ارض و سماء کا خالق ایک ہے اور پوری کائنات میں اس کی ملکیت ہے، اس نے کائناتی سسٹم کو ایک ضابطے کے ساتھ تخلیق کیا ہے اور ہر چیز کو معین مقداروں کے ساتھ وجود بخشا ہے، مقداروں کا یہ علم وہ لوگ حاصل کر لیتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے مطابق:

''اور جن لوگوں نے میرے لئے یعنی میری تخلیق کو جاننے کے لئے جدوجہد اور کوشش کی، میں انہیں اپنے راستے دکھاتا ہوں۔''

اللہ نے قرآن شریف میں لوہے کی (دھات) کا تذکرہ کیا ہے۔

''ہم نے نازل کیا لوہا (اس میں دوسری دھاتیں بھی شامل ہیں جیسے یورینیم وغیرہ) اور ہم نے اس میں انسانوں کے لئے بے شمار طاقت اور فائدے رکھ دیئے ہیں۔''

زمین کے اوپر جتنی گیس یا دھاتیں موجود ہیں ان کی پہچان ان مقداروں کی وجہ سے ہے جن مقداروں سے ان کی تخلیق ہوئی ہے۔

ہم جب لوہے کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس میں جو مقداریں کام کرتی ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔35-42-30-48-24-59-62

اور جب ہم سونے کا تذکرہ کرتے ہیں تو اس کی مقداریں یہ ہیں۔

۲۔3-35-31-50-51

اگر کوئی صاحب بصیرت ان مقداروں سے واقف ہو جائے جو اشیاء کی تخلیق میں کام کر رہی ہیں تو وہ مقداروں کو کم و بیش کر کے شئے میں ماہیت قلب کر سکتا ہے، مقداروں کا علم اس طرف اشارہ کرتا ہے کہ دھات، سیسہ میں ایسی مقداریں موجود ہیں جو ایٹم کی قوت پر غالب آسکتی ہیں، یہ دونوں دھاتیں تسویدی لہروں سے فیڈ ہوتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

"زمین اور آسمان اور اس کے اندر جو کچھ ہے سب کا سب انسانوں کے لئے مسخر کر دیا گیا ہے۔"

اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان زمین و آسمان میں موجود کسی بھی شئے کے اندر جب تفکر کرے گا تو اس شئے کے اندر کام کرنے والی مقداروں کا علم بھی اسے حاصل ہو جائے گا، مذہبی دانشور اس آیت کی تفسیر میں ارشاد فرماتے ہیں کہ :

"زمین، آسمان، چاند، سورج، ہوا اور پانی کو ہماری خدمت گزاری کے لئے معمور کر دیا گیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ چاند، سورج، زمین صرف انسانوں کی خدمت گزاری میں مصروف نہیں ہے، زمین پر موجود ہر مخلوق کی خدمت گزاری میں مصروف ہیں۔ جس طرح ایک انسان سورج کی روشنی اور چاند کی چاندنی سے فائدہ اٹھاتا ہے اس طرح پرندے، درندے، چرندے اور اشجار بھی فائدہ اٹھاتے ہیں یعنی چاند، سورج، زمین پر موجود تمام مخلوق کی خدمت گزار ہیں۔ محکوم و مسخر ہونے سے مراد یہ ہے کہ انسان کو ان مقداروں کا علم عطا کر دیا گیا ہے، جن مقداروں پر چاند، سورج، زمین، فرشتے، جنات، نباتات و جمادات قائم اور متحرک ہیں۔

مختصر یہ کہ ایٹم مقداروں کا ایک مرکب ہے اور یہ مقداریں مادیت کی اکائی ہیں، مادیت کی ہر اکائی نور کے غلاف میں بند ہے، نور کے اوپر روشنی کا غلاف ہے، روشنی کی رفتار ایک سیکنڈ میں دولاکھ چھیاسی ہزار دو سو بیاسی میل بتائی جاتی ہے، روشنی کی رفتار سے ہزاروں گنا نورانی لہروں کی رفتار ہے۔ نور اور روشنی مرکب اور مفرد لہروں کا ایک جال ہے جس کے اوپر چھوٹے سے چھوٹا اور بڑے سے بڑا ذرہ بنا ہوا ہے۔

فکر جب روشنی کی سطح سے نکل کر نور کی سطح میں داخل ہو جاتا ہے تو چھوٹے سے چھوٹا ذرہ اور اس کے اندر ناقابل بیان طاقت انسانی ذہن پر منکشف ہو جاتی ہے، اس انرجی کو تعمیر اور تخریب دونوں میں استعمال کیا جا سکتا ہے۔

موجودہ سائنسی ترقی میں جو عوامل کام کر رہے ہیں ان میں انفرادی سوچ اور مادی مفاد کا عمل دخل ہے اس لئے یہ ساری ترقی نوع انسانی کے لئے ہلاکت کا پیش خیمہ بن گئی ہے، اگر یہی ترقی اور ایجاد قرآن و حکمت اور پیغمبرانہ طرز فکر کے مطابق ہو تو سائنس نوع انسانی کے لئے سکون اور روشنی کا گہوارہ بن جائے گی، فی الواقع صورتحال یہ ہے کہ ترقی کا فسوں انسانی نسل کو آتش فشاں کے کنارے لے آیا ہے۔ یہ دنیا کسی بھی وقت بھک سے اڑ جائے گی اس لئے کہ جو چیز بن جاتی ہے اس کا استعمال اور مظاہرہ ضرور ہوتا ہے۔

نور کروڑ میل

کائنات کے وجود کے بارے میں اور کائناتی وجود کی تاویلات، تشریحات میں انسانی ذہن صدیوں سے سر گرداں ہر انسان جس میں تھوڑی سی بھی علمی شدبد ہے وہ یہ جاننا چاہتا ہے کہ:

کائنات کیا ہے؟

کیوں ہے؟

اور کہاں ہے؟

کائنات کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اور کہاں ہے؟ میں انسان کی اپنی ذات کی تفہیم بھی آجاتی ہے جو انسان کائنات کے بارے میں سمجھنا چاہتا ہے وہ اپنے بارے میں یہ سوچتا ہے:

میں کیا ہوں؟

میں کیوں ہوں؟

کہاں ہوں؟

انسانی وجود دنیا میں پیدائش سے پہلے کہاں تھا؟ انسانی وجود اس دنیا سے گزرنے کے بعد جہاں چلا جاتا ہے وہاں جزا اور سزا کا قانون کس طرح نافذ العمل ہے، یہ بھی سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب انسان خود پیدائش پر اختیار نہیں رکھتا، موت پر اسے کسی قسم کی دسترس حاصل نہیں ہے تو اعمال کی جزا و سزا میں کون سا قانون کام کرتا ہے، دنیا میں آنے کے بعد کوئی بھی انسان شعور کے دائرے میں داخل ہوتے ہی چاند، سورج اور ستاروں میں دلچسپی لینا شروع کر دیتا ہے، قدیم قصے کہانیوں اور لوک داستانوں میں اجرام فلکی و سماوی کے تذکرے ملتے ہیں، مسلسل تذکروں اور تلاش نے انسان کے اندر جذبہ ابھارا کہ وہ تلاش کرے چاند اور سورج کیا ہیں؟ کیا انسان چاند اور سورج کے رشتے کو استوار کر سکتا ہے؟ کیا کسی طرح سورج اور چاند میں فلکی نظام میں موت کے بغیر انسان کا داخلہ ممکن ہے؟

اس جذبہ تلاش اور جستجو نے انسان کو اس طرف مائل کر دیا کہ چاند کی سیر کی جائے۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ انسان نے سورج اور کہکشانی نظاموں کے بجائے فلکی نظاموں یا غیب کی دنیا میں داخل ہونے کے بجائے چاند کا انتخاب کیوں ہو سکتا ہے کہ چاند کا انتخاب اس لئے کیا گیا ہو کہ چاند زمین سے سورج کے مقابلے میں کم فاصلے پر واقع ہے، سورج کا فاصلہ نو کروڑ میل بتایا جاتا ہے جبکہ چاند کا فاصلہ لاکھوں میل متعین کیا گیا ہے۔

سورج کا نو کروڑ میل کا فاصلہ اور چاند کا لاکھوں میل کا فاصلہ کس اصول پر کونسے حساب سے یا کس جدول سے متعین کیا گیا ہے؟ اس بارے میں انسانی تاریخ گونگی بہری ہے، بہر حال انسان نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ بیسویں صدی میں وقت اور فاصلوں کی نفی کر کے انسان چاند پر پہنچ گیا جس کو تسخیر کائنات کی معراج سمجھا جاتا ہے، مگر یہ المیہ ہر ذی شعور آدمی کے سامنے ہے کہ چاند پر پہنچنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ تسخیر کائنات کا سفر گرد آلود ہو گیا، اگرچہ تسخیر کائنات کے مضمون پر ضخیم کتابیں لکھی جا چکی ہیں اور لکھی جا رہی ہیں۔

کائنات کیا ہے؟ ہر وہ چیز جو اللہ تعالیٰ نے تخلیق کی ہے اور انسان کو حواس خمسہ کے ذریعے جن چیزوں کا ادراک ہوتا ہے، کائنات کہلاتی ہے لیکن ہمارا مشاہدہ ہے کہ حواس خمسہ محدود دائرے میں کام کرتے ہیں۔ کائنات کا بہت بڑا حصہ تین چوتھائی سے بھی زیادہ بڑا حصہ ایسا حصہ ہے جہاں حواس خمسہ کام نہیں کرتے۔ نہ صرف یہ کہ حواس خمسہ ناکام ہیں بلکہ وہم و خیال میں بھی کائنات کا حقیقی تصور قائم نہیں ہوتا اور اس طرح انسان مفروضات اور تاریک راہوں میں بھٹکنا شروع کر دیتا ہے، فی الواقع کائنات کا علم اتنا وسیع ہے کہ انسان کے اندر کام کرنے والے حواس خمسہ کی کسی طرح بھی پہنچ ممکن نہیں۔

صاحبان بصیرت اور اپنے اندر ملکوتی صفات کے عارف بندے جب کائنات کی تخلیق پر غور کرتے ہیں تو وہ ایک ہی بات کا اعلان کرتے ہیں کہ کائنات کی بے پناہ وسعتوں کا احاطہ زمینی شعور سے ممکن نہیں کیونکہ (حواس خمسہ) محدود ہیں اور کائنات لامحدودیت کی ایسی اکائی ہے جس میں داخل ہوئے بغیر انسان کائنات کا مشاہدہ نہیں کر سکتا۔

نظریات بنتے رہتے ہیں اور مزید نظریات قائم ہوتے رہتے ہیں لیکن جب تک محدود عقل و شعور ان کا ساتھ دیتے رہے یہ نظریات قائم رہے جب محدود عقل و شعور نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تو یہ نظریات خود بخود ختم ہو گئے۔ قرآنی طرز فکر اور اسلوب میں بیان کائنات کی تخلیق پر اور کائنات کے اندر ہماری زمین کی طرح اربوں اور کھربوں زمینوں کا مشاہدہ کرنے کے لئے جو لوگ غور و فکر کرتے ہیں قرآن انہیں ''اولی الباب'' کہتا ہے۔

''بلاشبہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق میں اور دن رات کے ردوبدل میں اولی الباب کے لئے نشانیاں ہیں۔''

(آل عمران۔۱۹۰)

اولی الباب کون لوگ ہیں؟

قرآن کے مطابق اولی الباب وہ لوگ ہیں جو اٹھتے بیٹھتے کروٹ پر لیٹتے اللہ کو یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

''اے ہمارے رب! آپ نے ہم کو بے کار پیدا نہیں کیا۔ آپ کی ذات پاک ہے آپ ہم کو نار کے عذاب سے بچالیجئے۔''

(آل عمران۔۱۹۱)

اولی الباب کا مطلب ہے ایسا سمجھدار انسان جو آسمان و زمین کی تخلیق، کائناتی نظام، وسائل کی پیدائش، انسانی زندگی میں کام آنے والی انرجی اور توانائی پر غور و فکر کرتا ہے، اولی الباب جب تخلیق کے چھوٹے چھوٹے ادوار (بچپن، لڑکپن، جوانی، بڑھاپے اور موت) پر تفکر کرتا ہے تو اس کے اندر یقین کا پیٹرن بن جاتا ہے کہ کائنات کو بنانے والی کوئی ہستی ہے اور یہی ہستی کائنات پر حاکم و مالک اور قادر ہے، ان کی طرز فکر میں خالق کائنات کی ہستی اس طرح جذب ہو جاتی ہے کہ وہ جان لیتے ہیں کہ ہم اس لئے زندہ ہیں کہ ہمارے خالق نے ہمیں تحفظ دیا ہوا ہے، وہ یہ بھی دیکھ لیتے ہیں کہ اللہ ان کے اندر موجود ہے، انہیں یہ بھی علم ہو جاتا ہے کہ کائنات کا ہر ذرہ نور کے غلاف میں بند ہے، ایسا نور جو حواس خمسہ سے نظر آتا ہے، ایسی روشنی جو حواس خمسہ کے ادراک سے ماورا ہے۔

اس تمہید کا مطلب یہ ہوا کہ کائنات کا کھوج لگانے والے دو گروہ ہیں۔

ایک گروہ محدود حواس خمسہ میں کائنات کو تلاش کرتا ہے، کائنات کے اربوں کھربوں اسرار میں سے چند اسرار پر سے تو پردہ اٹھ سکتا ہے لیکن محدود اور مفروضہ حواس میں سے کوئی آدمی وسیع و عریض کائنات کو نہیں دیکھ سکتا اور نہ کوئی کائناتی وسعتوں میں داخل ہو سکتا ہے، اس کے برعکس اولی الباب (وہ لوگ جو مفروضہ حیات سے نکل کر لامحدود حواس میں داخل ہو جاتے ہیں) جب تفکر کرتے ہیں تو لامحدود کائنات ان کے سامنے آجاتی ہے، آج کی سائنس انسانی شعوری ارتقاء کی معراج سمجھی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سائنس نے انسان کے شرف کی تکمیل کر دی ہے۔

یہ کیسی تکمیل ہے کہ ہر انسان پریشان ہے، آسائش و آرام کے لئے جتنی چیزیں ایجاد کی جا رہی ہیں یا ہو چکی ہیں انہوں نے زندگی کو عذاب بنا دیا ہے۔ ہر گھر بے سکونی اور پریشانی کا ٹارچر سیل بن گیا ہے۔ یہ عجیب منطق ہے آرام و آسائش کا ہر سامان میسر ہونے کے باوجود آدمی پریشان ہے، بیمار ہے۔ جیسے جیسے سائنسی ایجادات اور مادی ترقی معرض وجود میں آرہی ہے اسی مناسبت سے بیماریاں بھی ترقی پذیر ہیں، بے سکونی اور پریشانی کے عفریت نے انسان کو ڈس لیا ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ سائنسی ایجادات نوع انسانی کے لئے فائدہ مند نہیں ہیں یا سائنسی ایجادات میں مزید وسعت نہیں ہونی چاہئے، ہم ان حقائق پر سے پردہ اٹھانا چاہتے ہیں جو اس ترقی کے پیچھے نوع انسانی کی ہلاکت کا سبب بن رہی ہے اور یہ ہلاکت ہے کہ سائنسی

ایجادات کا محور مادیت ہے، اگر سائنٹسٹ کائنات کی تخلیق پر تفکر کر کے ایجادات کا رخ خالق کائنات کی طرف پھیر دیں تو یہ دنیا خوشحال بن جائے گی۔ چھوٹی سے چھوٹی عقل والا آدمی اور بڑے سے بڑا دانشور اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ سائنسی ایجادات قدرت کے پیدا کردہ وسائل کے تابع ہیں اور جتنے بھی وسائل زمین پر موجود ہیں ان میں جڑی بوٹیاں، جڑی بوٹیوں سے فائدہ اٹھانے کے لئے مشینیں، مشینوں کے لئے میٹیریل، ہوا، پانی، گیس، روشنی، قدرت نے ہر چیز ہر شخص کے لئے مفت فراہم کی ہے۔ انسانی ذہن مفروضہ حواس سے نکل کر اولی الباب کے زمرے میں داخل ہو جائے تو انسان حقیقت آشنا ہو جائے گا تو یہ زمین جنت ارضی بن جائے گی۔ کائنات کی ہر تخلیق ہر گز عظیم حادثہ نہیں ہے، کائنات سوچے سمجھے منصوبہ اور بہترین پروگرام کے ساتھ تخلیق کی گئی ہے، کائنات عظیم تر ذات اللہ کے حکم سے بنی ہے اور قادر مطلق اللہ کے حکم سے قائم ہے۔

سورہ حشر کی آیت میں ارشاد ہے کہ:

''اللہ ہی پیدا کرنے والا ہے، ٹھیک ٹھاک بنانے والا، صورت بنانے والا۔ اس کے اچھے اچھے نام ہیں، سب چیزیں اس کی تسبیح کرتی ہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہے اور اللہ ہی زبردست حکمت والا ہے۔''

پیغمبرانہ طرز فکر

''قسم ہے زمانہ کی انسان خسارے اور نقصان میں ہے مگر وہ لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جو رسالت اور قرآن کی تعلیمات کو اپنا کر اس پر عمل پیرا ہو گئے۔''

(القرآن)

پیدائش کے بعد انسان کا تعلق تین نظاموں سے ہے، پہلا نظام وہ ہے جہاں اس نے خالق حقیقی کو دیکھ کر اس کی منشاء کو پورا کرنے کا عہد کیا، دوسرا نظام وہ ہے جس کو ہم عالم ناسوت دار العمل یا امتحان گاہ کہتے ہیں اور تیسرا نظام وہ ہے جہاں انسان کو امتحان کی کامیابی یا ناکامی سے باخبر کیا جاتا ہے، انسان کی کامیابی یا ناکامی کا دارومدار اس پر ہے کہ وہ یہ جان لے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے سامنے عہد کیا ہے کہ اللہ اس کا خالق اور رب ہے، علمائے باطن کہتے ہیں کہ انسان ستر ہزار پرت کا مجموعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق انسان جب عالم ناسوت میں آتا ہے تو اس کے اوپر ایک ایسا پرت غالب آ جاتا ہے جس میں سرکشی، بغاوت، عدم تحفظ، عدم تعمیر، کفران نعمت، ناشکری، جلد بازی، شک، بے یقینی اور وسوسوں کا ہجوم ہوتا ہے، یہی وہ ارضی زندگی ہے جسے قرآن پاک نے اسفل السافلین کہا ہے، انبیاء کرام کی تعلیمات یہ ہیں کہ پوری کائنات میں دو طرزیں کام کر رہی ہیں، ایک طرز اللہ کے لئے پسندیدہ ہے اور دوسری اللہ کے لئے ناپسندیدہ ہے، وہ ناپسندیدہ طرز جو بندے کو اللہ سے دور کرتی ہے اس کا نام شیطنیت ہے اور وہ پسندیدہ طرز فکر جو بندے کو اللہ کے قریب کرتی ہے اس کا نام رحمت ہے۔

روحانیت کے راستے پر چلنے والے مبتدی کے ذہن میں یہ بات راسخ ہوتی ہے کہ انسان کا کردار اس کی طرز فکر سے تعمیر ہوتا ہے، طرز فکر اگر پر پیچ ہے تو آدمی کا کردار بھی پر پیچ بن جاتا ہے، طرز فکر البتہ قانون کے مطابق راست ہے تو بندے کی زندگی میں سادگی اور راست بازی کارفرما ہوتی ہے، طرز فکر اگر سطحی ہے تو بندہ سطحی طریقہ پر سوچتا ہے، طرز فکر میں گہرائی ہے تو بندہ شئے کی حقیقت جاننے کے لئے تفکر کرتا ہے۔

حقیقت پسندانہ طرز فکر ہر آدمی کے اندر موجود ہے لیکن ہر آدمی اسے استعمال نہیں کرتا، آدمی دیکھتے اور سمجھتے ہوئے بھی غیر حقیقی باتوں کو اصل اور حقیقی سمجھتا ہے، سالک جب راہ سلوک میں قدم بڑھاتا ہے تو والدین اور معاشرے سے ملی ہوئی غیر حقیقی طرز فکر

تبدیل ہو جاتی ہے، جس قسم کا ماحول ہوتا ہے اسی قسم کے نقوش کم وبیش ذہن میں نقش ہو جاتے ہیں، جس حد تک یہ نقوش گہرے ہوتے ہیں اسی مناسبت سے انسانی زندگی میں طرز فکر کی تشکیل ہوتی ہے، ماحول اگر ایسے کرداروں سے بنا ہے جو ذہنی پیچیدگی، بے یقینی، بد دیانتی، تخریب اور ناپسندیدہ اعمال کا مظاہرہ کرتے ہیں تو فرد کی زندگی پریشانی میں مبتلا ہو جاتی ہے، ماحول میں اگر راست بازی اور اعلیٰ اخلاق کی قدریں موجود ہیں تو ایسے ماحول میں پروان چڑھنے والا شخص پاکیزہ نفس اور حقیقت آشنا ہوتا ہے، سب جانتے ہیں کہ مادری زبان سیکھنے کے لئے بچے کو قائدہ نہیں پڑھانا پڑتا، شک اور بے یقینی کا پیٹرن جس طرح بچے کے اندر ماحول سے خود بخود منتقل ہو جاتا ہے اسی طرح پاکیزہ ماحول اور روحانی استاد کی قربت سے سالک کے اندر یقین کا پیٹرن بن جاتا ہے۔

جتنے بھی پیغمبر تشریف لائے سب کی طرز فکر یہ تھی کہ ماورائی ہستی کے ساتھ ہمارا رشتہ قائم ہے۔ یہی روحانی طرز فکر ہے اور یہی رشتہ کائنات کی رگ جان ہے۔ روحانی طرز فکر مسلسل ایک عمل ہے جو سالک کے اندر خون کی طرح دوڑتا رہتا ہے، اس عمل میں بڑی رکاوٹ صدیوں پرانی وہ روایات ہیں جن کے مطمع نظر مادیت ہے، آدمی جس ماحول میں جمع ہوتا ہے وہ ماحول قبیلوں اور خاندانوں کی روایات بن جاتی ہیں، روایات کے امین والدین ہوتے ہیں۔ بھائی بہن ہوتے ہیں، کنبہ برادری کے لوگ اور تمام قرابت دار ہوتے ہیں، انسانی برادری میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں:

۱۔ ایک جو خاندانی روایات میں زندہ رہتے ہیں، انہیں اس سے کوئی غرض نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور اگر ہو بھی رہا ہے تو کیوں ہو رہا ہے، ان کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ ہمارے باپ دادا اس طرح کرتے ہیں۔

۲۔ دوسرا گروہ سوچتا ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ کیا صحیح ہے اور کیا غلط؟

مشرکین مکہ باوجود جانتے تھے کہ تین سو ساٹھ بت ہمارے جیسے آدمیوں نے پتھروں سے تراشے ہیں۔ یہ آدمیوں کی طرح بول نہیں سکتے، سن نہیں سکتے لیکن خاندانی روایات کا اتنا زیادہ غلبہ تھا کہ وہ ان بے جان پتھروں کے مجسم ٹکڑوں کو خدا کا درجہ دیتے تھے، نہ صرف خدا مانتے تھے بلکہ کوئی اس حقیقت کو بیان کرتا تھا کہ ہمارے خدا پتھروں کے بے جان مجسمے ہیں تو اس کے درپے آزار ہو جاتے تھے۔

شرم ناک حد تک سزائیں دینا ان کے نزدیک بہترین عمل تھا، صدیوں پرانی روایات اور جہالت کی گرد سے اٹا ہوا ماحول انسان کے اندر فہم کا چشمہ خشک کر دیتا ہے۔ ہمارے سامنے مارے اپنے بچوں کی مثال ہے، بچوں کو جہالت سے معمور ماحول سے الگ کر کے علمی ماحول میں داخل کرتے ہیں تو دراصل جہالت کے خلاف اعلان بغاوت کرتے ہیں، بچے کو اسکول (یعنی جاہلانہ ماحول سے آزاد ماحول) میں داخل کرتے ہیں۔

میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے میں دس سال لگ جاتے ہیں، ایک سال کا وقفہ شمار کیا جائے تو ساڑھے تین ہزار گھنٹے صرف کر کے ہمارا بچہ اس قابل ہوتا ہے کہ وہ سو تک گنتی یاد کر لیتا ہے۔

میٹرک تک تعلیم حاصل کرنے میں ۳۵ ہزار گھنٹوں کا وقت اور ہزاروں روپے صرف ہوتے ہیں، ان پینتیس ہزار گھنٹوں میں ماں کی کوشش ہوتی ہے کہ بچہ پڑھائی میں لگا رہے، باپ بھی اس طرف توجہ دیتا ہے کہ بچہ کی تعلیم میں کوتاہی نہ ہو، بھائی بھی کتابیں کاپیاں لے کر ساتھ بیٹھ جاتا ہے، بہن بھی پڑھنے کی تلقین کرتی ہے، گھر کے سب افراد توجہ دیتے ہیں تب سکینڈری سطح کی تعلیم حاصل ہوتی ہے، اعلیٰ تعلیم ابھی نہیں شروع ہوئی۔ میٹرک کے بعد راستہ کھلتا ہے کہ کس فیلڈ میں آگے بڑھنا ہے۔ ڈاکٹر بننا ہے، انجینئر بننا ہے، اکاؤنٹینٹ بننا ہے، جہاز اڑانا ہے، مشین بنانی ہے وغیرہ وغیرہ۔ دس سال میں آدمی عالم نہیں بن جاتا۔ قابل ذکر علوم کے حصول کے لئے ذہنی طور پر تیار ہوتا ہے یہ تذکرہ دنیاوی تعلیم کا ہے۔

دوسری طرف روحانی علوم میں ایک ہفتے میں ایک گھنٹے کا وقت بمشکل نکلتا ہے، اسی تناسب سے ایک ماہ میں چار گھنٹے اور ایک سال میں اڑتالیس گھنٹے بنتے ہیں۔ آدمی کے دیگر معمولات بھی جاری رہتے ہیں، کاروبار بھی ہوتا ہے، ملازمت بھی جاری رہتی ہے، شادی بیاہ اور دیگر امور بھی سرانجام دیئے جاتے ہیں اور صدیوں پرانی روایات اور ماحول سے بھی آدمی ذہنی طور پر وابستہ رہتا ہے۔

ایک سال میں صرف ۴۸ گھنٹے صرف کر کے اگر یہ سوچا جائے کہ روحانی علوم حاصل نہیں ہوئے، میں کشف کی لذتوں سے آشنا نہیں ہوا، مافوق الفطرت باتیں سامنے نہیں آئیں تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ روحانیت کی اہمیت دنیاوی علوم کی ابتدائی کلاسوں سے بھی کم کر دی گئی ہے۔

دس سال تک ہر سال ساڑھے تین ہزار گھنٹے صرف کرنے کے بعد طالبعلم اس قابل ہوتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے کسی شعبے کا انتخاب کرے تو اڑتالیس گھنٹے کا وقت دے کر وہ کس طرح کہتا ہے کہ روحانی علوم حاصل نہیں ہوئے۔ خالص دنیاوی ماحول میں رائج طرز فکر سے روحانی استاد کی طرز فکر منفرد ہوتی ہے، روحانی استاد میں توکل اور استغنا ہوتا ہے، دنیا طلبی نہیں ہوتی اس کی مرکزیت ”توحید“ ہے۔

روحانی علوم سیکھنے کے لئے طالبات اور طلباء کے لئے ضروری ہے کہ ان کے اندر منفی شیطانی اور غیر اسلامی روایات سے بغاوت کرنے کا حوصلہ اور جذبہ ہو، صراط مستقیم پر چلنے اور مستقل مزاجی سے آگے بڑھنے کا عزم ہو، سیدنا حضور ﷺ کے نقش قدم پر قائم رہنے اور اللہ کا عرفان حاصل کرنے کے لئے طاغوتی طاقتوں اور نفس کی سرکشی سے ٹکرانے اور انہیں زیر کرنے کی ہمت ہو۔

کتاب محمد الرسول اللہ ﷺ میں سیدنا حضور ﷺ کی حیات طیبہ کے وہ پہلو جمع کئے گئے ہیں جن میں مثبت طرز فکر کو فروغ دینے میں شر کے نمائندوں کی طرف سے قدم قدم پر کھڑی کی گئی رکاوٹوں کا تذکرہ ہے، توحید کے راستے میں ان رکاوٹوں کو دور

کرنے کے لئے حضور ﷺ کی ساری زندگی مصائب اور جدوجہد میں گزر گئی اور بالآخر وہ اللہ کا پیغام پہنچانے میں کامیاب و کامران ہوئے، وہ اللہ سے راضی ہوگئے اور اللہ ان سے راضی ہوگیا۔

روحانیت سیکھنے اور روحانی مشن کو فروغ دینے کے لئے ضروری ہے کہ حضور ﷺ کی حیات طیبہ کا مطالعہ کریں اور اس بات پر غور کریں کہ سیدنا ﷺ نے الٰہی مشن کو پھیلانے کے لئے اور وحدانیت کا پرچار کرنے کے لئے اور کفار کا حلقہ توحید میں لانے کے لئے کیسی کیسی تکلیفیں برداشت کی ہیں۔ ہم جب حضور پاک ﷺ کی سیرت طیبہ کو حرز جاں بنالیں گے اور روحانی علوم کو فروغ دینے اور ان علوم کو نوع انسانی میں پہنچانے میں ہر ہر قدم پر اللہ اور اس کے رسول محمد ﷺ کا ہمیں تعاون ملے گا، بلاشبہ ہم دنیا میں کامران اور آخرت میں رسول اللہ ﷺ کے سامنے سرخرو ہونگے، جرأت مندانہ اقدام کرنے، دل شکن حالات سے گزرنے، لوگوں کی الزام تراشیوں کو نظرانداز کرنے کا ہمارے اندر حوصلہ پیدا ہوگا۔ حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے وصال سے پہلے مجھے مخاطب کر کے فرمایا تھا:

"خواجہ صاحب مشن کو پھیلانے والے لوگ دیوانے ہوتے ہیں۔"

پھر مجھ سے فرمایا:

"آپ میری بات سمجھ گئے۔"

میں نے عرض کیا:

"میں آپ کی منشاء اور آپ کی ہدایت کو سامنے رکھ کر روحانی مشن کی پیش رفت میں انشاءاللہ دیوانہ وار کام کروں گا۔"

حضور قلندر بابا اولیاءؒ خوش ہوئے اور میرے سر پر ہاتھ رکھا، پھر پیشانی پر انگلیوں کے پوروں سے دائرے بناتے رہے اور پھونک مار کر فرمایا:

"اللہ تمہارا حامی و ناصر ہے۔"

مشن کی پیش رفت کے سلسلے میں جب تک انسان ہر قسم کے دنیاوی مفاد حرص و آس، حسد، طمع، کبر و نخوت، برائی، احساس برتری اور احساس کمتری سے نجات حاصل نہیں کرلیتا اس کے اندر مشن کے لئے دیوانگی نہیں پیدا ہوتی۔

سیرت طیبہ پر منفرد انداز میں لکھی جانے والی کتاب ''محمد الرسول اللہ'' حضور سیدنا ﷺ کی سیرت پاک کے اس حصہ کا مکمل خاکہ ہے جس میں حضور ﷺ نے تبلیغ دین کے سلسلے میں (۲۳) تئیس سال جدوجہد اور مسلسل کوشش فرمائی ہے۔ پیدائش کے بعد سے چالیس سال تک کی عمر بھی سالکین کے لئے مشعل راہ ہے۔

بلاشبہ وہ تمام حضرات وخواتین سعید اور خوش بخت ہیں جو محمد الرسول اللہ کے مشن کی پیش رفت کے لئے ہر قسم کا ایثار کرتے ہیں۔

اس سعادت اور خوش بختی کی حفاظت کے لئے اور اس سعادت اور خوش بختی کا شکر ادا کرنے کے لئے ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم سیدنا حضور ﷺ کی زندگی کو مشعل راہ بنائیں اس عمل سے ہمارے اندر یقین اور مسلسل آگے بڑھنے کا حوصلہ پیدا ہوگا۔

رازق

کائنات ایک گروہی تقسیم ہے۔ یہ گروہی تقسیم ایک ایسا نظام ہے جس میں ہر گروہ نہ چاہتے ہوئے بھی ایک دوسرے کے ساتھ مشترک ہے۔ گروہی تقسیم سے مراد کائنات میں مختلف النوع مخلوقات ہیں۔ ہر مخلوق شکل و صورت، خدوخال، مزاج اور عملی کارکردگی کے اعتبار سے گوکہ مختلف نظر آتی ہے لیکن سسٹم کی اکائی سے کوئی مخلوق فرار اختیار نہیں کرسکتی۔

ہر مخلوق اس کی حیثیت کچھ بھی ہو، اجتماعی ذہن رکھتی ہے۔ یہ اجتماعی ذہن تقسیم ہو کر کسی مخلوق کا انفرادی عمل بنتا ہے۔ زمین پر لاکھوں کی تعداد میں مخلوقات موجود ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ حیوانات کی اقسام دس لاکھ سے بھی زیادہ ہیں۔ زمین پر پودوں کی بھی تعداد کئی لاکھ ہے۔ اسی طرح اشجار کی تعداد بھی کئی سو ہزار سے زیادہ ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ پانچ لاکھ قسم کے پرندے زمین پر موجود ہیں۔ سمندر کے اندر موجود مخلوق لاکھوں قسموں سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ اسی طرح زمین پر رینگنے والے کیڑے اور حشرات الارض کی قسمیں شمار کرنا ممکن نہیں ہے۔

تمام مخلوقات کروڑوں اور اربوں سالو سے زندہ ہیں۔ اور زندہ رہنے کے لئے خوراک حاصل کرتی ہیں۔ ایسی مخلوقات بھی بیشمار ہیں جو خود اپنی اصناف کو کھا کر زندہ رہتی ہیں۔ اس کے باوجود کہ یہاں ہر مخلوق دوسری مخلوق کے لئے غذائی ایندھن بن رہی ہے، مخلوق ختم نہیں ہوتی۔ مخلوقات جب ایک دوسرے کو کھا رہی ہیں تو یہ بات حیران کن ہے کہ زمین پر اتنی بڑی تعداد میں جاندار کس طرح زندہ ہیں۔ ہر مخلوق چاہے وہ کتنی بھی کمزور ہو، چھوٹی ہو، نادیدہ ہو، اپنی نسل کو جاری رکھے ہوئے ہے۔

مردم شماری کے مطابق انسان زمین پر چھ ارب ہیں۔ ہر انسان دن میں تین مرتبہ کھانا کھاتا ہے۔ اس کا مطلب ہے ہوا کہ زمین کے دسترخواں پر ہر روز تقریباً اٹھارہ ارب انسان کھانا کھاتے ہیں۔

دیمک چیونٹی سے چھوٹا ایک کیڑا ہے۔ سائنس بتاتی ہے کہ دیمک دوسرے حشرات کی طرح انڈے دے کر اپنی نسل بڑھاتی ہے۔ ایک دیمک عام طور پر ایک ہزار سے دو ہزار انڈے دیتی ہے۔ دیمک کی ایک دوسری قسم ایک وقت میں بیس لاکھ انڈے دیتی ہے۔ تحقیقات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ یہ انڈے بہت سارے دوسرے حشرات کے لئے بے حد لذیذ اور مرغوب غذا ہیں۔ ان بیس لاکھ انڈوں میں سے پانچ سو انڈے بچ جاتے ہیں اور اس طرح دیمک کی نسل چلتی رہتی ہے۔

کارخانہ حیات پر اور کارخانہ حیات کی قدرت پر غور کیا جائے تو انکشاف ہوتا ہے کہ زمین پر موجود ہر شئے دوسری شئے کے لئے خوراک بن رہی ہے۔اس کے باوجود نسلی سلسلہ قائم ہے۔ مخلوقات کے ذریعہ حیات کی ترسیل کا خدائی نظام موجود ہے۔

ایک خاص قسم کا الوا پنی مخصوص جگہ پر حرکت کئے بغیر بیٹھتا رہتا ہے۔ اپنے اندر سے ایک برقی شعاع خارج کرتا ہے جس کے اثر سے ایک چڑیا اس کے سامنے آکر بیٹھ جاتی ہیاور الوا سے پکڑ لیتا ہے۔

راقم الحروف کا ذاتی مشاہدہ ہے کہ جب ماربل کی سل کو آرے سے چیرا گیا تو اس کے اندر سبز رنگ کا زندہ کیڑا موجود تھا۔ سائنس بتاتی ہے کہ:

چلتے ہوئے آتش فشانوں سے بہنے والے لاوے غار بن جاتے ہیں چونکہ غاریں گرم لاوے سے وجود میں آتی ہیں جس کا درجہ حرارت دو سو سے تین ہزار سینٹی گریڈ ہوتا ہے۔ ان غاروں میں نئی زندگی کی تخلیق کے ممکنات پر تحقیق کرنے والی ایک ٹیم نے ایک غار میں سانپ سے ملتی جلتی ایک مخلوق کا سراغ لگایا۔ پہلے تو انہیں خیال آیا کہ یہ باہر کی دنیا کا ایک سانپ ہے مگر یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اس مخلوق کا سانپ کی نسل سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ بلکہ وہ ایک دیو ہیکل کیڑا تھا جو تقریباً دو میٹر لمبا تھا۔ مگر اصل حیرت اس وقت ہوئی جب اس کا معائنہ لیبارٹری میں کیا گیا۔ اس کیڑے میں نہ تو نظام ہضم تھا اور نہ ہی نظام تنفس تھا۔ اس مخلوق میں صرف دل تھا۔

یہ انکشاف ایک معمہ بن گیا۔ یہ کس طرح زندہ رہتا ہو گا؟ کیسے کھاتا ہو گا؟ اور کس طرح سانس لیتا ہو گا؟ اس مخلوق کی جلد پر تحقیق نے یہ معمہ حل کر دیا۔ اس کی جلد پر رہنے والے خوردبینی جراثیم (بیکٹیریا) سے خوراک مہیا کرتے تھے۔ انہیں کے ذریعے یہ مخلوق آکسیجن حاصل کرتی تھی۔ سوچنے کی یہ بات ہے کہ یہ کیڑا اس غار میں پیدا ہوا جسے آتش فشاں کی بے پناہ آگ نے جلا کر خاکستر کر دیا تھا۔ یہ پیدا کیسے ہوا؟ زندہ کیسے رہا؟ نشوونما کیسے ہوئی؟ دو میٹر لمبا کس طرح ہو گیا؟ اور اس کا ارتقاء کس طرح ہوا؟

کروڑوں اربوں پرندے زمین کی فضا میں موجود رہتے ہیں۔ یہ پرندے کھانا کھاتے ہیں، پانی پیتے ہیں اور حیات و ممات کے سلسلے میں دوسرے تمام گروہوں کے ساتھ قدرے مشترک رکھتے ہیں۔ انسانی زندگی ہو، حیوانی زندگی ہو، حشرات الارض کی زندگی ہو یا پرندوں کی زندگی ہو سب ایک زنجیر میں بندھے ہوئے ہیں، حیات و ممات کی زنجیر سے زمین پر موجود کوئی بھی مخلوق آزاد نہیں ہے، آزاد نہیں ہو سکتی، آزاد نہیں تھی، حیات و ممات ایک مسلسل حرکت ہے اور حرکت توانائی کے بغیر ممکن نہیں اور توانائی کے لئے غذا کا ہونا ضروری ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پرندے کہاں سے کھاتے ہیں؟ اتنی بڑی تعداد اگر کھیتی باڑی سے حاصل شدہ گندم یا چاول کھانے لگے تو انسان بھوکا مر جائے گا، کارساز حیات کی قدرت پر قربان جایئے کہ آسمان پر پرندوں کے غول اڑتے ہیں اور انہیں پرواز کے لئے

انرجی کی ضرورت ہوتی ہے اور توانائی کے لئے غذا کا حصول ضروری ہے۔ پرندے فضاء میں سے زمین پر اترتے ہیں اس سے پہلے کہ ان کے پنجے زمین پر لگیں وہاں ان کے لئے غذا موجود ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"کتنے ہی جانور ہیں جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھرتے اللہ ان کو رزق دیتا ہے اور تمہارا رازق بھی وہی ہے وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"

(العنکبوت۔٦٠)

زمین، فضاء، خلاء اور آسمان پر تفکر کرنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ کائنات میں جتنی بھی اشیاء یا مخلوقات ہیں وہ سب اپنا ایک تشخص رکھتی ہیں ان کی اپنی انفرادیت ہے اور ان کے اندر ایثار ہے کہ وہ دوسری مخلوق کے کام آئیں۔

ہم زمین پر بیج بوتے ہیں، بیج مخلوق کی ایک قسم ہے، بیج ایک گروہ ہے، اس بنیاد پر گروہ ہے کہ آم بیر نہیں ہوتا، بیر انجیر نہیں ہوتا، انجیر کیلا نہیں ہوتا، کیلا شہتوت نہیں ہوتا، جس طرح بیج کی قسمیں الگ الگ ہیں اسی طرح درختوں کی قسمیں یا گروہ الگ الگ ہیں، آم کے درخت کے پتے شہتوت کے درخت کے پتوں کی طرح نہیں ہیں، بادام کے درخت کے پتے بیری کے پتوں سے مختلف ہیں، امرود کے درخت کے پتوں اور انار کے درخت کے پتوں میں نمایاں فرق ہے، نہ صرف یہ کہ گروہی اعتبار سے پتوں کے خدوخال جدا جدا ہیں درختوں میں سے پیدا ہونے والے پھل بھی الگ الگ ہیں۔

انار، امرود، انجیر، جامن، آم، چیکو، شریفہ اور سینکڑوں قسم کے پھلوں کو ایک ٹرے میں سجایئے اور غور کیجئے کہ یہ سب ایک ہیں؟ ہر گز ایک نہیں ہیں۔ سب الگ الگ ہیں، رنگ الگ ہے، ذائقہ الگ ہے، شکل و صورت الگ ہے، خوشبو الگ ہے لیکن اس کے باوجود درخت درخت ہے جس طرح انسان انسان ہے، پودے پودے ہیں، جس طرح گھاس گھاس ہے لیکن نظام قدرت اور کائناتی گروہی نظام یہ ہے، ہر گروہ دوسرے گروہ کے کام آرہا ہے اور ہر گروہ دوسرے گروہ کے لئے غذا بن رہا ہے، ہر گروہ دوسرے گروہ سے نہ تو متصادم ہے اور نہ ایک گروہ دوسرے گروہ میں تحلیل ہو رہا ہے اس کے باوجود ہر شئے دوسرے شئے کے لئے کسی نہ کسی عنوان سے غذا بن رہی ہے، اپنا وجود قائم رکھے ہوئے ہے۔ یہ وجود کس طرح قائم ہے؟ وجود کے قیام میں یہ اسرار ہے کہ تمام مخلوق پر حاکمیت ایک ہستی کی ہے، اگر ایک ہستی کی حاکمیت نہ ہوتی تو ہر گروہ ہر نوع، نوع کی ہر قسم ایک دوسرے سے ٹکرا کر ریزہ ریزہ ہو جاتی، واحد ہستی اللہ کی بنائی ہوئی لوح محفوظ میں تمام مخلوقات کا ریکارڈ محفوظ ہے جسے ایک کمپیوٹر کی طرح کوڈ کیا گیا ہے۔ لوح محفوظ میں یہ بات محفوظ ہے کہ کس طرح مخلوق مخلوق کے کام آئے گی۔

خیالات

اللہ تعالیٰ نے آدم کی اولاد کو اس کے باپ آدم کا ورثہ منتقل کیا ہے۔ یہ وہ علم ہے جو آدم کے علاوہ کائنات میں کسی مخلوق کو حاصل نہیں ہے۔

الٰہی سائنس کا یہ علم آدم کو اس لئے دیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی ثنائی، اللہ کی حاکمیت، اللہ کی قدرت اور اللہ کی ربوبیت کا ادراک حاصل کرے اس کے بر خلاف وہ جو بھی سوچ ہے، جو بھی تفکر ہے، جو بھی علم ہے، وہ سب خود فریبی اور سراب ہے۔

انسانی دماغ میں حواس خمسہ کی اطلاعات موجود رہتی ہیں یا اطلاعات حواس خمسہ بنتی ہیں، حواس خمسہ اعصاب کے ذریعے دماغ میں نصب کروں تک پہنچ کر نقش ہو جاتے ہیں، یہی وہ یاداشتیں ہیں جنہیں حافظہ کہا جاتا ہے، دماغ کے یہ دو کڑے جو دائیں طرف اور بائیں طرف واقع ہیں۔ انسانی زندگی کے تمام احساسات کو جو پیدائش سے لیکر موت تک کے حالات پر مشتمل ہیں یاد رکھتے ہیں، کوئی مضمون نگار جب کوئی مضمون لکھتا ہے یا کوئی شاعر جب شعر کہتا ہے تو دماغ کے پچھلے حصے میں جہاں گردن کے اوپر ابھار ہوتا ہے، تحریکات ہوتی ہیں اور یہ تحریکات لہروں کی شکل میں وارد ہوتی ہیں، انسان جب کوئی کام کرتا ہے، کچھ سوچتا ہے، کوئی حرکت کرتا ہے تو دراصل ریڑھ کی ہڈی میں موٹا تار (حرام مغز) کرنٹ کی گزرگاہ بن جاتا ہے اور حرکت اس کا مظاہرہ ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی عمل، کوئی فعل، کوئی حرکت اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک حرام مغز میں کرنٹ کا صحیح بہاؤ نہ ہو۔ یہ کرنٹ نظام کائنات میں جاری و ساری لہریں ہیں، آواز کیا ہے؟ آواز تو لہروں کے علاوہ کچھ نہیں ہے اور یہ ساری کائنات آواز کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔

یہی آواز لہروں میں منتقل ہو کر معلومات بنتی ہیں، معلومات اور اطلاع کے بغیر کائنات کے وجود کا تذکرہ ممکن نہیں ہے، انسان کی زندگی کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں معلومات کے علاوہ زندگی میں کچھ بھی نہیں ملتا، ہمارا پیدا ہونا، جوان ہونا، بوڑھا ہونا، خورد و نوش کی ضرورت کو پورا کرنا، سونا، جاگنا، رزق تلاش کرنا، پڑھنا، لکھنا، عروج و زوال کی راہ کا متعین ہونا سب معلومات پر قائم ہے۔

اوسط عمر اگر ساٹھ سال ہو تو ایک آدمی بارہ کروڑ اکسٹھ لاکھ چوالیس ہزار سال معلومات میں زندگی گزارتا ہے یعنی اوسط عمر میں معلومات کا دورانیہ بارہ کروڑ اکسٹھ لاکھ چوالیس ہزار سال ہو تقریباً پونے تیرہ کروڑ اطلاعات پیدائش سے موت تک انسانی زندگی کا

سرمایہ ہیں، چونکہ انسان زندہ رہنے کے قانون سے واقف نہیں ہے اس لئے ۹۵ فیصد اطلاعات یا ۹۵ فیصد زندگی ضائع ہو جاتی ہے، یہ اطلاعات قدرت کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق قبول کی جائیں اور ان پر عمل درآمد ہو جائے تو انسان اشرف المخلوقات ہے، اگر ایسا نہ ہو (جیسا کہ عام طور پر نہیں ہوتا) تو انسان اشرف المخلوات کے دائرہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔

کوئی اطلاع یا کسی شئے کا علم ہمیں لازمانیت سے موصول ہوتا ہے یہ لازمانیت نئی نئی اطلاعات، زمانیت (وقت) کے اندر ارسال کرتی رہتی ہے، اگر ہم لازمانیت کو ایک نقطہ سے تشبیہ دیں تو یوں کہیں گے کہ اس نقطہ میں کائنات کا یکجائی پروگرام نقش ہے، لہروں کے ذریعے اس نقطہ سے جب کائنات کا یکجائی پروگرام نشر ہوتا ہے تو حافظہ سے ٹکرا کر بکھرتا ہے، بکھرنے ہی ہر لہر ایک مختلف شکل وصورت میں تصویری خدوخال اختیار کر لیتی ہے، لہروں کا حافظہ کی سطح پر آکر بکھرنا ہی وقت کو وجود میں لاتا ہے، چونکہ حافظہ جبلی طور پر (فطری طور پر نہیں) محدود ہے اس لئے تصویر کے مابین فاصلہ بن جاتا ہے اس فاصلہ کا دوسرا نام دوری کا احساس اور وقت کی طوالت ہے، اگر ہم اس نقطے کو تلاش کر لیں جہاں کائنات کا یکجائی پروگرام نقش ہے تو فاصلہ کالعدم ہو جاتا ہے۔

عروج وزوال

ہزاروں سال کی تاریخ دراصل اس راز کی پردہ کشائی ہے کہ قومیں ترقی کے خوشنما دعوؤں میں اور نئ نئ ایجادات کے پردہ زنگاری میں خود کو تباہ و برباد کرتی رہتی ہیں، ایک طرف قومیں زمین کو آتش فشاں بنا کر خود ایندھن بن جاتی ہیں اور دوسری طرف خالق و مالک ہستی اللہ تعالٰی از سرنو زمین پر باغ کی آبیاری کرتا ہے، قوموں کے عروج وزوال کے مشاہدات یہ ہیں کہ جو قوم سب سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ افراد کو موت کے منہ میں دھکیل دے وہ ترقی یافتہ ہے اور جب اس ترقی کا فسوں ٹوٹتا ہے تو زمین آتش فشاں کی طرح پھٹ پڑتی ہے اور چھ ارب کی آبادی سمٹ کر ایک ارب رہ جاتی ہے، پھر بچے کھچے خستہ حال اپاہج، معذور، ادھڑی ہوئی کھال اور زخموں سے نڈھال افراد زمین کی اجڑی ہوئی امنگ مین سندور بھرتے ہیں اور ایک وقت آتا ہے کہ زمین میں سے پیدا ہونے والے لوگ اس سندور کو اتار کر زمین کو دوبارہ اجاڑ دیتے ہیں۔

تجرباتی دنیا یہ ہے کہ انسان کہیں سے آتا ہے یعنی وہ پہلے سے کہیں موجود تھا جب وہاں کی موجودگی ختم ہوئی تو اس دنیا میں پیدا ہو گیا یعنی اس دنیا میں آنے سے پہلے اس پر موت وارد ہوئی، پہلے موت وارد ہوئی پھر پیدا ہوا اس دنیا سے جانے کے بعد دوسری دنیا میں پیدا ہوا اس کا منطقی استدلال یہ ہوا کہ اس دنیا میں آنے سے پہلے بھی ہم کہیں پیدا ہوئے تھے یعنی موت سے زندگی پیدا ہوئی اور زندگی سے موت پیدا ہوئی، اس کو اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ موت زندگی میں داخل ہوئی اور زندگی موت میں داخل ہو گئی، زندگی سے موت کا پیدا ہونا اور موت سے زندگی کا پیدا ہونا یا زندگی کا موت میں داخل ہو جانا اور موت کا زندگی میں داخل ہو جانے کا پروسیس یہ ظاہر کرتا ہے کہ کوئی ایسی ہستی ہے جو اس پراسیس کو جاری رکھے ہوئے ہے اور بغیر کسی تبدیلی اور تعطل کے جاری رکھے ہوئے ہے۔

جس قوم نے بھی ذاتی مفاد کے تحت گروہی تعصب کو ہوا دی ملت میں تفرقہ ڈالا اور اس تفرقے کی بنیاد پر خود کو جنتی اور دوسروں کو دوزخی قرار دیا وہ تباہ کر دی گئی۔ اس کا نام صفحہ ہستی سے مٹ گیا اس کو ذلیل وخوار کر کے زمین پر دربدر کر دیا گیا۔ اللہ کہتا ہے:

”جو قوم اپنی حالت میں بہتری پیدا نہیں کرتی اللہ اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیتا ہے اور اس قوم کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔“

ایسی قوم دربدر کی ٹھوکریں کھا کر بالآخر اپنے انجام کو پہنچ جاتی ہے، جس نسل، جس ملک، جس قوم نے اللہ تعالیٰ کے قانون کو توڑا اور اجتماعی سوچ کو نظرانداز کر کے ریشم کے کیڑے کی طرح انفرادی سوچ کے غلاف میں بند ہو گئی، وہ ختم ہو گئی ہے، اپنے کوتاہ نظری کو، کوتاہ اندیشی سے حرف غلط کی طرح مٹ گئی، ایسی قوموں کی زندگی کا تار و پود بکھر جاتا ہے۔

کیا ایسا ہونا عقلی اعتبار سے صحیح نہیں ہے کہ مذہب کو سائنسی بنیادوں پر سمجھا جائے اور سائنسی بنیادوں پر مذہب کی عمارت کی تزئین کی جائے اور اللہ تعالیٰ کو کائنات کی حیات کے اندر تلاش کیا جائے، کیا رات دن کا اختلاف، کہکشانی نظام اور ان نظاموں میں مسلسل حرکت اس لئے قائم نہیں ہے کہ انسان ان کے اندر تفکر کرے۔

جو انسان پیدا ہوتا ہے اس کے ذہن میں یہ بات ضرور آتی ہے کہ میں پیدا ہونے سے پہلے کہاں تھا؟ کیوں پیدا ہوا؟ جس دنیا میں پیدا ہوا یہ سارا عالم خوشبو اور رنگ سے معمور عالم کی حیات عارضی اور فانی کیوں ہے؟ فانی حیات کے بعد اگر دوسری زندگی ہے تو وہ کہاں ہے؟ کیا وہ دنیا بھی اس دنیا کی طرح فنا ہونے والی ہے؟

لیکن جیسے جیسے آدم زاد زندگی کے شب و روز میں سانس لیتا ہے ایسے نظریات سے دوچار ہوتا ہے کہ بالآخر وہ ہارے ہوئے جواری کی طرح اصلیت اور ماہیت کے بارے میں کوئی رائے نہیں قائم کر سکتا کیونکہ وہ نہیں سمجھتا کہ دنیا میں پھیلی ہوئی لاکھوں چیزوں کا آپس میں کیا تعلق ہے۔ یہ سب اپنے اپنے محور پر ایک توازن کے ساتھ کیوں حیات و ممات کے دوش پر سفر کر رہی ہیں، ان کی ماہیت میں کیوں تبدیلی واقع نہیں ہوتی، اس وقت آدم زاد ایسے لوگوں کی طرف دیکھتا ہے جنہوں نے زندگی کے تجربات سے کوئی نتیجہ اخذ کر لیا ہے ہر آدم زاد کے طرز عمل کی بنیاد یہ بنتی ہے کہ وہ ان سوالوں کا جواب چاہتا ہے۔

میں کون ہوں؟

میں کیا ہوں؟

عقل کیا ہے؟

شعور کیا ہے؟

عقل و شعور میں جو باتیں وجدان کی صورت میں نازل ہوتی ہیں ان کا میری ذات سے کیا رابطہ ہے؟ میں زندگی کے بارے میں جو فیصلہ کرنا چاہتا ہوں، ان فیصلوں کے نتائج میرے حق میں ہونگے یا مجھے نقصان پہنچائیں گے؟

مستقبل اگر ہے تو کیا میں اپنے مستقبل سے مطمئن ہو سکتا ہوں؟

میں جو کچھ کرتا ہوں اس کی باز پرس ہو گی؟

اگر باز پرس ہو گی تو کیا عمل میں تبدیلی ممکن ہے؟

راکٹوں، میزائلوں اور لانچرز کی تباہی اور بربادی کے آتشیں بوچھاڑ سے کسی نے اپنی شیر خوار بچی کو بچانا چاہا اور کوئی اپنی ضعیف اور بوڑھی ماں کا ہاتھ تھامے خالی ہاتھ محفوظ جگہ کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا، خوبصورت طویل و عریض گھران گھروں میں آرائشی سامان اور قیمتی سامان ٹوٹ پھوٹ کر زمین پر اس طرح بکھر گیا جیسے کوئی بے وقعت چیز ہے، خلاء سائنس آتش فشاں کے دھوئیں سے اس طرح بکھر گیا کہ زمین سورج کی کرنوں سے محروم ہو گئی، دیکھنے والوں نے قیامت کا جو منظر دیکھا ان کے دل ڈوب ڈوب گئے اور آنکھوں میں خون آنسو بن گیا، دل کی دنیا زیر وزبر ہو گئی۔

نوع انسانی کے دانشوروں، عقلمندوں اور بذات خود ہیومن رائٹس کا پرچار کرنے والوں نے اپنی چودھراہٹ قائم کرنے کے لئے زمین پر آتش فشاں مادے کا ایسا پہاڑ کھڑا کر دیا جس کے سامنے زمین کی کوئی حیثیت باقی نہیں رہ گئی، سائنسدانوں نے اپنی نوع کو برباد کرنے کے لئے ایسی ایسی اختراعات کیں کہ زمین کا کلیجہ چھلنی ہو گیا، نوع انسانی سے بزعم چند باشعور انسانوں نے خود کو برتر ثابت کرنے کے لئے نوع انسانی پر ایسا جال پھینک دیا جس کا ہر سورس ایک مہلک ہتھیار ہے، نوع انسانی کے ان دانشوروں نے جو بلاشبہ اللہ کے دوست نہیں ہیں، نت نئے مہلک ہتھیاروں کی ایجاد سے خود اپنی پیشانیوں کو داغ دار بنا لیا ہے، ترقی یافتہ قوم کے باشعور افراد کا کہنا ہے کہ اس وقت دنیا میں چالیس ہزار ایٹم بم موجود ہیں، دیگر چھوٹے اور بڑے اسلحوں کا کوئی شمار نہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ لوگ ترقی کے نام پر زمین کو اجاڑ رہے ہیں۔

مخلوق کی خدمت

اگر آدمی کوئی علم نہیں جانتا تو اس علم کو سیکھنے کے لئے ان تمام علوم سے جو وہ سیکھ چکا ہے صرف نظر کر کے اسے نرسری کا بچہ بننا پڑے گا۔

استاد جب کہتا ہے کہ پڑھو ''الف''

بچہ یہ نہیں کہتا کہ ''الف'' کیا ہے

استاد کی تقلید میں بچہ کہہ دیتا ہے ''الف''

عقل و شعور استعمال کر کے کوئی اعتراض نہیں کرتا یہ وصف بچہ کو قدم قدم آگے بڑھاتا ہے اور بچہ پڑھ لکھ کر پی ایچ ڈی کر لیتا ہے۔ دنیاوی علوم کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہوتی، جب تک عقل و شعور کی نفی کر کے طالب علم سکھائے جانے والے علم کو قبول نہ کرے، معاشرتی طرزیں بچے میں ماحول اور ماحول میں رہنے والے افراد سے منتقل ہوتی رہتی ہیں، ماں آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہتی ہے ''وہ چاند ہے'' بچہ چاند کو اسی طرح چاند سمجھتا ہے جس طرح ماں کے شعور میں چاند ہے۔ باپ کہتا ہے ''یہ درخت ہے''۔ بچے کے اندر درخت کے متعلق باپ کا علم منتقل ہو جاتا ہے۔ بہن، بھائی، دادی، نانی بچے کو پانی پلاتے ہیں، بچے کی آنتیں پانی سے اسی طرح سیراب ہوتی ہیں جس طرح گھر کے دوسرے افراد پانی پی کر سیراب ہوتے ہیں، بچہ اگر چاند کو چاند تسلیم کرنے سے انکار کر دے، درخت کو درخت نہ مانے، پانی سے پیاس بجھنے پر اعتراض کرے، ماں کو ماں نہ کہے، باپ کو باپ تسلیم نہ کرے تو معاشرے کے اقدار بچے میں منتقل نہیں ہونگی۔

بچہ جب تک بے شعوری کو قبول نہیں کرتا، اس کے اندر شعور پیدا نہیں ہوتا، روحانی استاد کہتا ہے، ''اندھیرا روشنی ہے'' چھ ارب لوگ کہتے ہیں اندھیر، اندھیرا ہے، تاریکی ہے اگر شاگرد، عامل، معمول کے طریقہ پر حاصل ہونے والے شعور پر اعتراض کر دے کہ اندھیرا روشنی کیسے ہو سکتا ہے؟ اندھیرا تو اندھیرا ہے تو وہ روحانی علوم نہیں سیکھ سکتا۔

جس طرح بچے نے اے، بی، سی ڈی پڑھنے میں اپنی عقل استعمال نہیں کی اس طرح جب تک روحانی شاگرد اندھیرے کو روشنی تسلیم نہیں کرے گا، اگلی کلاسوں میں داخل نہیں ہو سکتا۔ روحانی استاد کہتا ہے "مادی جسم فکشن ہے اس کی اپنی کوئی ذاتی حیثیت نہیں ہے" فرد حجت پیش کرتا ہے اگر جسمانی نظام فکشن ہے تو روٹی نہ کھانے سے ہم کمزور کیوں ہو جاتے ہیں؟ اگر روٹی کھانا فکشن ہے تو ہمارے اندر کھانا کھانے سے طاقت کیوں آ جاتی ہے؟

روحانی استاد بتاتا ہے کہ "ہمارا مادی جسم اس لئے فکشن ہے کہ ہم روٹی بھی کھا رہے ہیں، پانی بھی پی رہے ہیں، فضا سے آکسیجن بھی ہمیں مل رہی ہے لیکن جسم انحطاط پذیر ہے، آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے، ایسا کیوں ہوتا ہے؟ روٹی کھا کر آدمی بوڑھا کیوں ہو رہا ہے؟ جوان آدم سوکھی روٹی کھا کر بھی صحت مند ہے، بوڑھا آدمی طاقتور غذائیں کھا کر روز بروز کمزور ہوتا رہتا ہے، رگ، پٹھوں سے مرکب جسم کے خوبصورت خدوخال سکڑ جاتے ہیں، اعصاب ڈھیلے ہو جاتے ہیں، چہرے پر جھریاں پڑ جاتی ہیں۔

دنیاوی علوم کا استاد ہو یا روحانی استاد ہو، دونوں کا ادب و احترام ضروری ہے۔ روحانی استاد اور علم حصولی کے استاد میں یہ فرق ہے کہ روحانی استاد کے پیش نظر صرف اللہ ہوتا ہے۔ دنیاوی غرض، لالچ، طمع کچھ نہیں ہوتا، روحانی استاد کے ذہن میں شاگرد کی اصلاح و تربیت کا ایک مکمل پروگرام ہوتا ہے کہ شاگرد غیب کی دنیا سے واقف ہو جائے، اسے عرفان ذات حاصل ہو جائے، روحانی استاد تعلیم دیتا ہے کہ اللہ سے دوستی کی شرط یہ ہے کہ بندہ وہ کام کرے جو اللہ کے لئے پسندیدہ ہے۔

روحانی استاد بتاتا ہے کہ روحانی انسان کا تعلق اللہ کے ساتھ قائم ہے، روحانی انسان وہی کام کر کے خوش ہوتا ہے جو اللہ کی صفت ہے۔

جواری کی دوستی کا تقاضا یہ ہے کہ دوست کے ساتھ جا کر کلب میں جوا کھیلے، شطرنج کے کھلاڑی سے دوستی شطرنج پر مہارت حاصل کرنے کی متقاضی ہے۔

مصور کی دوستی آدمی کو ماہر مصور نہ بھی بنائے تو اسے اس قابل ضرور بنا دیتی ہے کہ وہ کینوس پر آڑھی ترچھی لکیریں کھینچ کر خدوخال اور نقش و نگار واضح کر دے، سینما دیکھنے کا شوقین پیسے خرچ کر کے دوست کو فلم دکھانے کے لئے لے جاتا ہے۔

دنیاداری میں بھی دوستی اس وقت تک بااعتبار نہیں ہے جب تک دوست وہی اوصاف اختیار نہ کرے جو اس کے دوست کے ہیں، بچہ کا نو ماہ تک ماں کے پیٹ میں بظاہر حیاتیاتی ضابطوں کے خلاف پرورش پانا، پیدا ہو کر دنیا میں آنا، غذائی ضروریات پوری کرنے کے لئے ماں کے سینے سے دودھ کا چشمہ ابل پڑنا، پیدائش سے موت تک حفاظت، وسائل کا مہیا ہونا، یہ سب بندوں کی خدمت ہے جو اللہ کے قائم کردہ نظام کے تحت جاری و ساری ہے۔

اللہ کے نظام میں ہر آدمی کے ساتھ بیس ہزار فرشتے ہمہ وقت کام کرتے ہیں۔یعنی ہر آدمی اللہ تعالیٰ کا کمپیوٹر ہے جس میں بیس ہزار چپس ہیں،ایک چپ یا ایک کنکشن بھی کام نہ کرے تو پورے نظام میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔

انسان کے اندر جو مشینری فٹ ہے بیس ہزار فرشتے اس کے ایسے کنکشن ہیں جن سے انسانی مشین کے اندر بجلی دوڑتی ہے اور اس بجلی سے انسان کے اندر بارہ کھرب سیلز چارج ہوتے ہیں۔

دماغ میں دو کھرب سیلز ہیں۔ایک سیل کسی نہ کسی حس، کسی نہ کسی عضو، کسی نہ کسی شریان اور رگ پٹھوں سے متعلق ہے۔دو کھرب سیلز میں سے ایک سیل بھی متاثر ہو جاتا ہے تو انسانی جسم پر اس کے منفی اثرات مرتب ہو جاتے ہیں۔ایسے مربوط نظام کو اللہ کی جانب سے مخلوق کی خدمت کے علاوہ اور کوئی نام نہیں دیا جا سکتا۔

زمین، سورج، چاند، ستارے، ہوا کی پرواز، بارشوں کا انتظام، جمادات، نباتات، معدنیات، سمندروں میں آباد دنیائیں کس چیز کی نشاندہی کرتی ہیں۔

ہوا ناک یا منہ کے ذریعے جسم میں جاتی ہے اور مختلف نالیوں سے گزرتی ہوئی پورے جسم میں داخل ہوتی ہے۔جیسے جیسے ہوا آگے بڑھتی ہے ہوا کا دباؤ زیادہ ہوتا رہتا ہے۔ان نالیوں کا قطر بتدریج چھوٹا ہوتا جاتا ہے اور پھیپھڑوں میں موجود تین سو ملین تھیلیوں میں ہوا پہنچ جاتی ہے۔کانوں سے ہم سنتے ہیں، آواز کی لہریں کان میں داخل ہوتی ہیں، کان کے پردے پر بالوں کی ضرب سے پیدا ہونے والی گونج میں ہم معنی پہناتے ہیں۔کیا یہ سب مخلوق کی خدمت نہیں ہے؟ ان خدمات کے لئے آدمی اللہ کو کتنے پیسے دیتا ہے؟ آدمی زبانی کلامی بھی شکر ادا نہیں کرتا۔

سب تعریفیں اللہ رب اللعالمین کے لئے ہیں۔

جو عالمین کی خدمت کرتا ہے۔

جو عالمین کو وسائل فراہم کرتا ہے۔

جو عالمین کو رزق دیتا ہے۔

جو عالمین میں آباد مخلوق کو زندہ رکھنے کے لئے وسائل فراہم کرتا ہے۔

جس بندے کا اللہ سے تعلق قائم ہو جاتا ہے اس کے اندر اللہ کا وصف منتقل ہو جاتا ہے اور اللہ رب اللعالمین کا وصف خدمت ہے، کوئی نبی، کوئی رسول، کوئی روحانی آدمی ایسا نہیں گزرا جس نے اللہ کی مخلوق کی خدمت نہ کی ہو، مخلوق کی خدمت اللہ کا ذاتی وصف

ہے جو بندہ مخلوق کی خدمت کرتا ہے۔ فی الحقیقت اس نے وہ کام شروع کر دیا ہے جو اللہ کرتا ہے، جتنا زیادہ مخلوق کی خدمت میں انہماک بڑھتا ہے اسی مناسبت سے بندہ اللہ کے قریب ہو جاتا ہے، اللہ سے اس کی دوستی ہو جاتی ہے۔

روحانی استاد اپنے شاگرد کو بتاتا ہے۔

مخلوق کی خدمت اللہ کی پسندیدہ عادت ہے۔

روحانی آدمی اللہ کی مخلوق سے محبت کرتا ہے۔

جو بندہ مخلوق سے نفرت کرتا ہے اور تفرقہ ڈالتا ہے وہ اللہ کا دوست نہیں۔

اللہ کا دوست خود غرض نہیں ہوتا۔

اللہ کا دوست خوش رہتا ہے اور سب کو خوش دیکھنا چاہتا ہے۔

ماں باپ بچے کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوش ہوتے رہتے ہیں اسی طرح اللہ بھی اپنی مخلوق کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے خوش ہوتا ہے ایسی باتوں سے جس کے پیچھے خلوص نیت اور مطمع نظر صرف اللہ ہو۔

آدمی کے اندر خون کا حیرت انگیز نظام کام کر رہا ہے۔ جسم کے اندر وریدوں اور شریانوں میں دوڑنے والا خون ۲۴ گھنٹے میں ۷۵ ہزار میل سفر طے کرتا ہے، آدمی ایک گھنٹہ میں تین میل چلتا ہے۔ اگر وہ مسلسل بغیر کسی وقفہ کے ۲۶ ہزار ۳۸۰ گھنٹوں تک چلتا رہے تو تب ۷۵ ہزار میل کا سفر پورا ہوگا، کم و بیش ایک ہزار دن رات کی مسلسل مسافت انسان کی طاقت سے باہر ہے اور اللہ نے انسان کے ارادے اور اختیار کے بغیر جسمانی مشینری کو متحرک رکھنے کے لئے دل کی ڈیوٹی لگادی ہے کہ اپنے پھیلنے اور سکڑنے کی صلاحیت کو بروئے کار لا کر سارے جسم کے ایک ایک عضو کو خون فراہم کرتا رہے۔ اللہ اپنی مخلوق کی خدمت گزاری میں مصروف ہے، ہر بندہ پر لازم ہے کہ وہ شکر گزار بن کر اللہ کی مخلوق کی خدمت کرے اور اللہ کا دوست بن جائے۔

معجزہ

لفظ معجزہ کا ماخذ ''عجز'' ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ کوئی کام کرنے سے عاجز ہونا، نبوت کے وقت کے لئے خرق عادت کا ظاہر ہونا معجزہ ہے، خرق عادات انبیاء کرام کے علاوہ نوع انسانی کے دیگر افراد سے بھی صادر ہوئی ہیں۔ انبیاء اور روحانی طاقت رکھنے والے انسانوں کے کتنے ہی واقعات اس کے شاہد ہیں، پاک طنیت حضرات سے خرق عادات کا اظہار رشد و ہدایت اور تنبیہ کے لئے ہوتا ہے، روحانی سائنس کی پہلی کتاب ''لوح قلم'' میں ابدال حق حضور قلندر بابا اولیاءؒ لکھتے ہیں:

تصرف کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ معجزہ

۲۔ کرامت

۳۔ استدراج

استدراج وہ علم ہے جو اعراف کی بری روحوں یا شیطان پرست جنات کے زیر سایہ کسی آدمی میں خاص وجوہ کی بنا پر پرورش پاتا ہے، صاحب استدراج کو اللہ کی معرفت حاصل نہیں ہو سکتی، علم استدراج اور علم نبوت میں یہی فرق ہے کہ استدراج کا علم غیب بینی تک محدود رہتا ہے اور علم نبوت انسان کو غیب بینی کی حدودوں سے گزار کر اللہ کی معرفت تک پہنچا دیتا ہے۔

علم نبوت کے زیر اثر جب کوئی خارق عادت نبی سے صادر ہوتی ہے تو اس کو معجزہ کہتے ہیں۔ ختم نبوت و رسالت کے بعد یہ وراثت اولیاء اللہ کو منتقل ہوئی اور اولیاء اللہ سے صادر ہونے والی خارق عادات کرامت کہلائیں۔ لیکن یہ بھی علم نبوت کے زیر اثر ہوتی ہیں، معجزہ اور کرامت کا تصرف مستقل ہوتا ہے، مستقل سے مراد یہ ہے کہ جب تک صاحب تصرف اس چیز کو خود نہ ہٹائے وہ نہیں ہٹے گی۔ استدراج کے زیر اثر جو کچھ ہوتا ہے وہ مستقل نہیں ہوتا اور اس کا اثر فضا کے تاثرات بدلنے سے خود بخود ضائع ہو جاتا ہے، استدراج کے زیر اثر جو کچھ ہوتا ہے اس کو جادو کہتے ہیں۔

قرآن کریم نے انبیاء کرامؑ کو عطا کردہ معجزات کو اللہ کی نشانیاں کہا ہے۔

''پھر بچادیا ہم نے اس کو اور جہاز والوں کو اور رکھا ہم نے جہاز کو نشانی جہاں والوں کے لئے۔''

(عنکبوت۔۱۵)

''اللہ کی اونٹنی تمہارے واسطے نشانی ہے۔''

(اعراف۔۱۳)

سیدنا حضور ﷺ نے جب نبوت کا اعلان فرمایا تو کفار نے مطالبہ کیا کہ آپ کوئی معجزہ دکھائیں، قرآن نے مکہ کے منکرین کا مطالبہ ان الفاظ میں دہرایا ہے:

''وہ (محمد ﷺ) ہمارے پاس اپنے رب کی طرف سے کوئی نشانی کیوں نہیں لائے ہیں۔''

(سورۃ طٰہٰ۔۱۳۳)

''اس پر اس کے رب کی جانب سے نشانیاں کیوں نہیں اتاری جاتیں۔''

(عنکبوت۔۵۰)

''تو انہیں چاہئے کہ ہمارے پاس کوئی نشانی لائیں جیسے پہلے انبیاء بھیجے گئے تھے۔''

(سورۃ انبیاء۔۵)

نبی سے ظاہر ہونے والی واضح دلیل کو انبیاء کی تعلیمات جھٹلانے والے جادو اور سحر کہتے تھے۔ قرآن نے خارق عادت کے مطالبے کے جواب میں فرمایا:

''اگر یہ کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اس سے منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ جادو تو ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے۔''

(سورۃ القمر۔۲)

''کہہ دیجئے کہ بلاشبہ نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں۔''

(عنکبوت۔۵۰)

تاریخ شاہد ہے کہ انبیاء کرام سے معجزات کا ظہور اہتمام حجت کے لئے ہوا ہے لیکن ناسعید لوگ معجزہ دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائے۔

''اور بچادیا ہم نے موسیٰ کو اور جو لوگ تھے اس کے ساتھ سارے پھر ڈبو دیا ان دوسروں کو اس چیز میں عین نشانی ہے اور نہیں وہ بہت لوگ ماننے والے۔''

(سورۃ الشعراء۔۶۵۔۶۷)

حضرت صالحؑ کی قوم پتھر سے زندہ سلامت اونٹنی نکلنے کا معجزہ دیکھ کر بھی راہ راست پر نہیں آئی تو قانون قدرت نے پکڑ لیا۔

''اور تحقیق جھٹلایا حجر والوں نے رسولوں کو اور دی ہم نے ان کو نشانیاں تو وہ اس سے منہ پھیرے رہے اور تھے تراشے پہاڑوں کے گھر خاطر جمع سے پھر پکڑا ان کو چنگھاڑ نے صبح ہوتے پھر کام نہ آیا ان کو جو کماتے تھے۔''

(سورۃ حجر۔۸۰۔۸۴)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر صرف گنتی کے چند لوگ ایمان لائے، محمد رسول اللہ ﷺ کے معجزات دیکھ کر بھی کفار مکہ کے دلوں میں ایمان کی روشنی داخل نہیں ہوئی۔ جب آپ ﷺ کو ہجرت کر کے مدینہ منورہ میں ضیاء پاشی کا حکم ہوا تو کفار مکہ کے حصے میں رسوائی اور بد بختی آئی۔ آپ ﷺ اور آپ ﷺ پر ایمان لانے والے غالب اور فاتح بن کر دوبارہ مکہ میں داخل ہوئے۔ پاک باطن نفوس کے لئے سیدنا حضور ﷺ کی ذات اقدس معجزہ ہے، انہیں ایمان سے سرفراز ہونے کے لئے کسی مافوق الفطرت واقعہ کی تلاش نہی ہوتی، حضرت خدیجہؓ، حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور دوسرے نامور صحابی معجزہ دیکھے بغیر ایمان لائے۔

ہر نبی کو اس دور کے ماحول، قوم کے مزاج، عقل و فہم اور افتاد طبع کی مناسبت سے معجزات سے نوازا گیا۔ حضرت موسیٰؑ کا دور جادو ٹونہ اور سحر و طلسم کا عروج کا زمانہ تھا۔ آپؑ کو ید بیضا اور عصا کے معجزات عطا فرمائے گئے، فرعون کے دربار میں موجود ساحروں نے رسیاں اور لاٹھیاں پھینکیں جو سانپ بن گئیں۔ حضرت موسیٰؑ کو حکم ہوا:

''ڈال اپنا عصا پس وہ ان کے فریب کو نگل گیا۔''

(اعراف۔۱۱۷)

اور جب موسیٰؑ نے اپنی قوم کی سیرابی کے لئے دعا کی تو حکم ہوا۔

''پتھر پر اپنا عصا مار تب پتھر سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔''

(سورۃ بقرہ۔ ۶۰)۔

حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں علم طب عروج پر تھا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کو مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کو شفا دینے اور مردوں کو زندہ کرنے کا معجزہ عطا فرمایا۔

''اور جب تو بناتا مٹی سے جانور کی صورت میرے حکم سے پھر دم مارتا اس میں تو ہو جاتا جانور میرے حکم سے کھڑا اور چنگا کرتا ماں کے پیٹ کے اندھا اور کوڑھی کو میرے حکم سے اور جب نکال کھڑا کرتا مردے میرے حکم سے۔''

(سورۃ مائدہ۔ ۱۱۰)

حضرت صالحؑ کے دور میں مجسمہ سازی اور سنگ تراشی کا فن بام عروج پر تھا، منکرین نے اپنی ذہنی سکت کے مطابق ناممکن چیز کو ظاہر کرنے کا مطالبہ کیا۔ آپؑ نے پہاڑ کی طرف اشارہ کیا چٹان شق ہو گئی اور زندہ سالم اونٹنی اس میں سے برآمد ہوئی اور بچے کو جنم دیا۔ حضرت صالحؑ کی قوم کو تنبیہ کی گئی:

''یہ اللہ کی اونٹنی ہے جو تمہارے واسطے نشانی ہے۔''

سیدنا حضور ﷺ کی بعثت کے بعد قرآن علی الاعلان کہتا ہے:

''اے لوگو! بلاشبہ تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے سند پہنچ چکی ہے۔''

(سورۃ النساء۔ ۱۷۴)

سیدنا حضور ﷺ کی حیات مقدسہ کا ہر دور سمجھ بوجھ رکھنے والوں کے لئے اللہ کی برہان ہے۔ بعثت کے بعد حق و باطل کے درمیان تفریق ظاہر ہو گئی۔ کعبہ مسمار کرنے کے ارادے سے آنے والے لشکر سمیت کھائے ہوئے بھس میں تبدیل ہو گئے۔ برسوں سے خشک سالی کا شکار عرب باران رحمت سے سر سبز و شاداب ہو گیا۔

ایک ہزار سال سے جلائی ہوئی مجوسیوں کی آگ بجھ گئی، زلزلہ کی شدت سے کسریٰ کے محل کے چودہ کنگرے گر گئے، ہمدان اور قم کے درمیان چھ میل لمبا چھ میل چوڑا بحیرہ ساوہ خشک ہو گیا۔ کوفہ اور شام کے درمیان وادی ساوہ کی خشک ندی میں پانی جاری ہو گیا۔ معجزات اور خارق عادات کا احاطہ کرنا انسانی دسترس سے باہر ہے۔

مکہ فتح ہونے کے بعد حضور ﷺ نے صحابہ کرامؓ کے ساتھ خانہ کعبہ میں حجر اسود کو بوسہ دیا اور طواف کیا۔ خانہ کعبہ میں تین سو ساٹھ بت نصب تھے۔ حضور ﷺ نے آیت پڑھی:

''حق آیااور باطل مٹ گیا، بے شک باطل کو مٹ جانا ہی تھا۔''

یہ آیت پڑھتے ہوئے حضور ﷺ ہاتھ میں پکڑی ہوئی لکڑی سے جس بت کی طرف اشارہ کرتے تھے وہ منہ کے بل گر جاتا تھا۔

تشریح:

روحانی دنیا کا ادراک ہوتا ہے تو بے شمار حقائق منکشف ہوتے ہیں ان میں ایک انکشاف یہ بھی ہے کہ ہم مخلوق کی تخلیق میں گراف کی بڑی اہمیت ہے، کسی بھی خوردبین سے نظر نہ آنے والے چھوٹے چھوٹے چوکور خانے تخلیق میں بنیاد یا بساط کا کام کر رہے ہیں ان چھوٹے چھوٹے نظر نہ آنے والے چوکور خانوں کو ہم تانا بانا کہتے ہیں۔

مثال:

ڈرائنگ روم میں قالین بچھا ہوا ہے۔ قالین کے اوپر شیر بنا ہوا ہے۔ قالین کے اوپر یہ شیر دراصل ان نظر نہ آنے والے خانوں کی تقسیم در تقسیم ہے۔ مثال کو اور زیادہ واضح طور پر دیکھنے کیلئے گراف پیپر کو سامنے رکھئے، گراف پیپر میں چھوٹے چھوٹے چوکور خانوں پر اس طرح پینسل پھیریئے کہ ناک بن جائے، کان بن جائے، آنکھ بن جائے تو گراف پر آپ کی تصویر بنی ہوئی نظر آئے گی۔ اب ہمارے سامنے تین صورتیں ہیں ایک چوکور خانہ یعنی طولاً عرضاً لکیریں، جب ہم طولاً عرضاً لکیروں کے فاصلے کا تعین کئے بغیر کاغذ پر کھینچتے ہیں تو ہمیں چھوٹے چھوٹے خانوں کا ایک جال نظر آتا ہے اس جال پر جب پینسل سے تصویر کشی کی جاتی ہے تو تصویر واضح اور نمایاں ہو جاتی ہے اور خانے غیر واضح اور غیر نمایاں ہو جاتے ہیں۔

یہ ساری زمین مفرد اور مرکب لہروں سے بنی ہے۔ جب مفرد لہریں غالب ہوتی ہیں تو کشش ثقل لہروں کے غلبے کی مناسبت سے کم ہو جاتی ہے یا اس کی نفی ہو جاتی ہے اور جب مفرد لہر کے ساتھ ایک اور لہر مل جاتی ہے تو پھر کشش ثقل کا غلبہ ہو جاتا ہے اور اس عمل کو مرکب لہروں کا نام دیا جاتا ہے، مفرد اور مرکب لہروں میں نور اور روشنی کا اجتماع ہے، نور اور روشنی کا یہ اجتماع حرکت ہے یعنی حرکت خلاء میں اس طرح پھیلی ہوئی ہے کہ وہ اپنا تعین دو طرح سے کرتی ہے۔ ایک مفرد لہر سے دوسری مرکب لہر سے۔ لہریں خلاء میں اس طرح پھیلی ہوئی ہیں کہ نا تو وہ ایک دوسرے سے فاصلے پر ہیں اور نہ وہ ایک دوسرے سے پیوست ہیں یہی لہریں مادی اجسام کو الگ الگ کرتی ہیں اور یہی لکیریں مادی اجسام میں ایک دوسرے کی شناخت کا ذریعہ ہیں۔

موالید ثلاثہ یعنی مادی عناصر سے بننے والی مخلوق مرکب لہروں کی مخلوق ہے لیکن ہر مخلوق کی بنیاد اور حرکت مفرد لہر ہے، اگر مفرد لہر نہیں ہو گی تو مرکب لہر نہیں ہو گی۔ سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام تخلیق کائنات کے راز دان ہیں، اسرار کن فیکون کے فارمولوں

کے ماہر ہیں، جب آپ ﷺ نے ''حق آیا اور باطل مٹ گیا'' پڑھ کر چھڑی سے بتوں کی طرف اشارہ کیا تو مفرد اور مرکب دونوں لہروں کا نظام ٹوٹ گیا نتیجہ میں بت اوندھے منہ گر کر ریزہ ریزہ ہو گئے۔

بغدادی قاعدہ

دوماہ کا آدمی جب میکانکی طور پر بارہ سال کا ہوا تو اس نے سمجھا کہ حرکت میں خود کر رہا ہوں۔ اس حرکت کا نام ''میں'' رکھا گیا۔ ہر آدمی نے بڑوں سے سنا کہ:

میں بول رہا ہوں،

میں کام کر رہا ہوں،

میں خوش نہیں ہوں لیکن میں خوش رہنا چاہتا ہوں،

میں تندرست نہیں ہوں لیکن صحت مند رہنا چاہتا ہوں۔

میں نہیں چاہتا کہ میں زیور عقل سے آراستہ ہوں مگر سرپرستوں نے پرکھوں کے نقش قدم پر چل کر مجھے سخت سست کہا، مار پیٹ کر دانش گاہ بھیج دیا۔

بزعم خود۔ پڑھے لکھے۔

''میں'' کے خول میں بند، استادوں نے مجھے اپنے پیدائشی تشخص اور بچپن سے دور کر دیا۔

بچپن روٹھ گیا۔

تعلیم و ہنر کا تاج سر پر سجا،

تاج پوشی اس لئے ہوئی کہ بے عقلی (معصومیت) سے دستبردار ہو کر میں عقلمند بن گیا۔

معصومیت سے دور ہونے کے لئے مجھے ہر وہ کام کرنا پڑا جو بے عقلی کے متضاد ہے، ابھی دودھ کے دانت ٹوٹے نہ تھے کہ ابا نے انگلی پکڑ کر قاعدے پر بنی ہوئی ایک لکیر پر رکھی اور کہا پڑھ ''الف'' پڑھ ''ب''۔ بے عقلی نے بتایا یہ سب دلیل کے بغیر ہے، مفروضہ

ہے، کھڑی لکیر الف اور پڑی لکیر کو ب کہا جارہا ہے، پڑی لکیر ''الف'' کیوں نہیں اور کھڑی لکیر کو ''ب'' کیوں نہ پڑھا جائے؟ یہ اس وقت کی بات ہے جب دادی اماں زندہ تھیں، جب لکیر الف اور ب کا مسئلہ لا حاصل نظر آیا تو اباجی نے لاٹھی دکھائی رعب دار آواز میں پوچھا یہ کیا ہے؟ توتلی زبان بولی ''دادی اماں تی لاتھی اے۔''

پھر چھن کر کے دماغ میں گونجار ہوئی، دادی اماں کی لاٹھی ''الف'' ہے، بے عقل شعور خوف زدہ ہو کر سہم گیا اور ننھی سی جان نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے پڑھا ''الف'' ''ب'' اور اس طرح بغدادی قاعدے کے ۲۸ حروف رٹا دیئے گئے۔ دو کم ستر سال گزر گئے مگر آج بھی یہ عقدہ نہیں کھلا کہ الف، ب کیوں نہیں اور ب الف کیوں نہیں ہے؟ جب کہ الف ''الف'' ہے، ب ''ب'' ہے۔ یہ بات ایک ایسا سوالیہ نشان ہے کہ دنیا کا کوئی دانشور، کوئی مولوی، کوئی علامہ، کوئی مفتی، کوئی قاضی اور کوئی سائنٹسٹ اس کا جواب نہیں دیتا۔

سوچ

آدمی معین مقداروں سے تخلیق ہوا ہے، اس تخلیق میں معین مقداریں (لہریں زندگی بنتی ہیں۔ یہ لہریں نہ ہوں تو زندگی موت بن جاتی ہے، ہمارا مشاہدہ ہے کہ متعین طول موج سے کم یا زیادہ فریکوئنسی کی آواز آدمی نہیں سن سکتا۔ دن کی روشنی میں آدمی زیادہ دور دیکھ لیتا ہے، جب کہ رات کی تاریک روشنی میں آدمی کم دیکھتا ہے، کتے بلیوں میں آدمی سے زیادہ قوت شامہ ہے، آدمی کی جسمانی قوت حیوانات سے کم ہے لیکن پھر بھی ہر شئے ہر آدمی کو فوقیت حاصل ہے کیوں؟

اس لئے کہ انسانی دماغ میں بجلی زیادہ ذخیرہ ہوتی ہے، انسانی دماغ جو ایک چھوٹا سا عضو ہے سائنس دان اسے تمام تر صلاحیتوں، قوت اور توانائی کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں، اس میں معلومات اکھٹا کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت ہے، سب سے بڑھ کر یہ جمع شدہ معلومات سے نئی نئی اچھوتی اور انوکھی باتوں کو جنم دیتا ہے لیکن اگر بجلی کی رو نہ آئے تو لوہے سے بنے ہوئے ایسے روبوٹ کی طرح ہے، جس میں کرنٹ نہ ہو۔

جب آدمی زمین پر نہیں تھا تو ایسی جگہ تھا جہاں اسے ہر چیز بغیر مشقت کے مل جاتی تھی، اسے محنت مشقت کی عادت نہیں تھی، زمین پر آنے کے بعد اسے مشقت بھری زندگی ملی، انسان کی ہمیشہ یہ خواہش رہی ہے کہ وہ جنت کی زندگی گزارے، جنت کی زندگی کی خواہش نے اسے بے چین کیا ہوا ہے، یہ بے چینی رنگ لائی اور انسان نے خفیہ صلاحیتوں کو اجاگر کر کے ایسی مشین ایجاد کر لی جس سے کام لے کر وہ مشقت کی زندگی سے بے نیاز ہو جائے، یہ سب تو ہوا مگر آدمی نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ خفیہ صلاحیتوں کا مخزن کیا ہے؟ ان صلاحیتوں کو متحرک کرنے کے لئے کرنٹ کہاں سے آتا ہے؟ پہیہ کی ایجاد کے بعد انسان پر سہولتوں کے حصول کی راہ ہموار ہو گئی اور وہ قدم قدم آگے بڑھتے ہوئے کمپیوٹر ایج میں داخل ہو گیا۔ اب انسان اس حقیقت سے واقف ہو گیا ہے کہ کوئی بھی مشین صلاحیتوں کے بغیر کام نہیں کر سکتی، انسان جب سے دنیا میں آیا ہے وہ جنت کو زمین پر اتار لینے کے لئے کوشاں ہے۔

جیسے اس نے تفکر کیا، انسان کے اندر نصب شدہ کمپیوٹر اس کی رہنمائی کرتا رہا نتیجہ میں روبوٹ ایجاد ہو گئے، انسان ایک ہی کام کرتے کرتے اکتا جاتا ہے جب کہ روبوٹ دن رات ایک ہی کام کو دہرا سکتا ہے، روبوٹ انسانوں کے مقابلے میں موسمی تغیرات سے کم متاثر ہوتے ہیں، امریکہ اور یورپ کی بیشتر فیکٹریوں میں روبوٹ سے کام لیا جا رہا ہے، ویلڈنگ، پینٹنگ، مولڈنگ اور چیزیں اٹھانے اور رکھنے کا کام کرنے والے صنعتی روبوٹ انسانوں کی طرح کام کرتے ہیں لیکن اگر سوئچ آن نہ کیا جائے تو یہ حرکت

نہیں کرتے، ان کی ہر حرکت کو برقی آلات کے ذریعہ ایک بورڈ کنڑول پینل سے متعین کیا جاتا ہے، سوئچ آف کر دیا جائے تو کنڑول پینل سے انفارمیشن کی سپلائی منقطع ہو جاتی ہے اور روبوٹ کی حرکت ختم ہو جاتی ہے۔

یہی صورتحال انسان کی بھی ہے، انسان کو زندگی اور زندگی کے تقاضوں کے بارے میں اطلاعات فراہم نہ ہوں تو اس کے اندر کرنٹ کی سپلائی بند ہو جاتی ہے، زراعت، تعمیرات، نیوکلیئر پلانٹ، انتہائی حساس اور خطرناک شعبوں کے علاوہ خلائی تحقیق میں بھی روبوٹوں سے استفادہ کیا جارہا ہے۔ اعداد و شمار کا ریکارڈ مرتب کرنے والے روبوٹ سے شروع ہونے والی ریسرچ اس مقام تک پہنچ چکی ہے کہ انسانی دماغ میں موجود صلاحیتوں کا حامل روبوٹ بنانے کا کام ہو رہا ہے۔

ہزاروں سال کی کاوش کے بعد بھی جس مقام پر سائنٹسٹ نہیں پہنچ سکے مسلمان قرآن میں تفکر کر کے وہ مقام حاصل کر لیتا ہے:

''اور جب تو بناتا مٹی سے جانور کی صورت میرے حکم سے پھر دم مارتا اس میں تو ہو جاتا جانور میرے حکم سے چنگا کرتا ماں کا پیٹ کا اندھا اور کوڑھی کو میرے حکم سے اور جب نکال کھڑا کرتا مردے میرے حکم سے۔''

(سورۃ المائدہ۔۱۱۰)

روبوٹ لوہے سے بنی ہوئی ایک ایسی مشین ہے جس میں ذاتی حرکت نہیں ہے، سوئچ آن ہوتے ہی روبوٹ کرنٹ کا دباؤ محسوس کرتا ہے اور الیکٹران کا بہاؤ روبوٹ کے کل پرزوں میں دوڑنے لگتا ہے۔ روبوٹ کے اندر نصب کمپیوٹر برقی اطلاع کے تحت ہاتھ متحرک کرنے والے کل پرزوں کو حرکت دیتا ہے اور روبوٹ ہاتھ اٹھا دیتا ہے، کمپیوٹر میں اطلاع موصول کرنے، قبول کرنے اور تعمیل کرنے کا ایسا نظام ہے جسے دور نہیں کر سکتا، کل پرزوں میں دوڑنے والی برقی رو اگر روبوٹ میں ہے تو روبوٹ چلنے اور کام کرنے پر مجبور ہے۔

حضرت عیسیٰؑ مٹی سے چڑیا بناتے تھے اور پھر اس میں پھونک مار دیتے تھے اور مٹی سے بنائی ہوئی چڑیا اڑ کر درخت پر جا بیٹھتی تھی، مٹی سے بنی ہوئی چڑیا اور لوہے سے بنے ہوئے روبوٹ میں کیا فرق ہے؟ فرق یہ ہے کہ روبوٹ میں بجلی کرنٹ بن رہی ہے اور چڑیا میں پھونک ''جان'' بن رہی ہے۔

حضرت محمد ﷺ کا اعجاز ہے کہ امت مسلمہ کے لئے بالخصوص اور تمام نوع انسانی کے لئے بالعموم آپ ﷺ نے تسخیر کائنات کے فارمولے بیان کئے ہیں۔ ہر انسان یہ جانتا ہے کہ انسانی جسم میں اگر روح نہ رہے تو جسم روح کے بغیر روبوٹ کے علاوہ کچھ نہیں، انسان خلاء ہے، خلاء میں روح ہے، روح میں حرکت ہے، حرکت میں کرنٹ ہے، کرنٹ توانائی ہے، ہر شئے میں توانائی برقی رو ہے، برقی رو اللہ کا نور ہے۔

''اے پیغمبر ﷺ! یہ لوگ آپ ﷺ سے پوچھتے ہیں کہ روح (یعنی زندگی) کیا ہے؟ آپ ﷺ انہیں بتادیجئے روح (زندگی) میرے رب کے امر سے ہے تمہیں اس کا علم دیا گیا ہے مگر قلیل علم دیا گیا ہے۔''

ہم اس علم سے استفادہ کر سکتے ہیں، علم کا حصول اس بات کا متقاضی ہے کہ اس سے فائدہ اٹھایا جائے، اس کا مظاہرہ ہو، مزید وضاحت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

''اس کا امر یہ ہے کہ وہ جب کسی چیز کے بنانے کا ارادہ کرتا ہے تو اس چیز سے کہتا ہے ''ہو جا'' اور وہ ''ہو'' جاتی ہے۔''

روحانی سائنسی فارمولہ یہ بنا، انسان خلاء ہے، خلاء میں روح ہے، روح میں خالق کائنات کا امر ہے اور امر یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کو تخلیق کرنا چاہتا ہے تو کہتا ہے ہو جا اور وہ مخلوق کے روپ میں ظاہر ہو جاتی ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں قرآن شریف دلیل میں کہتا ہے کہ:

''اور جب تو بناتا مٹی سے جانور کی صورت میرے حکم سے پھر دم مارتا اس میں تو ہو جاتا جانور میرے حکم سے، چنگا کرتا ماں کے پیٹ کا اندھا اور کوڑھی کو میرے حکم سے اور جب نکال کھڑا کرتا مردے میرے حکم سے۔''

(سورۃ المائدہ۔۱۱۰)

حق الیقین کے لئے حضرت عزیرؑ کے بارے میں قرآن میں ارشاد ہے:

''وہ جس کا گزر ایک بستی پر ہوا جو اپنی چھتوں پر گری پڑی تھی، اس نے کہا بھلا اللہ اس کو اس کے فنا ہو چکنے کے بعد کس طرح زندہ کرے گا؟

للہ نے اس کو سو سال کی موت دے دی، پھر اس کو اٹھایا، پوچھا کتنی مدت اس حال میں رہے؟ بولا ایک دن یا اس دن کا کچھ حصہ، فرمایا تم پورے سو سال اس حال میں رہے اب تم اپنے کھانے پینے کی چیزوں کی طرف دیکھو، ان میں سے کوئی چیز سڑی نہیں ہے اور اپنے گدھے کو دیکھو ہم اس کو کس طرح زندہ کرتے ہیں تاکہ تمہیں اٹھائے جانے پر یقین ہو اور تاکہ ہم تمہیں لوگوں کے لئے نشانی بنائیں اور ہڈیوں کی طرف دیکھو کہ کس طرح ہم ان کا ڈھانچہ کھڑا کرتے ہیں۔ پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں، پس جب اس پر حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی وہ پکار اٹھا میں تسلیم کرتا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

(سورۃ البقرہ۔۲۵۹)

گدھا اس وقت زندہ ہے جب اس میں روح ہے، مردہ گدھا خلاء ہے اور سو سال کے بعد جب اس خلاء میں روح (کرنٹ یا زندگی) ڈال دی گئی تو گدھا پھر زندہ اور متحرک ہو گیا۔

عالم امر کا مظاہرہ دیکھ کر حضرت عزیرؑ پکار اٹھے:

''تسلیم کرتا ہوں کہ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔''

برقی کرنٹ اور زندگی کے بغیر ساٹھ سال کا ایک آدمی بستر پر دراز ہے، سر اور سر کے اندر دماغ ہے، ہڈیوں کے پنجرے میں دل گردے اور دوسرے اعضاء ایک دوسرے کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں۔ ہاتھ، پیر، بازو اور ٹانگوں کے جوڑ ایک دوسرے میں پیوست ہیں آکسیجن لینے کے لئے ناک کے نتھنے کھلے ہوئے ہیں۔ سانس لینے کا ذریعہ منہ اور حلق بھی ہیں، ان سب کے باوجود انسانی مجسمہ میں حرکت نہیں ہے، یہ ایک ایسے سائنسدان کی لاش ہے جس کی ایجادات میں کمپیوٹر جیسی مشین بنائی، روبوٹ بنائے، لاسلکی نظام سے دنیا کو بہت چھوٹا کر دیا ہے لیکن بستر پر دراز اس سائنٹسٹ کے اندر اب کوئی حرکت نہیں ہے، دماغ ہے مگر بے کار ہے، دل ہے مگر دھڑکن نہیں، شریانیں، وریدیں ہیں لیکن خون کا دوران مفقود ہے، آنکھیں ہیں، آنکھوں کے عضلات میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی مگر آنکھیں اندھی ہیں، ہاتھ میں پانچوں انگلیاں ہیں مگر قلم پکڑنے کی سکت نہیں ہے، پیر ہیں مگر یہ عظیم سائنٹسٹ کھڑا نہیں ہو سکتا، ایسا کیوں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جسم کے اندر سسٹم فیوز ہو گیا ہے، فضا میں بجلی ہے، آکسیجن ہے مگر جسم مردہ ہے تو کیا پھر انسان روشنیوں سے چل رہا ہے، روشنی سے جل بجھ رہا ہے؟ قرآن اس سائنس کو اس طرح بیان کرتا ہے:

''اللہ نور ہے آسمانوں اور زمین کا۔ اس نور کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طاق ہے، اس میں ایک چراغ ہے، وہ چراغ ایک فانوس میں ہے، وہ فانوس گویا ایک ستارہ ہے، موتی کی طرح چمکدار اور روشن ہے، برکت والے پیڑ زیتون سے جس کا نہ مشرق ہے، نہ مغرب ہے، قریب ہے کہ اس کا تیل بھڑک اٹھے اگرچہ اسے آگ نہ چھوئے نور پر نور ہے اور اللہ اپنے نور کے راہ بتاتا ہے جسے چاہتا ہے اور اللہ مثالیں بیان فرماتا ہے لوگوں کے لئے اور اللہ سب کچھ جانتا ہے۔''

(النور۔۳۵)

جب انسان قرآن کے بیان کردہ اس فارمولے سے واقف ہو جائے گا تو اسے بھاری بھر کم لوہے کے بنے ہوئے روبوٹ کی ضرورت پیش نہیں آئے گی، اسے سوئچ آن آف نہیں کرنا پڑے گا، اس کی سوچ روبوٹ کا کام کرے گی، وہ جو چاہے گا ہو جائے گا اور جب چاہے گا ہو جائے گا۔

"اور جب تو بناتا مٹی سے جانور کی صورت میرے حکم سے پھر دم مارتا اس میں تو ہو جاتا جانور (زندہ) میرے حکم سے۔"

(القرآن)

شق القمر

اعلان نبوت کو آٹھ سال گزر چکے تھے، ایک رات ابو جہل ایک بہت بڑے یہودی عالم اور اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ کے پاس آیا اور تلوار لہراتے ہوئے کہا:

"تم سے پہلے نبیوں نے معجزات دکھائے ہیں تم بھی کوئی معجزہ دکھاؤ۔"

یہ سن کر حضور ﷺ نے فرمایا:

"کیا تم معجزہ دیکھ کر ایمان لے آؤ گے؟ بولو کیا دیکھنا چاہتے ہو؟"

ابو جہل سوچ پڑ گیا تو یہودی عالم نے کہا:

"آسمان پر جادو نہیں چلتا"

اور ابو جہل نے آسمان کی طرف دیکھا، چودھویں کا چاند پوری آب وتاب کے ساتھ آسمان پر چمک رہا تھا، ابو جہل نے کہا:

"چاند کے دو ٹکڑے اس طرح کرو کہ چاند کا ایک ٹکڑا جبل ابو قیس اور دوسرا ٹکڑا جبل قیقعان پر آ جائے۔"

حضور اکرم ﷺ نے انگشت شہادت سے چاند کی طرف اشارہ کیا، چاند دو ٹکڑے ہو گیا۔ ایک ٹکڑا جبل قیس اور دوسرا ٹکڑا جبل قیقعان پر نمودار ہوا۔ حضور ﷺ نے انگشت شہادت سے دوبارہ اشارہ کیا تو چاند کے دونوں ٹکڑے پھر آپس میں مل گئے، یہودی عالم یہ معجزہ دیکھ کر ایمان لے آیا مگر ابو جہل نے کہا:

محمد نے جادو سے ہماری نظر باندھ دی ہے۔"

شق القمر کی گواہی قافلے کے مسافروں نے بھی دی جو مکہ کی طرف سفر کر رہے تھے۔

اجرام فلکی میں سے چاند زمین سے قریب ترین ہے، زمین سے چاند کا فاصلہ دو لاکھ چالیس ہزار میل ہے، چاند کا قطر کم و بیش اکیس سو میل ہے، چاند کے مادے کی مقدار زمین کے مادے کی مقدار سے اسی گنا کم بتائی جاتی ہے جبکہ زمین کی کشش ثقل چاند کے مقابلے میں چھ گنا ہے۔

سائنسدانوں نے اندازہ لگایا ہے کہ تقریباً پانچ ارب سال پہلے چاند اور زمین ایک دوسرے کے بہت قریب تھے، شروع میں زمین کو اپنے محور کے گرد گھومنے میں چار گھنٹے چھبیس منٹ کا وقت لگتا تھا۔ اب چوبیس گھنٹے میں گھومتی ہے، چاند زمین کے گرد گردش کے دوران مختلف مدارج سے گزرتا ہے، گردش کے ابتدائی ایام میں چاند کا جتنا حصہ سورج کی روشنی سے منور ہوتا ہے اسے ہلال کہتے ہیں۔ ہر رات اس کے روشن حصے میں اضافہ ہوتا رہتا ہے، یہاں تک کہ چودہ دنوں میں چاند پورا ہو جاتا ہے، رفتہ رفتہ چاند گھٹنا شروع ہو جاتا ہے اور بالآخر آسمان پر سے غائب ہو جاتا ہے۔

یہ پورا چکر تقریباً ساڑھے ۲۷ دنوں میں ہوتا ہے اور ہر ماہ چاند مغربی افق پر نمودار ہوتا ہے، چاند کی سطح جو انسانی آنکھ سے اوجھل رہتی ہے، مصنوئی سیاروں کی مدد سے اس کی تصاویر حاصل کی گئی ہیں، چاند کی یہ سطح زیادہ تر پہاڑوں پر مشتمل ہے، انسانی آنکھ سے روشن چاند کی سطح پر نظر آنے والے داغ دھبے دراصل ہموار ریگستانی میدان ہیں، جو گردو پیش کی اونچائیوں سے نیچی سطح پر واقع ہیں اور روشنی کا انعکاس نہ کرنے کی وجہ سے یہ تاریک نظر آتے ہیں۔

اپالو مشن کی پروازوں کے دوران مئی ۱۹۶۷ء ORBITER-4 راکٹ سے چاند کے چھپے ہوئے رخ کی تین ہزار کلو میٹر سے تصاویر لی گئیں، ان تصویروں میں ۲۴۰ کلو میٹر طویل کئی مقامات پر ۸ کلو میٹر چوڑی دراڑ دیکھی ہے، چاند کی کشش سے سمندر کی لہروں میں مدو جزر اٹھتے ہیں، چاند سورج سے ۴۰۰ گنا چھوٹا ہے، زمین کے گرد اپنے بیضوی مدار پر گردش کرتے ہوئے چاند جب زمین کے قریب سے گزرتا ہے اور زمین اور سورج کے بیچ میں آ جاتا ہے تب سورج کی روشنی زمین تک نہیں پہنچ پاتی، یہ سورج گرہن ہے، چاند گرہن کے وقت زمین سورج اور چاند کے درمیان میں آ جاتی ہے۔

روحانی آنکھ سے نظر آنے والا چاند اس کے برعکس ہے جو ٹیلی اسکوپ دیکھتی ہے، روحانی آنکھ سے نظر آتا ہے کہ چاند پر پہاڑ، جھیلیں، تالاب، ریگستان ہیں، تالاب اور جھیلوں کے پانی میں پارے کا عنصر غالب ہے اور یہ پانی پارے کی طرح چمکدار ہے، چاند پر جنات کی مخلوق کی آمدو رفت رہتی ہے۔

چاند کی فضا میں گیس کی بو ایسی ہے جیسے ویلڈنگ کرتے وقت آتی ہے، چاند کی زمین پر چہل قدمی کرتے وقت جسم لطیف محسوس ہوتا ہے، اتنا لطیف جو ہوا میں آسانی سے اڑ سکتا ہے لیکن لطیف ہونے کے باوجود جسم ٹھوس ہوتا ہے، چاند پر کوئی مستقل آبادی نہیں

ہے، چاند ایک سیر گاہ ہے جہاں مثالی جسم جا سکتا ہے، دنیا کا کوئی فرد اس وقت تک چاند میں داخل نہیں ہو سکتا جب تک جسم مثالی سے واقف نہ ہو، نہ صرف یہ کہ جسم مثالی سے واقف ہو بلکہ ارادے اور اختیار سے جسم مثالی کے ساتھ سفر کر سکتا ہو۔

اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو کائنات پر حاکمیت عطا کی ہے، حاکمیت سے مراد یہ ہے کہ دن، رات، چاند، سورج اور ستاروں پر بھی سیدنا ﷺ حکمران ہیں۔

''اس نے تمہارے لئے رات اور دن کو اور سورج اور چاند کو مسخر کر رکھا ہے اور سب ستارے بھی اس کے حکم سے مسخر ہیں، اس میں بہت نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں۔''

(النحل۔۲۱)

''کیا تم دیکھتے نہیں ہو کہ اس نے وہ سب کچھ تمہارے لئے مسخر کر رکھا ہے جو زمین میں ہے اور اسی نے کشتی کو قاعدے کا پابند بنایا ہے کہ وہ اس کے حکم سے سمندر میں چلتی ہے اور وہی آسمان کو اس طرح تھامے ہوئے ہے کہ اس کے اذن کے بغیر وہ زمین پر نہیں گر سکتا، بیشک اللہ لوگوں کے حق میں بڑا شفیق اور رحیم ہے۔''

(الحج۔۶۵)

''کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمانوں اور زمین کی ساری چیزیں تمہارے لئے مسخر کر رکھی ہیں اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر رکھی ہیں اور انسانوں میں سے کچھ لوگ وہ ہیں جو اللہ کے بارے میں جھگڑتے ہیں، بغیر اس کے کہ ان کے پاس کوئی علم ہو یا ہدایت ہو یا کوئی روشنی دکھانے والی کتاب ہو۔''

(سورۃ لقمان۔۳۰)

''وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر کیا تا کہ اس کے حکم سے کشتیاں اس میں چلیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور شکر گزار ہو اس نے آسمانوں اور زمین کی ساری چیزوں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے، سب کچھ اپنے پاس سے اس میں بڑی نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔''

(الجاثیہ۔۱۳،۱۲)

ابوجہل اور یہودی عالم نے شق القمر کے معجزے کے بارے میں کہا تو حاکم کائنات سیدنا حضور ﷺ نے ان اختیارات کا استعمال کیا جو اللہ نے انہیں سورج کو مسخر کرنے، چاند کو مسخر کرنے اور کائنات کو مسخر کرنے کے لئے عطا فرمائے ہیں۔

اندر کی آنکھ

شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری فردوسی تصوف کے بارے میں فرماتے ہیں:

''غور و فکر کے نتیجہ میں یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ تصوف کی ابتداء حضرت آدم سے ہوئی اور حضرت آدمؑ زمین پر پہلے صوفی ہیں۔''

ایک مصری محقق ڈاکٹر مصطفی حلمی نے ''الحسبات الروحیہ فی الاسلام'' میں تصوف کی ابتداء کے بارے میں لکھا ہے:

''کہ اسلام میں روحانی زندگی کا آغاز حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں ہوا حضور ﷺ اور ان کے صحابہ ہر بات اور ہر عمل کو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اللہ ہی کی جانب متوجہ رہتے تھے، ان کا جینا مرنا سب اللہ کے لئے تھا۔''

اسلام کا پہلا دور سرکار دو عالم ﷺ اور آپ ﷺ کے صحابہ کرام کا دور ہے، سیدنا حضور اکرم ﷺ نے اپنے مخصوص شاگردوں کو باطنی علوم منتقل کئے جن کی طرف بے شمار روایات میں اشارات ملتے ہیں، حضرت ابو بکر صدیقؓ کے بارے میں ارشاد ہے کہ:

''تم پر ابو بکرؓ کو فضیلت نماز روزے کی کثرت کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اس علم کی وجہ سے ہے جو ان کے سینے میں ہے۔''

حضرت عمر فاروقؓ کے بارے میں فرمایا:

''میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو وہ عمرؓ ہوتے۔''

ہوا اور دریا پر حضرت عمرؓ کا تصرف اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ روحانی علوم سے آراستہ تھے۔ حضرت علیؓ کے بارے میں ارشاد ہے کہ:

''میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہیں۔''

اس میں واضح اشارہ ہے کہ حضرت علیؓ تصوف یاعلوم باطنیہ کا سرچشمہ ہیں، حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ مجھے نبی اکرمﷺ سے دو قسم کے علوم ملے ہیں، ایک وہ ہے جو میں نے ظاہر کر دیا ہے اور دوسرا وہ علم ہے جس کو میں ظاہر کر دوں تو تم میری گردن اڑا دو گے۔

''اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان پیدا فرمائے اور زمین کو بھی انہیں کی مانند۔ نازل ہوتا رہتا ہے امر ان کے درمیان تاکہ تم جان لو کہ اللہ ہر چیز پر کامل قدرت رکھتا ہے۔''

(سورۃ الطلاق۔۱۱)

حضرت ابن عباسؓ اس آیت کی تفسیر میں بیان کرتے ہیں کہ:

''اگر میں اس آیت میں موجود حقائق بیان کر دوں تو تم مجھے سنگسار کر دو گے اور کہو گے کہ میں کافر ہوں۔''

بلاشبہ حضرت محمدﷺ کے ان تربیت یافتہ حضرات کے سینے روحانیت اور علم حضوری سے لبریز تھے۔ حضور پاکﷺ کے صحابہ کی ایک جماعت جو خاص طور پر ''اولین صوفیہ'' کہلانے کے حق دار ہیں، اصحابہ صفہ ہیں، انہوں نے رسولﷺ کے عشق و محبت میں دنیا کی ہر شئے کی نفی کر دی تھی، ان لوگوں کے لئے مسجد نبوی میں ایک چبوترہ بنا دیا گیا تھا۔ یہ محترم حضرات حضور پاکﷺ کی سرپرستی میں عبادت و ریاضت اور مجاہدہ نفس میں مصروف رہتے تھے، روحانی علم کا حصول ہی ان کی توجہ کا مرکز تھا، حضور پاکﷺ انہیں سنف فرماتے تھے اور ان کے ساتھ نشست و برخاست کرتے تھے اور ان کی ضروریات کا خیال رکھتے تھے اور لوگوں کو اصحاب صفہ کا خیال رکھنے کی ہدایت فرماتے تھے، اصحاب صفہ نے اسلام کا نور پھیلانے کے لئے مینارہ نور کا کردار ادا کیا۔ اس کی روشنی میں لوگوں کے لئے اللہ کو تلاش کرنا آسان ہو گیا۔

صحابہ کرامؓ کی صحبت یافتہ لوگوں نے اپنے لئے تابعین کا نام پسند کیا اور پھر ان کے بعد والوں نے اپنے لئے اسی مناسبت سے تباع و تابعین کا نام منتخب کیا۔ اس کے بعد جن لوگوں کو دینی علوم کے ساتھ لگاؤ تھا وہ زاہد اور عابد کے نام سے موسوم ہوئے۔

تباع تابعین کے بعد جن لوگوں نے تزکیہ نفس سے خود کو حوادث زمانہ اور غفلت سے محفوظ رکھا اور روحانی علوم حاصل کرنے کی جدوجہد کی وہ صوفی کے نام سے پہچانے گئے، اہل باطن نے تصوف کو جن الفاظ میں بیان کیا ہے وہ یہ ہیں کہ تصوف ایک حال ہے جو روحانی ادراک سے پیدا ہوتا ہے اور اس ادراک کا محرک عشق الٰہی ہے، عشق الٰہی کی تجلیات جب روح سے متصل ہوتی ہیں تو یہ ادراک جسم مثالی میں داخل ہوتا ہے۔ جس طرح پن چبھنے سے درد کی لہر سارے جسم میں دوڑ جاتی ہے، اسی طرح عشق الٰہی کا سرور

روح کے ادراک میں سرائیت کر جاتا ہے، عشق کا یہ انجذاب نفس انسانی کو جذب و مستی میں ڈبو دیتا ہے یہی جذب و مستی وہ حال ہے جس میں نگاہ قلب اپنے آپ کو دیکھ لیتی ہے، نگاہ کا ہر درجہ تصوف کا ایک مقام ہے، بلاشبہ اس کا خارجی ہونا منجاب اللہ ہے۔

صحابہ کرامؓ کی طرز فکر کو اپنانے والوں کے اندر یہ خوبیاں موجود تھیں اور ہیں کہ ان کے قلوب اللہ تعالیٰ کے عشق میں سرشار رہتے ہیں، اللہ کا عشق رسول اللہ ﷺ کی صحبت اور ان کے انوار و تجلیات کو جذب کرنے سے پیدا ہوتا ہے، حضور پاک ﷺ کا ارشاد ہے:

"مر جاؤ مرنے سے پہلے۔"

یعنی مرنے کے بعد کی زندگی سے اس دنیا میں واقفیت حاصل کرو، خلفائے راشدین کے دور میں تصوف کا تذکرہ اس لئے نہیں ملتا کہ ان کے لطائف حضور ﷺ کی قربت میں رنگین تھے، قرن اول تک ان کے لئے پیغمبر حضرت محمد ﷺ کا اسوہ حسنہ مشعل راہ بنا رہا، ان کے شب و روز حضور ﷺ کے ساتھ گزرتے تھے۔ قران ثانی میں مسلمانوں کی دنیاوی و روحانی زندگی میں بے شمار تبدیلیاں آنا شروع ہو گئیں۔ یہ دور ۶۶۱ عیسوی سے لے کر ۸۵۰ عیسوی تک کا ہے، جس میں خلافت، بادشاہت میں تبدیل ہو گئی۔ عیش و عشرت اور جاہ طلبی حکمرانوں کا مقصد حیات بن گئی، عوام الناس کو ظلم و ستم کی چکی میں پیسا جانے لگا۔ اس پس منظر میں صوفیہ کی پہلی جماعت کھل کر سامنے آئی۔ بصرہ اور کوفہ جہاں اموی خلفاء نے ظلم و ستم کی انتہا کر دی تھی۔ تصوف کے سب سے پہلے مرکز بنے، دنیا طلبی، عیش و عشرت، تشدد و بربریت، غرور و برتری چونکہ دین اسلام کے بالکل منافی باتیں تھیں اس لئے اس دور کے صوفیہ کرام توبہ استغفار اور خشیت الٰہی پر بہت زور دیتے تھے تاکہ ان کے نفوس دنیاوی لذتوں کی بجائے پیغمبرانہ طرز فکر کو اپنا کر اللہ کے راستہ پر گامزن ہو جائیں، وہ سرکاری ملازمت اور خلیفہ کی صحبت سے اجتناب کرتے تھے تاکہ حکام کے ناجائز احکامات پر عمل کرنے سے بچے رہیں۔ وہ لوگوں کو بھی امراء و خلفاء کی محبت سے دور رہنے کی تلقین کرتے تھے تاکہ دنیا میں لوگ وظیفہ اعضاء پورا کرتے ہوئے اللہ کی جانب راغب رہیں۔ ان قدسی نفوس حضرات نے لوگوں کی انحطاطی روش کو پہچان لیا تھا کہ رسول اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں عام لوگوں کی توجہ کا مرکز اللہ کی ذات اور پیغمبر حضرت محمد ﷺ کی ذات تھی جو ان کے درمیان اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں کا عملی نمونہ بن کر موجود تھے، مگر ان کے بعد لوگوں کی توجہ کا مرکز اللہ کے بجائے دنیا بن گئی جس کی وجہ سے اس دور کے صوفیاء نے ان تمام چیزوں سے کنارہ کر لیا جو اس راہ میں مانع تھیں اس طرح ان کا ذہنی اور روحانی رابطہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ قائم رہا۔

"جو لوگ ہماری راہ میں جدوجہد کرتے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں کھول دیتے ہیں۔"

(القرآن)

اس ارشاد کے مطابق اللہ تعالیٰ نے ان قدسی حضرات کو اپنی ذات سے قریب کر کے انہیں اپنی صفات سے آراستہ کر دیا اور وہ وارثین انبیاء کہلائے ان پر روحانی ادراک مشاہدات کے ذریعے معرفت الٰہی کے دروازے کھل گئے۔

تاریخ شاہد ہے کہ پانچویں ہجری سے آٹھویں ہجری تک کا دور تصوف کا بہترین دور ہے، آٹھویں صدی ہجری کے بعد تصوف کی مقبولیت میں اضافہ ہوا اور ان ہی بنیادی اصولوں پر چلتا رہا جو اس سے پہلے دور میں رائج تھے۔ جب ساری دنیا میں مسلمان پھیل گئے اور غیر مسلموں کے ساتھ جنگوں کا سلسلہ بڑھ گیا تو تصوف کے علمی ذخیرے کو بہت نقصان پہنچا۔ بغداد جو علوم کا مرکز تھا تاتاریوں نے اسے آگ لگادی اور چن چن کر تصوف کی وہ نادر کتب جلادیں جو آنے والی نسلوں کے لئے مشعل راہ بننے والی تھیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ تدریج وتدوین کا کام رک گیا اور لوگوں کا رجحان تصوف وروحانیت سے ہٹ کر صرف دنیاداری کی طرف ہو گیا۔ ہم جب گذشتہ پانچ سو سال کی تاریخ پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ نظر آتا ہے کہ اس دور میں نسل انسانی نے فنون لطیفہ میں عروج حاصل کیا اور اس کے ساتھ ساتھ کئی ایجادات سامنے آتی رہیں، سیر وسیاحت، ذرائع آمد ورفت کے نئے اور آسان ذرائع عمل میں آ گئے، اس کے علاوہ خبر رسانی میں آسانیاں پیدا ہو گئیں جو شعوری ارتقاء کے لئے مفید ثابت ہوئیں۔

آدم کا شعور دنیاوی راحت اور آرام کا متلاشی ہے، شعوری ارتقاء اسی وقت ہوتا ہے جب ایجادات ہوں۔ نت نئی ایجادات سے لوگوں کی طرز فکر بدلنے لگی، دنیاوی تقاضوں کی تکمیل ہی مقصد حیات بن گئی، نفس کو ضرورت سے زیادہ دنیاوی آرام اور راحت مل جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع نہیں کرتا، جب اس دور کے صوفیاء نے لوگوں کی یہ حالت دیکھی تو بادشاہوں کے درباروں میں بھی جانے سے دریغ نہیں کیا تاکہ لوگوں کو اللہ کی جانب توجہ دلائیں مگر وہ لوگوں کی طرز فکر تبدیل نہیں کر سکے تو انہوں نے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔

ڈیڑھ سو سال سے سائنس ترقی پذیر ہے۔ یہ دور عقل انسانی کے لئے عروج کا دور کہلاتا ہے، کل تک جو چیزیں غیب تھیں آج شعور بن چکی ہیں۔ فاصلے مٹ گئے ہیں اور اس نظام کے ذریعے دور دراز کی آوازیں سننا اس طرح ممکن ہو گیا ہے جیسے ایک کمرے میں بیٹھ کر لوگ باتیں کرتے ہیں۔ زمین کے اندر اور آسمان کے نیچے کیا ہے؟ یہ دیکھنا ممکن عمل بنا دیا گیا ہے لیکن اس عروج کے ہوتے ہوئے بھی انسانی ذہن مصیبت میں مبتلا ہے، سکون ختم ہو گیا ہے، بیماریوں نے اس کو جکڑ لیا ہے۔ ہر شخص بے چین وپریشان ہے، خوف اور عدم تحفظ کے احساس نے نوع انسانی کو زندہ درگور کر دیا ہے، سرمایہ دارانہ نظام کے ٹھیکیداروں نے عوام کو اپنا غلام بنالیا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ جب بھی عوام کو لقمہ تر سمجھنے کی کوشش کی گئی اور لوگوں کے لئے آزاد زندگی کی راہیں مسدود کر دی گئیں، نظام الٰہی کے تحت قدرت کے نمائندے سامنے آئے اور طاغوتی قوتیں جہنم واصل ہو گئیں۔ اللہ تعالیٰ رب العالمین نسل انسانی کی بقا

چاہتے ہیں اور نسل انسانی کی بقا کا انحصار توحید پر اجتماع ہے، مادیت کا جب غلبہ ہو گیا اور اللہ کی مخلوق بے آرام، بے حال، بیمار اور فنا ہونے لگی تو اللہ کی رحمت حرکت میں آئی اور خالق نے مخلوق کے لئے ایک نجات دہندہ بھیجا جو موجودہ حالات اور تقاضوں کے مطابق لوگوں کو سکون و آتشی کے راستے پر چلائے اور ظاہری تعلیمات کے ساتھ ساتھ روحانی اور باطنی علوم سکھائے، اس صدی کے یہ عظیم المرتبت ہستی ابدال حق قلندر باباولیاءؒ ہیں، یہ بات علی الاعلان کہی جاسکتی ہے کہ آٹھویں صدی ہجری میں تصوف پھر ایک نئے دور میں داخل ہوا ہے اور اس نئے دور میں تصوف کی راہ پر چلنے والوں کی قیادت حضور قلندر باباولیاءؒ کر رہے ہیں، چودہ سو سال میں بتدریج نشو و نما کے بعد آج تصوف اس دور میں داخل ہو چکا ہے جس دور میں قرآن کے سربستہ رازوں کو کھول کھول کر بیان کرنا آسان ہو گیا ہے۔

کائناتی فارمولوں سے پردے اٹھائے جا رہے ہیں اور کائنات کی تخلیق میں کام کرنے والے انتظامی امور کو سمجھنے کی صلاحیت ابن آدم کے اندر پیدا ہو گئی ہے، گویا آدم کے اندر خلافت و نیابت کا ذہن متحرک ہو گیا ہے، جب آدم دنیاوی خلافت کے ذہن سے کام کرتا ہے تو ایجادات ظہور میں آتی ہیں اور جب آدم اللہ کی نیابت کے ذہن سے کام کرتا ہے تو اس کا ذہن کائناتی فارمولوں اور غیب میں کام کرنے والے عوامل کے اندر کام کرتا ہے۔ انسانی ایجادات کے سائنسی علوم ہیں اور غیب میں ریسرچ سے قوانین فطرت روحانی اور ماورائی علوم سامنے آئے ہیں۔

سائنسی علوم اور روحانی علوم دونوں کا منبع اللہ کا امر ہے اور اللہ کے امر کا نزول روح پر ہو رہا ہے، انسان اگر قرآن اور آسمانی کتابوں پر غور و فکر کرے تو خود اسے اپنے اندر فطرت کے تمام نظام موجود نظر آئیں گے اور وہ جان لے گا کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کا مظاہرہ دو رخوں میں ہو رہا ہے۔

ایک رخ میں مادی اور ظاہری کائنات ہے اور دوسرے رخ میں باطنی کائنات ہے جو انسان کے قلب میں جاری ہے، ظاہر اور باطن دونوں میں دیکھنے والی آنکھ انسان کی آنکھ ہے اور اس آنکھ کی بینائی اللہ کا نور ہے۔ یہ نور ہی انسان کے ظاہر اور باطن دونوں مشاہدات کا واسطہ بنتا ہے۔

سچا مذہب

"تم پر اللہ کا نور نازل ہوا ہے۔ یہ کتاب اندھیروں سے نکال کر دنیائے نور کی طرف لے جاتی ہے اور سیدھے راستے پر ڈال دیتی ہے۔"

(القرآن)

"مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔"

(حدیث شریف)

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب ہمارے پاس اللہ کی دی ہوئی ایسی کتاب موجود ہے جو اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لے جاتی ہے تو ہم زمین پر بدحال اور بے عزت کیوں ہیں؟ کون سی وجہ ہے جس کی بنیاد پر ہمارے بہترین تشخص نے کمترین لباس پہن لیا ہے؟ ہمارے پاس اللہ کا پیغام اور کھلی نشانیاں اپنی صورت میں موجود ہیں اور ہم رسول اللہ ﷺ کے اسوہ مقدس سے بھی مانوس اور متعارف ہیں، ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ ایک زمانہ تھا کہ کل ہمارے اسلاف علمی میدان میں اتنے آگے تھے کہ دوسرے ان کی گرد راہ کو بھی نہیں پہنچ سکتے تھے، دنیا کے اقتدار پر ہمارا قبضہ تھا، حکمرانی ہمارے گھر کی لونڈی تھی، مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق تک اسلام کا غلبہ تھا۔

یورپین ممالک میں مسلمانوں نے کئی صدیاں حکومت کی، عروج ہمارے ماتھے کا نشان تھا اور زوال ہمارے پیروں تلے اپنے سانس گن رہا تھا، پھر کیا ہوا کہ ہماری عظمت خاک میں مل گئی، حکمران غلام بن گئے، علم کی جگہ جہالت نے ہمارے اوپر اپنے دبیز سائے ڈال کر اشرف المخلوقات کی صف سے نکال کر حیوانات کے گروہ میں شامل کر دیا۔

شاہراہ حیات پر ہم پیچھے رہ گئے، ہمارا اقتدار تو خاک میں مل گیا تھا، ہم دوسروں کے اس طرح محتاج ہو گئے کہ ہماری حیثیت ایک بھکاری کی بن گئی۔ انتہا یہ کہ ہم علم میں بھی غیر مسلم کے سامنے کاسۂ گدائی لے کر کھڑے ہوئے ہیں، ہم کیوں بھول رہے ہیں کہ ہمارے پاس ایسی کتاب موجود ہے جس میں معاشرے کے مسائل کا حل تاریخ انسانی کے عبرت آموز واقعات اور قوموں کے

عروج وزوال کے اسرار کی نشان دہی کی گئی ہے، ہم جو ایک زمانہ میں باعزت قوم تھے، ہم جو عروج کی نشانی تھے، علم کی تفسیر تھے پیچھے کیوں رہ گئے؟ اللہ کی کتاب ''کتاب المبین'' کے انوار میں اس کا جواب تلاش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

چار سو سال پہلے جب یورپ اللہ کی زمین میں سے فولاد، تیل، کوئلہ اور معدنیات تلاش کر رہا تھا ہم تفرقہ کی بنیاد پر ثابت کرنے پر لگے ہوئے تھے کہ نجات اس بات میں ہے کہ کوئی بندہ دیوبندی، بریلوی ہو، اہل حدیث ہو اور وہابی یا نجدی ہو، ہم لکیر کے فقیر بن کر زمین پر تیز رفتار سے چلنے کے بجائے چوپایوں کی طرح چلتے رہے، ہم نے جمود کا نام قناعت رکھ لیا، آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے قدم اٹھانا اپنے لئے معراج سمجھا، شب و روز فروعی مسائل میں الجھتے رہے، یورپ خداداد صلاحیت کو کام میں لا کر قرآن میں بیان کردہ اللہ کی زمین کے اوپر اور نیچے ترقی کے وسائل تلاش کرتا رہا، نتیجہ میں انہوں نے تیز رفتار ٹرین اور ہوائی جہاز بنائے جس کے ذریعے طویل فاصلے پر دسترس حاصل کر لی جیسی کیلکولیٹر سے ترقی کرتے ہوئے آج سپر کمپیوٹر تک جا پہنچے۔ باہمی رابطے کے لئے ٹیلی فون سے ترقی کرتے ہوئے انٹرنیٹ کو عام کر کے پوری دنیا کو مواصلاتی اتحاد کی ایک لڑی میں پرو دیا۔ ان کی شعوری ترقی کا یہ عالم ہے کہ انہوں نے ہتھیلی کے برابر ڈسک CD میں دنیا بھر کی معلومات کو بند کر دیا اور جب اپنی طاقت کا لوہا منوانے کے لئے اہل یورپ آتش گیر مادے کی طرف متوجہ ہوئے تو ایسے مہلک ہتھیار بن گئے کہ خوف و دہشت سے ہماری قومی حمیت تختہ دار پر چڑھ گئی۔

ہم مسلمانوں کے زوال کی داستان اتنی غمناک ہے کہ آج کا نوجوان جب اپنی تاریخ پڑھتا ہے تو اسے اپنے اسلاف کا کردار بدنما اور گھناؤنا لگتا ہے، یورپ نے آپس کی ریشہ دوانیوں سے اور مسلمان قوم کی فرقہ بندیوں سے فائدہ اٹھا کر اسلامی حکومتوں کو پامال کر دیا اور تمام اسلامی ممالک پر قبضہ کر لیا۔ مسلمان ہر جگہ پر پست ہوتا چلا گیا، شکست اس کا مقدر بن گئی جب کہ یہ سب پہلے ہی واضح اور روشن کتاب میں بیان کر دیا گیا ہے، یہ وہی کتاب ہے جس کے بارے میں ہمارا قوی دعویٰ ہے کہ ہم اس کتاب پر یقین رکھتے ہیں اور ہمارا ایمان ہے کہ یہ کتاب اللہ کی طرف سے ہمیں عنایت کی گئی ہے، تمام آسمانی کتابیں اور تاریخ اس حقیقت کو بیان کرتی ہیں کہ بقا صرف ان قوموں کا نصیب ہے جو خود زندہ باقی رہنا چاہتی ہیں۔ جمود، عیاشی، کاہلی، بے یقینی اور اپنے اسلاف کے روشن ورثے سے انحراف قوموں کو ختم کر دیتی ہے، صفحہ ہستی سے ان کا نام مٹ جاتا ہے ایسی قومیں ذلیل وخوار ہوتی ہیں، زمین پر ان کا وجود بوجھ بن جاتا ہے، ہمارے بادشاہوں نے (جب کہ اسلام میں بادشاہت نہیں ہے) اپنے درباروں کو اس طرح سجایا اور آرام و آسائش کے ایسے سامان جمع کئے کہ وہ آرام و آسائش میں ڈوب کر رعایا کی بہبود سے غافل ہو گئے، جب ایسا ہوا تو حکام کے سینے رحم سے خالی ہو گئے، معاشرہ درہم برہم ہو گیا، اخلاق انحطاط پذیر ہوتے ہوتے بداخلاقی اخلاق بن گئی لوگوں نے درندگی کو اپنا شعار بنا لیا، بادشاہوں نے غیر اسلامی قدروں کو ایک کر مطربوں، سرمایہ داروں اور خوشامدیوں کو نوازا لیکن ارباب علم و دانش سے اچھا سلوک نہیں کیا اور ایسی داستان عبارت ہوئی کہ بادشاہت ختم ہو گئی اور قوم مفلوک الحالی کی منہ چڑاتی مثال بن گئی۔

ہم جب اسلام کی قدروں کا جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اسلام ضعیفوں، معذوروں اور یتیموں کا کفیل بنا، اسلام نے مردہ اسلامی قدروں کو دوبارہ بحال کیا اور خالق سے قریب ہونے کا طریقہ بتایا، اسلام نے سکھایا کہ مخلوق کا احترام اور مخلوق کی عظمت اس میں ہے کہ مخلوق کا رشتہ خالق سے قائم ہو اور اس طرح قائم ہو کہ مخلوق خالق کو جانتی ہو اور خالق مخلوق کو جانتا ہو۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ:

''جب ایک عابد خدا کے ذکر کو اپنا معمول بنالیتا ہے، رفتہ رفتہ اسے بدی سے نفرت ہو جاتی ہے اور کوئی ترغیب اسے گناہ کی طرف مائل نہیں کر سکتی یہ وہ منزل ہے جہاں اللہ اس کے دل کو اپنی مٹھی میں لے لیتا ہے، اس کی روح ایک زندہ اور پائندہ روح بن جاتی ہے اور جب بندوں کا اللہ سے رابطہ ہو جاتا ہے تو اللہ ہر قدم پر ان کی مدد کرتا ہے۔''

''اے ایمان والو! تم اللہ کا وہ احسان یاد کرو جب (جنگ احزاب میں چوبیس ہزار) حملہ آوروں نے تم پر ہلہ بول دیا تھا اس وقت ہم نے ان پر تیز آندھی چلائی اور آسمان سے ایسے لشکر اتارے جنہیں تم نہیں دیکھ سکتے تھے، یہ اس لئے کہ اللہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا تھا اور تم اس کی امداد کے مستحق تھے۔''

(القرآن)

تاریخ شاہد ہے کہ اللہ نے ظہور اسلام کے بعد پانچ سو برس تک ہمیں ہر ہر میدان میں فتح سے نوازا ہم نے جس سمت رخ کیا فتح نے ہمارے قدم چومے اس لئے کہ اللہ ہمارے ساتھ تھا دوسری طرف قیصر و کسریٰ کو ان کا بے اندازہ سامان اور بے شمار فوج اس لئے تباہی سے نہیں بچا سکے کہ وہ اللہ کے لطف و کرم سے محروم ہو چکے تھے۔ اللہ کے لطف و کرم کے دروازے ہمارے اوپر بند ہو گئے ہیں، اگر ہم اپنا محاسبہ کر کے یقین کے ساتھ دل کی گہرائیوں سے الل کے احکامات اور رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات پر عمل کر کے نیکو کار زندگی کے پابند ہو جائیں تو اللہ کا وعدہ سچا ہے۔

''جو لوگ اللہ کے لئے جدوجہد کرتے ہیں، کوشش کرتے ہیں، اللہ کی پھیلائی ہوئی نشانیوں پر تفکر کرتے ہیں، اللہ کو اپنا جانتے ہیں، اپنا مانتے ہیں، اللہ کو اپنے قریب محسوس کرتے ہیں، ایسے لوگوں پر اللہ ہدایت کے راستے کھول دیتے ہیں۔''

اور جب ہم ان راستوں پر چل کھڑے ہوں ے جن راستوں کو اللہ نے ہدایت کا راستہ کہا ہے تو وہی شوکت، وہی عظمت ہمیں مل جائے گی جو پانچ سو سال پہلے ہمارے اسلاف کا ورثہ رہا ہے اور اگر ہم خواب خرگوش سے نہ جاگے، نفرتوں میں بٹی قوم صراط مستقیم پر گامزن نہ ہوئی، اللہ کی رسی کو متحد ہو کر مضبوطی سے نہ پکڑا تو ہم تاریک راستوں پر بھٹکتے رہیں گے، غلامی ہمارے اوپر مسلط ہو جائے گی، ہماری نسلیں بے بس ہو جائیں گی اور دوسری قومیں انہیں نگل جائیں گی۔

اسلام کسی ایک شعبے کا نام نہیں ہے، اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے، اسلام نظام زندگانی میں ایک مرکز ہے، ایک وحدت ہے، ایک یونٹ ہے، ایک روشن شاہراہ ہے، اسلام ایک ایسادریا ہے جس میں ہدایت کو شفاف لہریں نکلتی ہیں، یہ لہریں زبان اور دل کے یقین کے ساتھ ''ایمان'' ہیں مٹی کی سڑاند سے بنے ہوئے اسفل جذبات کو کنٹرول کر کے اعلیٰ جذبات میں داخل ہونا ''اسلام'' ہے، اللہ کی مخلوق کو آرام پہنچانا، ذی احتیاج لوگوں کی ضرورتوں کو پورا کرنا یتیموں پر دست شفقت رکھنا، بیواؤں کی خبر گیری کرنا، پریشان حال لوگوں کو پریشانیوں سے نکال کر آسائش مہیا کرنا مخلوق کے لئے راحت اور آسائش کے وسائل فراہم کرنا ''اسلام'' ہے۔

عروج وزوال کے اسباب کو تلاش کرنا وحدانیت کو انفرادی طور پر نہیں بلکہ اجتماعی اور مشاہداتی طور پر تسلیم کرنا، اپنے اسلاف کے شعار کی پیروی کرنا اور اجتماعی مفادات کو پوری اسلامی برادری میں پھیلا دینا ''اسلام'' ہے، اللہ کے مال، اولاد اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنا ''اسلام'' ہے، اللہ کا حکم ہے:

''اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔'' چند ارکان کو اپنا کر باقی احکامات سے بے نیاز ہونا اسلام ہر گز نہیں۔

دو یونٹ

اللہ تعالیٰ نے کائناتی نظام قائم کرنے کے لئے لاکھوں دنیاؤں کو دو یونٹ پر تخلیق کیا، جب تک یہ ظاہر اور باطن یونٹ پرت در پرت وجود میں نہ آئیں تو ایک یونٹ نہیں بنتا، تخلیق کا یہ قانون نباتات، جمادات، حیوانات اور حیوانات میں ایک ممتاز حیوان آدم سب پر جاری و ساری ہے۔

آدم کی تخلیق سے پہلے کائنات میں موجود لاکھوں دنیاؤں میں حیوانات میں ممتاز ایک مخلوق ''جن'' موجود تھی۔ یہ مخلوق بھی پرت در پرت دو یونٹوں میں آباد تھی، یہ مخلوق آج بھی آباد ہے۔

آدم کی تخلیق میں بھی دو یونٹوں کا عمل دخل رکھا گیا جو آدم و حوا کے نام سے پہچانا جاتا ہے، جنت سے جب آدم و حوا زمین پر آئے تو ان سے جو تخلیق عمل میں آئی وہ بھی دو یونٹ کی تخلیق ہے، کہا جاتا ہے کہ ایک زمانے میں انسانی معاشرے میں حوا یعنی عورت کی حاکمیت بھی قائم رہی ہے، مادری نظام کا یہ زمانہ لاکھوں سال قائم رہا، بچے کی پیدائش اور اس کی نشوونما پر غور کیا جائے تو عورت کی بالادستی واضح طور پر سامنے آتی ہے، مادری نظام فطرت سے قریب ہے اس لئے کہ رحم مادر کی زندگی سے پیدائش تک اور پیدائش کے بعد سن بلوغت تک سترہ اٹھارہ سال کا زمانہ عورت کی سرپرستی اور حاکمیت کا زمانہ ہے اور یہی وہ دور ہے جو بچے کی نشوونما کے لئے فطری دور کہا جا سکتا ہے، جب سے یہ دنیا قائم ہے اور قائم رہے گی ترتیب و تواتر سے مستحکم یہ نظام فطرت غیر شعوری طور پر ارتقاء کے مراحل میں تبدیل ہوتا رہا ہے اور جب تک زمین آباد ہے تبدیل ہوتا رہے گا۔

بچہ وہی عادات و اطوار اپناتا ہے جو اسے ماں سے ملتی ہے اور بچہ وہی زبان بولتا ہے جو ماں کی زبان ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا کا ہر دانشور چاہے وہ دنیا کے کسی بھی خطے میں آباد ہو بچے کی زبان کو مادری بالادستی نظر آئے گی، غذا کا بندوبست کرنا آفرینش سے عورت کے ذمہ تھا اور آج بھی ہے، تخلیق میں مرد اور عورت کی ذمہ داری کا ادراک کیا جائے تو یہ نظر آتا ہے کہ عورت ایسا شاہکار ہے جو نئے نئے شاہکار تخلیق کرتی ہے، تاریخ کے مختلف ادوار میں اولاد ماں سے منسوب کی جاتی رہی ہے اور اولاد کی پہچان اور شناخت ماں سے تھی، ماں سے ہے جو اسے نو ماہ پیٹ میں رکھ کر تخلیقی مراحل سے گزارتی اور پیدا کر کے اپنے خون سے پرورش کرتی اور تربیت کرتی ہے۔

وراثت ماں کی نسبت سے متعین کی جاتی ہے، جب نسل آدم بڑھ گئی تو مرد نے زراعت کے ذریعے معاشرتی امور میں عملاً حصہ لینا شروع کر دیا، مرد نے عورت کے مقابلے میں خود کو احساس کمتری میں مبتلا پایا، اسی احساس کمتری کی شدت کی وجہ سے افراد میں ربط ضبط بڑھا، احساس کمتری کے مارے ہوئے اور جنسی لذت کے مغلوب مرد نے مادری نظام پر حملہ کیا اور اخلاقی قدروں کو توڑ دیا، عوام کی اجتماعی قوت استعمال کر کے حکومت اور بادشاہی حاصل کر لی، اسی پر بس نہیں ہوئی مادری نظام کو منہدم کر کے عوام کو اپنا غلام بنالیا اور اس توسیع پسندی نے احساس برتری کی آخری منزل پر اسے پہنچادیا اور وہ دیوتا اور خدا بن بیٹھا، اس نظام میں تبدیلی تین ہزار سال قبل مسیح میں آئی لیکن یہ عمل صرف عراقی اقوام، سومیری اور آشوری وغیرہ تک محدود رہا۔

پدری نظام میں اتنا زیادہ فساد برپا ہو گیا کہ وہ کسی طرح بھی فطرت کے مطابق نہیں رہا، جب سے وراثت باپ کی طرف سے منتقل ہونا شروع ہوئی بھائی بھائی کا دشمن بن گیا، بھائی نے بھائی کو قتل کر دیا، قید کر دیا اور اس کی آنکھیں اندھی کر کے خود تخت پر بیٹھ گیا، حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے گیارہ بھائیوں کی تاریخ بھی ہمارے سامنے ہے۔

جب ہم فطرت الٰہیہ پر غور کرتے ہیں تو اس بات کا مشاہدہ ہوتا ہے کہ عورت، مرد، جنات اور تمام مخلوق کے مالک اللہ نے تمام انسانوں کو مساوی حیثیت عطا کی ہے اور نوع انسانی کو مرد و عورت دو یونٹوں سے منسوب کیا ہے، نبی اکرم بانی اسلام ﷺ نے فرمایا کہ:

”ہم سب آدم و حوا کی اولاد ہیں اور آدم و حوا کے پتلے مٹی سے بنائے گئے تھے، کسی کو اگر کسی پر فضیلت ہے تو وہ تقویٰ کی وجہ سے ہے۔“

اس کا مطلب یہ ہے کہ عورت و مرد دونوں میں مساوات ہے، وہ بیک وقت حاکم بھی ہیں اور محکوم بھی، رہنما بھی ہیں اور پیروکار بھی، آقا بھی ہیں اور غلام اور کنیز بھی، مرد باپ اور بیٹا دونوں ہے، ایک طرف عورت ماں ہے اور دوسری طرف بیٹی ہے۔

قرآن کہتا ہے:

”اللہ نے ہر چیز کو دو یونٹ سے بنایا ہے اور ہر یونٹ دوہرا ہے۔“

یعنی اللہ نے ہر چیز جوڑے دوہرے (جوڑے) سے بنائی ہے۔ پدری نظام کے دانشور کہتے ہیں کہ عورت کو مرد کی اداسی کم کرنے کے لئے بنایا گیا ہے، جب کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ عورت اور مرد دونوں کو مساوی حقوق حاصل ہیں۔ اس سائنسی ترقی یافتہ دور میں ایک فرد بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ مرد و عورت کے مادی جسم میں ایک روح کام کر رہی ہے اور اسی روح کی وجہ سے تمام صلاحیتیں متحرک ہیں، روح کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ روح ضعیف اور کمزور ہے۔

اللہ تعالیٰ عورتوں اور مردوں کی صفات بیان کرتے ہوئے سورہ احزاب میں فرماتے ہیں:

’’تحقیق مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایمان لانے والے مرد اور ایمان لانے والی عورتیں اور قرآن پڑھنے والے مرد اور قرآن پڑھنے والیاں اور سچ بولنے والے مرد اور سچ بولنے والیاں اور عاجزی کرنے والے اور عاجزی کرنے والیاں اور خیرات کرنے والے اور خیرات کرنے والیاں اور روزہ رکھنے والے اور روزہ رکھنے والیاں اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والیاں اور یاد کرنے والے اللہ کو بہت اور یاد کرنے والیاں، اللہ ان کو بخش دے گا اور بڑا اجر دے گا۔‘‘

’’اے انسانوں! تم لوگوں کو اللہ نے ایک مرد و عورت سے پیدا کیا اور تم کو قبیلوں اور خاندانوں میں اس لئے بنایا تاکہ ایک دوسرے کو پہچان سکو یقیناً اللہ کے نزدیک وہ پسندیدہ ہے جو پرہیز گار ہے۔‘‘

شعور لاشعور

کائنات تین دائروں میں سفر کر رہی ہے:

پہلا دائرہ روح ہے

دوسرا دائرہ روح کا بنا ہوا لباس (نسمہ) ہے

تیسرا دائرہ نسمہ کا بنا ہوا لباس مادی وجود ہے۔

تینوں دائرے بیک وقت حرکت کرتے ہیں، روح کے بنائے ہوئے لباس کے دو رخ ہیں۔ ایک مفرد لہروں سے اور دوسرا مرکب لہروں سے بنا ہوا ہے، مفرد اور مرکب دونوں رخ الگ الگ بھی ہیں اور ایک دوسرے میں پیوست بھی ہیں۔ اس کی مثال ورق ہے، ورق کے دونوں صفحے لکھے ہوئے ہیں، انسان کی زندگی کے اعمال ورق کے دونوں صفحوں میں ردوبدل ہوتے رہتے ہیں، بیداری کی زندگی شعور ہے، خواب کی زندگی لاشعور ہے، شعوری زندگی میں ذہن اور حافظہ دونوں کام کرتے ہیں، لاشعوری زندگی میں بھی ذہن اور حافظہ دونوں کام کرتے ہیں، زندگی کے تقاضے شعوری ہوں یا لاشعوری اطلاعات کے تابع ہیں، شعور ہر ہر قدم پر محدود اور محتاج ہے، لاشعوری زندگی شعوری زندگی کے مقابلے میں زیادہ آزاد ہے۔

ہر انسان حواس میں زندہ ہے اور حواس کے ساتھ ساتھ تقاضوں کا ایک لامتناہی عمل اور رد عمل ہے، کائناتی نظام میں یہ بات زیادہ اہمیت کی حامل ہے کہ پورا کائناتی سسٹم نزول اور صعود پر قائم ہے، ہر اطلاع نزول کرتی ہے اور صعود کر کے دائرے کو مکمل کرتی ہے، لاشعور سے جو خیالات منتقل ہوتے ہیں وہ شعور میں آنے کے بعد عمل بنتے ہیں۔

آسمانی کتابیں شعور اور لاشعور کے الٹ پلٹ کو لیل و نہار کہتی ہیں، لیل و نہار ایک دوسرے میں الٹ پلٹ ہوتے رہتے ہیں یعنی رات دن میں داخل ہو جاتی ہے اور دن رات میں داخل ہوتا ہے۔ الٰہی قانون کے تحت رات کو دن پر سے ادھیڑ لیا جاتا ہے، پیدائش کے وقت بچے پر لاشعور کا غلبہ ہوتا ہے اتنا زیادہ غلبہ ہوتا ہے کہ ورق کا ایک صفحہ نہ صرف یہ کہ دھندلا نظر آتا ہے بلکہ اس صفحہ پر کوئی تحریر نظر نہیں آتی، جیسے جیسے بچہ ماحول میں وقت گزارتا ہے اسی مناسبت سے شعور کے کورے صفحہ پر والدین کے شعور، خاندان کے شعور، ماحول کے شعور کے نقوش یا تحریریں مرتب اور واضح ہونے لگتی ہیں۔ بارہ سال کی عمر تک وہ صفحہ جسے ہم شعور

کہہ رہے ہیں اتنا زیادہ روشن ہو جاتا ہے کہ لاشعوری صفحہ دھندلا پڑ جاتا ہے لیکن صفحہ کے اوپر نقوش ختم نہیں ہوتے۔ اگر شعور کا صفحہ اتنا زیادہ روشن ہو جائے کہ لاشعوری صفحہ کی تحریر پڑھی نہ جا سکے تو مفروضہ حواس کا غلبہ ہو جاتا ہے، بارہ سال کی عمر تک بچہ اس قابل ہو جاتا ہے یا ماحول کے زیر اثر اس کو اس قابل کر دیا جاتا ہے کہ لاشعوری صفحہ کی تحریر سے اس کی نظر ہٹ جاتی ہے اور بالغ ہونے کے بعد وہ لاشعور سے بے خبر ہو جاتا ہے۔

بے خبر ہونے کا مطلب لاشعوری تحریر کا مٹ جانا ہے، لاشعوری تحریر اگر ختم ہو جائے گی تو زندگی کا تسلسل ٹوٹ جائے گا، قدرت نے اس زنجیر کو برقرار رکھنے کے لئے شعوری اور لاشعوری حواس کو نصف نصف تقسیم کر دیا ہے، آدمی جب رات میں داخل ہوتا ہے تو دراصل لاشعور میں داخل ہوتا ہے، آدمی جب دن میں داخل ہوتا ہے تو وہ شعور میں قدم رکھتا ہے۔

پیدائش سے لے کر مرنے تک کی کل عمر میں اگر شعور اور لاشعور کے وقفوں کا تجزیہ کیا جائے تو حساب کتاب سے یہ بات منکشف ہوتی ہے کہ انسان آدھی زندگی لاشعور میں گزارتا ہے اور آدھی زندگی شعور میں رہتا ہے، یہ نظام قدرت ہر فرد میں جاری و ساری ہے، مفروضہ حواس میں آنے کے بعد اگر لاشعوری نظام برقرار نہ رہے تو زندگی کے عوامل (مرنے کے بعد کی زندگی) معدوم ہو جائیں گے۔

آسمان، زمین، جنت، دوزخ، فرشتے، جنات سب اس لئے ہیں کہ شعور اور لاشعور دونوں بیک وقت کام کر رہے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ زندگی کے ایک وقفہ میں لاشعور مغلوب ہو جاتا ہے۔ شعور و لاشعور دونوں الٹ پلٹ ہوتے رہتے ہیں، شعور کی رفتار نہایت کم اور محدود ہے۔ لاشعور کی رفتار بہت زیادہ ہے۔ تخلیقی فارمولوں سے باخبر لوگ کہتے ہیں کہ آدمی ٹائم اسپیس سے کہیں بھی آزاد نہیں ہوتا۔ آزادی کا مطلب یہ ہے کہ شعور کی رفتار زیادہ ہو جاتی ہے، اتنی زیادہ ہو جاتی ہے کہ محدودیت ٹوٹنے کا احساس نمایاں ہونے لگتا ہے۔

مثال: جب ہم سو جاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ہم ایک باغ میں ہیں، وہاں پھول ہیں، کیاریاں ہیں، درخت ہیں، درختوں میں پھل لگے ہوئے ہیں۔ ہم زمین پر کھڑے ہو کر اس باغ کا نظارہ کرتے ہیں اور درخت میں سے توڑ کر پھل کھاتے ہیں۔ یہ سارا عمل شعوری زندگی کا ہے جو ہم لاشعوری زندگی میں کر رہے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ نکلا کہ شعور ہو یا لاشعور انسان دونوں زون میں ٹائم اسپیس سے آزاد نہیں ہے۔

بیداری کی نسبت لاشعور میں انسانی حواس کی رفتار تقریباً ساٹھ ہزار گنا زیادہ ہوتی ہے، رفتار زیادہ ہونے کو ٹائم اسپیس سے آزادی کہا جاتا ہے، شعوری زندگی جس مکان و زمان کی پابند ہے، وہ پابندی لاشعوری زندگی میں ٹوٹ جاتی ہے، ہزاروں گنا رفتار زیادہ ہونے کی وجہ سے محسوس کیا جاتا ہے کہ ہم مکان و زمان سے آزاد ہو گئے ہیں۔ شعوری زندگی میں بھی رفتار کم یا زیادہ ہوتی رہتی ہے۔ ایک

آدمی پیدل چلتا ہے، دوسرا سائیکل پر سوار ہے، تیسرا کار میں ہے، چوتھا آدمی جہاز میں پرواز کر رہا ہے، پانچواں آدمی جدید کنکارڈ طیارے کے ذریعے ایک ملک سے دوسرے ملک جاتا ہے، دیکھئے ہر سٹیج پر رفتار تبدیل ہو جاتی ہے۔

دن کے حواس سے نکل کر انسان جب رات کے حواس میں داخل ہو جاتا ہے تو مادی عناصر سے بنا ہوا جسم معطل ہو جاتا ہے اور مادی عناصر سے جسم کو متحرک رکھنے والی ایجنسی نسمہ کی حرکت براہ راست شروع ہو جاتی ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ آدمی زمان و مکان سے آزاد ہو گیا ہے۔

دراصل رفتار میں کمی یا زیادتی شعور اور لاشعور میں تفریق ہے۔ شعوری زندگی آزاد نہیں ہے۔ لاشعور کے اوپر منحصر ہے، شعوری زندگی میں جتنے حواس کام کر رہے ہیں اس کی بنیاد لاشعور ہے، جب کوئی انسان شعور میں رہتے ہوئے لاشعوری حواس واحساسات و جذبات کے سورس کو تلاش کر لیتا ہے تو وہ لاشعوری حواس کی رفتار سے سفر شروع کر دیتا ہے۔

توانائی

زندگی اور زندگی سے متعلق جذبات واحساسات، واردات وکیفیات، تصورات وخیالات اور زندگی سے متعلق تمام دلچسپیاں اس وقت تک ہیں جب تک سانس کا سلسلہ قائم ہے۔ سانس اندر جاتی ہے، سانس باہر نکلتی ہے، اندر کے سانس سے باطن کا رشتہ جڑ جاتا ہے اور سانس کے باہر نکلنے سے دنیا میں پھیلی ہوئی چیزوں گوشت پوست کے جسم اور حواس میں درجہ بندی ہوتی ہے۔

آنکھیں بند کر کے پوری یکسوئی کے ساتھ جب ہم سانس اندر لیتے ہیں اور وقفہ نارمل وقفہ سے زیادہ ہو جاتا ہے تو شعور باطن کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور سانس جب باہر نکلتا ہے تو ظاہری دنیا کی طرف توجہ مبذول ہو جاتی ہے جس کے نتیجہ میں ہم شک، خوف، غم، ڈر، حزن وملال، کبر ونخوت، بغض، لالچ، طمع، غصہ، حسد، جھوٹ اور منافقت کی دنیا میں منتقل ہوتے رہتے ہیں اور اس دنیا سے ہم دور ہو جاتے ہیں جس دنیا میں سکون وآرام اور یقین کے علاوہ کچھ نہیں۔

مخفی دنیا کیا ہے؟

مخفی دنیا کی مثال تالاب کی طرح ہے، ٹھہرے ہوئے پانی میں جھانکنے سے ہمیں پانی کے اندر اپنی تصویر نظر آتی ہے اسی طرح باطن میں کائنات کے سارے افراد باہم دیگر ایک دوسرے میں پیوست نظر آتے ہیں۔ کائنات قدرت کا ایک کارخانہ ہے۔ یہ کارخانہ کل پرزوں سے مرکب ہے، آسمان، زمین، اجرام سماوی، درخت، پہاڑ، چرند پرند، حشرات الارض، جنات، فرشتے اور انسان سب اس کارخانے کے کل پرزے ہیں، ہر پرزہ دوسرے پرزے سے جڑا ہوا ہے، کسی ایک پرزے کی کارگزاری بھی اعتدال سے ہٹ جائے تو ساری مشین متاثر ہوتی ہے۔ ہر پرزہ اپنی کارکردگی سے تو واقف ہے لیکن مشین جس میکانزم پر چل رہی ہے اس سے واقف نہیں ہے۔

کائناتی مشین ایک گولائی میں چل رہی ہے، حرکت مخفی اسکیم ہے جو مظاہر کے پس پردہ کام کر رہی ہے۔ مخفی اسکیم تاریکی اور روشنی کی گہرائی میں ایسے نقوش تخلیق کرتی ہے جن کو ہمارے حواس دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں مثلاً اپنے ہاتھ پر بندی ہوئی گھڑی دیکھئے، گھنٹے، منٹ اور سیکنڈ کی سوئی ڈائل میں موجود ہے، سیکنڈ کی سوئی تیزی سے حرکت کر رہی ہے، آنکھ اس حرکت کو محسوس کر لیتی ہے، منٹ اور گھنٹے کی سوئیاں بھی حرکت میں ہیں لیکن ہماری آنکھ اس رفتار یا حرکت کو محسوس نہیں کرتی اور جب ہم ایک وقفہ کے

بعد ان سوئیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو انکشاف ہوتا ہے کہ حرکت کا عمل جاری ہے۔ ایک حرکت یہ ہے کہ سوئیاں کم یا زیادہ کی رفتار سے چل رہی ہیں اور ایک حرکت ایسی ہے جو ساری مشین کو متحرک کئے ہوئے ہے لیکن نگاہ سے چھپی ہوئی ہے، گھڑی کے اندر سپرنگ، لیور اور گراریاں ہیں، ان کے باہمی عمل اور اشتراک سے حرکت کا ایک نہ رکنے والا سلسلہ جاری ہے۔ کوئی آگے حرکت کر رہا ہے، کوئی دائرے میں گھوم رہا ہے، کوئی لحظہ بہ لحظہ اپنے حجم کو زیادہ کر رہا ہے اور کوئی سمٹ رہا ہے، بیک وقت کئی حرکتوں پر گھڑی چل رہی ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ حرکت الٹی سیدھی کیوں ہے؟ لیکن تفکر کرنے سے ذہن کھل جاتا ہے، ماہ و سال کے تجزیہ سے منکشف ہوتا ہے کہ زندگی اربوں کھربوں کے کل پرزوں سے بنی ہوئی ایک مشین ہے۔ جس طرح انسان کی بنائی ہوئی کوئی بھی چھوٹی بڑی مشین توانائی اور موبل آئیل کی محتاج ہے اسی طرح انسانی پنجرہ میں بند مشین بھی توانائیوں، چکنائیوں کی محتاج ہے۔

دل، دماغ، گردے، پھیپھڑے، معدہ، آنتیں سب نظر نہ آنے والی توانائی سے حرکت کر رہے ہیں۔ ان بنیادی پرزوں کے ساتھ تقریباً بارہ کھرب پرزے (خلیہ) خود بخود متحرک ہیں، آدم زاد کی کوتاہ نظری کا یہ عالم ہے کہ وہ اپنے اندر آواز کے ساتھ، جھٹکے کے ساتھ، تیز اور مدھم رفتار کے ساتھ چلنے والی مشین کو دیکھ نہیں سکتا اور اس کی آواز سن نہیں سکتا، مشین کو چلانے والی توانائی کا غیر مرئی سلسلہ منقطع ہو جائے تو اسے بحال نہیں کر سکتا۔

توانائی کا کام خود جل کر مشین کو حرکت میں رکھنا ہے۔ توانائی اگر اعتدال میں رہے تو زندگی بڑھ جاتی ہے، توانائی ضائع ہو جائے تو زندگی کا چراغ بھڑک کر بجھ جاتا ہے۔ مادی کائنات غیب اور مخفی بساط پر قائم ہے، غیب میں نظر دیکھتی ہے کہ ناسوتی دنیا اور لاکھوں دنیائیں ایک سٹیج ڈرامہ ہے، سٹیج پر کوئی باپ ہے، کوئی ماں ہے، کوئی بچہ ہے، کوئی استاد ہے، کوئی دوست ہے، کوئی دشمن ہے، کوئی گناہ گار ہے، کوئی پاکباز ہے۔

دراصل یہ سب سٹیج پر کام کرنے والے کرداروں کے مختلف روپ ہیں، جب ایک کردار یا سب کردار سٹیج سے اتر جاتے ہیں، سب ایک ہو جاتے ہیں اور ان کے اوپر سے دوری کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ ایک راز ہے جس کی پردہ کشائی انبیاء کے وارث اولیاء اللہ کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک برگزیدہ ہستی حضور قلندر بابا اولیاءؒ ہیں۔

قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں:

"کائنات ایک ماوراء الماوراء اور ایک لامحدود تشخص ہے۔ یہ لامحدود مرکزیت ذات مطلق ہے۔ انبیاء کرام اپنی ذات سے دست بردار ہو کر اس لامحدود ہستی کے مطیع و فرمانبردار ہو گئے ہیں۔ انہوں نے ہر شئے کو اس ذات اکبر کی معرفت پہچانا اور خود ذات اکبر کے ارادے کے مظہر بن گئے۔"

ابدال حق قلندر بابا اولیاءؒ فرماتے ہیں:

جب مٹی کا پتلا اور خواہشات کا خول محل توجہ نہیں رہتا تو پتلے کے اندر موجود سسٹم آشکار ہو جاتا ہے۔ خفی، جلی ہو جاتا ہے اور غیب شہود بن جاتا ہے۔ محدودیت لا محدودیت سے مغلوب ہو جاتی ہے۔ حزن و ملال، سرشاری اور اطمینان قلب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ پیغمبرانہ طرز فکر رکھنے والے یہ پاکیزہ لوگ جب تک عوام میں ہوتے ہیں، پریشان حال لوگ سکون حاصل کرنے کے لئے ان کے ارد گرد جمع رہتے ہیں اور جب یہ قدسی نفس حضرات غیب کی دنیا کو اپنا مسکن بنا لیتے ہیں تب بھی لوگ ان کے آستانوں پر حاضر ہو کر اندر کی دنیا کو روشن اور منور کرتے ہیں اس لئے کہ ذاتی اغراض اور خود پسندی کے جال سے یہ لوگ آزاد ہوتے ہیں۔ یہ مبارک و سعید لوگ جان لیتے ہیں کہ خود کی نفی کئے بغیر ذات اکبر کے رازداں نہیں بن سکتے اور جب کوئی بندہ ذات اکبر کا رازداں ہو جاتا ہے تو ان کے لئے اللہ کہتا ہے۔

”میں اپنے بندوں کو دوست رکھتا ہوں۔ اور ان کے کان، آنکھ اور زبان بن جاتا ہوں۔ پھر وہ میرے ذریعے سنتے ہیں، میرے ذریعے بولتے ہیں اور میرے ذریعے چیزیں پکڑتے ہیں۔“

سلطان

حضور ﷺ ایک بارہ کوہ نبیر پر تشریف لے گئے۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ حضور ﷺ کے ہمراہ تھے۔ کوہ نبیر ہلنے لگا یہاں تک کہ اس کے پتھر لڑھک کر دامن کوہ میں جا گرے۔ حضور ﷺ نے کوہ نبیر کو ٹھوکر لگا کر فرمایا:

"اے نبیر ساکن رہ تجھ پر نبی اور صدیق اور دو شہید ہیں۔"

حضور ﷺ کا یہ فرمان سنتے ہی کوہ نبیر ساکت ہو گیا۔

زمین کی تخلیق سے متعلق دو نظریات ہیں۔ ایک نظریہ کے مطابق زمین ابتداء میں سورج کا حصہ تھی، جو ایک ٹکڑے کی طرح اچھل کر سورج سے علیحدہ ہو گئی۔ دوسرا نظریہ بگ بینگ کی تھیوری ہے۔ دونوں نظریات کے مطابق زمین نے رفتہ رفتہ بیضوی شکل اختیار کر لی ہے۔

قطبین اور خط استواء پر کرہ ارض کا ڈایا میٹر الگ الگ ہے۔ خط استواء زمین کا ڈایا میٹر ۱۲۷۵۶ کلو میٹر ہے۔ زمین ۲۳ ڈگری زاویہ پر جھکی ہوئی ہے اور تقریباً چوبیس گھنٹوں میں گھوم جاتی ہے۔ اس گردش سے دن رات وجود میں آتے ہیں۔ زمین سورج کے گرد ایک چکر ایک سال میں پورا کرتی ہے اور اس حرکت سے موسم تبدیل ہوتے ہیں۔ زمین کی ساخت جھکاؤ، پھیلاؤ، گردش اور ترتیب و توازن قدرت کی معین کردہ مقداروں کا بہترین شاہکار ہے۔ سائنسدانوں کے خیال میں اگر زمین کا جھکاؤ ۲۵ ڈگری پر ہوتا تو قطبین پر جمی ہوئی برف پگھل کر سمندروں میں آجاتی اور جھکاؤ ۲۲ ڈگری پر ہوتا تو یورپ قطب شمالی کی برف سے ڈھک جاتا، زمین محوری گردش ۲۴ گھنٹے میں پوری کرتی ہے۔ اگر زمین محوری گردش ۲۰ گھنٹوں میں پوری کرتی تو تیز ہوائیں چلتیں اور ان طوفانی ہواؤں سے زمین صحرا میں تبدیل ہو جاتی، اگر محوری گردش کا دورانیہ ۲۴ گھنٹوں کے بجائے ۲۵ گھنٹے ہوتا تو زمین خشک اور بنجر بن جاتی۔

سورہ رحمٰن میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ:

"اے گروہ جنات اور گروہ انسان! تم آسمان اور زمین کے کناروں سے نکل کر دکھاؤ، تم نہیں نکل سکتے مگر سلطان سے۔"

سلطان کا مطلب چھ شعوروں پر غلبہ حاصل کرنا ہے، کوئی انسان زمینی شعور پر رہتے ہوئے چھ شعوروں پر غلبہ حاصل کر لے تو وہ زمینی شعور سے باہر نکل سکتا ہے، آسمانی دنیا کو پہچاننے کے لئے سات مزید شعوروں سے گزرنا پڑتا ہے، جب انسان ان سات شعوروں کا ادراک حاصل کر لیتا ہے تو وہ اللہ کی صفات کا عارف بن جاتا ہے، صفات کا عرفان حاصل کرنے کے لئے سالک گیارہ شعوروں سے گزرتا ہے، شعور کی طاقت کا دارومدار زمان پر ہے، اس کی مثال یہ ہے کہ دیوار کے اوپر گھڑی لگی ہوئی ہے، گھڑی کے درمیان سوئی لگی ہے گھڑی میں بارہ ہندسے بنے ہوئے ہیں، ایک سا ے بارہ تک ہندسے اسپیس ہیں اور سوئی کا گھومنا ٹائم ہے، اگر سوئی کو اتنی رفتار سے گھمایا جائے کہ وہ پلک جھپکنے سے پہلے چھ کے ہندسے پر پہنچ جائے تو زمین پر موجود شعور جو اسپیس میں بند ہے پردے میں چلا جائے گا اور انسان کو سلطان حاصل ہو جائے گا، جس سلطان کے ذریعے وہ زمین کے کناروں سے باہر نکل سکتا ہے اور جب، سوئی کو اس طرح گھمادیا جائے کہ وہ پلک جھپکنے کے وقت سے پہلے بارہ پر پہنچ جائے تو انسان کو وہ سلطان حاصل ہو جائے گا جس کے ذریعے وہ زمین اور آسمان کے کناروں سے باہر نکل جاتا ہے، اس کے برعکس اگر سوئی بارہ کے ہندسے سے بیک وقت دو پر آ جائے تو انسان کو وہ شعور حاصل ہو جاتا ہے جو اسے خواب دکھاتا ہے، اگر سوئی بیک وقت بارہ سے اچھل کر تین پر آ جائے تو اسے مراقبہ کا شعور حاصل ہو جاتا ہے، اگر سوئی بیک وقت چار پر آ جائے تو اسے وہ شعور حاصل ہو جاتا ہے جس کو وحی کہتے ہیں اور یہ وہی وحی ہے جس کے بارے میں اللہ نے فرمایا ہے کہ:

''ہم نے شہد کی مکھی پر وحی کی۔''

اگر بارہ کے ہندسے پر قائم سوئی اتنی تیزی کے ساتھ حرکت کرے کہ وہ ایک دم پانچ پر آ جائے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کے اندر وہ صلاحیت پیدا ہو گئی ہے جس کو قرآن میں ''سلطان'' کہا ہے، یعنی اب انسان زمین کے کناروں سے باہر دیکھ سکتا ہے، زمین کے کناروں سے باہر دیکھنے کی صلاحیت کے حامل سالک کے اندر پہلے آسمان کا شعور پیدا ہو جاتا ہے، علیٰ ہذالقیاس اس طرح سات آسمانوں کو وہ دیکھ بھی لیتا ہے اور سات آسمانوں میں وہ داخل بھی ہو جاتا ہے۔ اللہ کریم نے فرمایا:

''ہم نے آسمان اور زمین کو تہہ در تہہ بنایا ہے۔''

سورۃ الطارق میں ارشاد فرمایا ہے:

''اللہ وہ ہے جس نے سات آسمان بنائے اور زمین کی قسم بھی انہی کی مانند ہے۔''

سورۃ المومنین آیت نمبر ۱۷ میں ہے۔

''اور تمہارے اوپر ہم نے سات راستے بنائے تخلیق کے کام سے ہم اچھی طرح واقف ہیں۔''

تہہ در تہہ سے مراد دراصل وہ شعور یا صلاحیتیں ہیں جو اللہ نے انسان کو ودیعت کی ہیں۔ سات تہوں والے آسمان یا زمین سے مراد یہ ہے کہ ہر تہہ ایک مکمل نظام ہے اور ہر نظام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ جس کا ایک دوسرے سے تصادم نہیں ہوتا، ان سب کا رشتہ خالق کائنات کے ساتھ قائم ہے، تمام چیزیں جو سات آسمانوں اور زمینوں میں ہیں سب اللہ کی حمد و ثناء بیان کرتی ہیں، یہ تمام چیزیں اور مخلوقات اس بات کا علم رکھتی ہیں کہ ہمارا خالق اللہ ہے اور اس علم پر یقین رکھتے ہوئے اللہ کی حمد و ثناء بیان کرتی ہیں اور شکر ادا کرتی ہیں۔ اربوں، کھربوں سے زیادہ ان چیزوں یا مخلوقات میں سے کوئی ایک مخلوق بھی اللہ کی خالقیت سے انحراف کرے تو نظام میں خلل واقع ہو جائے گا۔

یہی بات اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے کہ:

''تمام چیزیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اللہ کی حمد بیان کرتی ہیں یعنی اللہ کی خالقیت سے انحراف نہیں کرتیں۔''

قانون یہ ہے کہ جب کوئی آدمی اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے تو وہ ماضی سے آتا ہے اور جب وہ دوبارہ ماضی میں پلٹتا ہے تو سوئیوں کی گردش ریورس ہو جاتی ہے، جب تک انسان چھ دنیاوی شعور یا چھ دائروں میں رہتا ہے اس کے اوپر مکانیت کا غلبہ رہتا ہے اور جب انسان چھ شعوروں سے نکل کر ساتویں شعور میں داخل ہوتا ہے تو گیارہویں شعور تک اس پر زمانیت کا غلبہ رہتا ہے، مکانیت مغلوب ہو جاتی ہے۔ زمین و آسمان میں موجود ہر شئے شعور رکھتی ہے وہ اس بات سے واقف ہے کہ رحمت العالمین سیدنا حضور ﷺ کے لئے کائنات کی ہر شئے محکوم ہے، پہاڑ کے اوپر جیسے ہی حضور ﷺ تشریف لے گئے تو محکوم پہاڑ آپ کی جاری و ساری حاکمیت کے رعب سے ہلنے لگا یعنی اس پر زلزلہ آگیا۔ زلزلے کے معنی ہیں ''زور سے ہلا دینا۔''

''جب زمین اپنی پوری شدت کے ساتھ ہلا ڈالی جائے گی اور زمین اپنے اندر کے بوجھ نکال کر باہر ڈال دے گی۔''

(الزلزال)

''جب وہ ہونے والا واقع پیش آجائے گا تو کوئی اس کے واقع ہونے کو جھٹلانے والا نہ ہوگا وہ تہہ و بالا کر دینے والی آفت ہو گی، زمین اس وقت یک بار ہلا دی جائے گی اور پہاڑ اس طرح ریزہ ریزہ ہو جائیں گے جیسے اڑتا ہوا غبار۔''

(الواقعہ)

پہاڑ میں شعور ہے، قرآن پاک اس بات کی تصدیق کرتا ہے۔

''اور ہم نے اپنی امانت پیش کی آسمانوں پر اور زمین پر اور پہاڑوں پر سماوات و ارض اور پہاڑوں نے کہا کہ ہم اس امانت کے متحمل نہیں ہو سکتے۔''

کسی چیز کے بارے میں انکار یا اقرار اس بات کی علامت ہے، اس شئے کے اندر شعور ہے، جس طرح کوئی ایک فرد اپنے شعور کو نہیں دیکھ سکتا اور شعور کی مزاحمت یا شعور کی پسندیدگی کا وزن محسوس کرتا ہے، اسی طرح ہم پہاڑوں کو وزنی اور جما ہوا دیکھتے ہیں۔

''تم دیکھتے ہو پہاڑ اور گمان کرتے ہو کہ یہ جمے ہوئے ہیں حالانکہ پہاڑ بادلوں کی طرح اڑ رہے ہیں۔''

یعنی پہاڑ کثیف مادے پر قائم نہیں ہیں، جب حضور پاک ﷺ نے پہاڑ سے مخاطب ہو کر فرمایا:

''ٹھہر جا! تجھ پر نبی اور صدیق اور دو شہید کھڑے ہیں۔''

تو پہاڑ نے حکم کی تعمیل کی اور وہ ہلنے اور لرزنے سے رک گیا۔

وجدانی دماغ

مذہبی نقطۂ نظر سے انسانی زندگی کا مطالعہ کرنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے علم و جہل، آرام و تکلیف، آزادی و پابندی اور صحت و بیماری وغیرہ کا دار و مدار محض اس بات پر ہے کہ انسان کون سا دماغ استعمال کرتا ہے، آدم کی اولاد میں زندگی گزارنے کے لئے یہ دونوں رخ موجود ہیں۔ ہر انسان روزانہ ان دونوں رخوں میں رد و بدل ہوتا رہتا ہے، ان رخوں کے تجربات بھی انسان کی پوری زندگی ہے، ایک رخ کا تجربہ ہمیں دن کے وقت بیداری میں اور دوسرے رخ کا تجربہ رات کے وقت خواب میں ہوتا ہے، ان دونوں رخوں کو شعوری حواس اور لاشعوری حواس کہا جاتا ہے، روحانی علوم کے مطابق شعوری حواس یعنی حواس خمسہ والا دماغ انسان کو مادی دنیا میں قید رکھتا ہے اور لاشعوری حواس کا دماغ انسان کو لا محدود غیب کی دنیا سے متعارف کراتا ہے، سائنسی ماہرین کے مطابق دماغ کے دونوں حصے یعنی دایاں اور بایاں دماغ مختلف قسم کے حواس بناتے ہیں۔

دائیں دماغ کا تعلق لاشعوری حواس سے ہے اور بائیں دماغ کا تعلق شعوری حواس سے ہے۔ دایاں دماغ وجدانی دماغ ہے اور بایاں دماغ منطقی اور تنقیدی دماغ ہے، دائیں دماغ میں لا محدود علوم ہیں اور بائیں دماغ میں محدود علوم کا ذخیرہ ہے۔

انسانی دماغ اور یادداشت پر کام کرنے والے مہارین کہتے ہیں کہ اگر ہم ۸۰۰۰ یادداشتیں فی سیکنڈ کے حساب سے اپنے دماغ میں ریکارڈ کرتے جائیں تو اس میں اتنی گنجائش ہے کہ ہم لگاتار بغیر کسی وقفہ کے ۷۵ سال تک یادداشتیں ریکارڈ کر سکتے ہیں، اگر انسانی دماغ کی صلاحیتوں کے برابر کوئی کمپیوٹر بنایا جائے تو اس کا سائز ایمپائر اسٹیٹ بلڈنگ جس کی بلندی ۱۲۵۰ فٹ ہے کے برابر بنے گا اور اس کو چلانے کے لئے ایک ارب واٹ بجلی درکار ہوگی، ماہرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ ذہین ترین آدمی اپنی پوری زندگی میں پانچ سے دس فیصد دماغ کا استعمال کرتا ہے اور نوے فیصد دماغ استعمال کئے بغیر مر جاتا ہے۔

مشہور سائنسدان آئن سٹائن جسے دنیا جینئس مانتی ہے اس کا دماغ امریکہ کی لیبارٹری میں محفوظ ہے، بڑے بڑے محققین نے اس پر عمیق ریسرچ محض اس غرض سے کی ہے کہ وہ کسی طرح یہ جان لیں کہ آئن سٹائن کی دماغی ساخت میں ایسی کون سی صلاحیت تھی جس نے اسے جینئس بنادیا لیکن ابھی تک انہیں ایسی کوئی چیز نہیں مل سکی جو عام آدمی کے دماغ اور جینئس آدمی کے دماغ میں امتیاز

پیدا کر سکے۔ محققین کا خیال ہے کہ شاید آئن سٹائن کے دماغ میں Data Processing یعنی نتائج مرتب کرنے کی صلاحیت عام لوگوں سے زیادہ تھی، جب کہ دماغی ساخت میں کوئی فرق نہیں تھا۔

جب نظریات کی وجہ سے آئن سٹائن کو اس صدی کا عظیم اور جینئس سائنسدان کہا جاتا ہے اس کے بارے میں اس نے خود کہا تھا کہ تھیوریز اس نے خود نہیں سوچیں بلکہ وہ اس پر الہام ہوئی تھیں۔ یاد رہے کہ یہ وہی آئن سٹائن تھا جو سکول کے زمانے میں نالائق ترین طالب علم شمار کیا جاتا تھا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایک نالائق طالب علم جینئس کیسے بن گیا؟

دنیا بھر میں Sleep Laboratories میں ہونے والی تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ بلا تخصیص جینئس اور عام آدمی کے انسان کا انسان جب سوتا ہے تو اس کا دماغ Data Processing کا کام شروع کر دیتا ہے، بیداری کے وقت انسانی دماغ میں چلنے والی برقی رو ایک مخصوص حد تک کام کرتی ہے تو شعور ٹھیک کام کرتا ہے۔ اگر ان لہروں میں اضافہ ہو جائے تو انسان پریشانی اور بے سکونی کا شکار ہونا شروع ہو جاتا ہے اور دماغی صلاحیتوں کے استعمال میں کمی واقع ہو جاتی ہے، ان لہروں کی مزید زیادتی جسم کے مدافعاتی نظام کو سخت متاثر کرتی ہے اور انسان پر بے ہوشی کے دورے پڑنے لگتے ہیں۔

فی زمانہ زیادہ تر لوگ بائیں دماغ کے زیر تسلط ہیں بایاں دماغ وہی دماغ ہے جس میں نسیان کا عمل دخل ہے یعنی کائناتی علوم کی بے خبری سے انسان مصائب اور مشکلات میں مبتلا ہو جاتا ہے، ہوتا یہ ہے کہ دن کے وقت اس کا دماغ بے دریغ استعمال ہوتا رہتا ہے اور وجدانی دماغ استعمال ہی نہیں ہوتا لہٰذا انسان کائنات کے حقیقی علم سے بے بہرہ رہتا ہے اور جب یہ بھول چوک والا دماغ دن بھر کام کر کے تھک جاتا ہے تو بے سدھ و بے خبر ہو کر ایسا سوتا ہے کہ اسے وجدانی دماغ کی کارگزاریوں کی خبر نہیں ہوتی۔

اس کا آسان علاج یہ ہے کہ انسان اپنا وجدانی دماغ (خواب کے حواس) سے بھی رابطہ قائم کرے اور اپنے شعوری دماغ میں اتنی سکت پیدا کرے کہ وہ لاشعوری اور وجدانی دماغ کی کارگزاریوں سے واقف ہوتا رہے، اس صورت میں دماغ آدھے یونٹ کے طور پر نہیں بلکہ پورے یونٹ کے طور پر کام کرے گا، اس طرح دنیاوی معاملات میں غلطیوں، پریشانیوں، تکلیفوں اور پیچیدہ بیماریوں کے امکانات حیرت انگیز طور پر کم ہو جائیں گے۔ ترقی یافتہ ممالک میں اس وقت انسانی صلاحیتوں سے بہتر سے بہتر کام لینے پر جتنی بھی ریسرچ ہو رہی ہے اور طرح طرح کی جو اختراعات ہو رہی ہیں ان سب کا صرف ایک ہی مقصد ہے کہ کسی طرح دائیں دماغ اور بائیں دماغ کا رابطہ قائم ہو جائے۔ دائیں دماغ اور بائیں دماغ میں رابطہ قائم ہونے سے انسان مخفی علوم اور غیب کی دنیا سے واقف ہو جاتا ہے۔

حاتم طائی

روایت ہے کہ یمن میں ایک قبیلہ آباد تھا جس کا سردار حاتم طائی تھا۔ حاتم طائی کی سخاوت سے دنیا کا کوئی آدمی ہے جو واقف نہیں؟ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں کچھ لوگ جب قید ہو کر آئے اور حضور پاک ﷺ کو یہ پتا چلا کہ ان قیدیوں میں حاتم طائی کے قبیلے کی ایک خاتون بھی ہیں تو حضور پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ:

"خاتون کو رہا کر دیا جائے۔"

خاتون کو جب رہائی کی نوید سنائی گئی تو اس نے یہ کہہ کر آزاد ہونے سے انکار کر دیا کہ میرے ساتھ قبیلے کے دوسرے افراد بھی ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے پورے قبیلے کو آزاد فرمادیا اور مالِ غنیمت بھی واپس کر دیا ساتھ ساتھ اپنی طرف سے انعام واکرام سے بھی نوازا، نہ صرف یہ کہ انعام واکرام عطا فرمائے بلکہ بنفسِ نفیس سرحد تک چھوڑنے کے لئے تشریف لے گئے۔

حاتم طائی کی سخاوت کے ضمن میں ایک قصہ بیان کیا جاتا ہے، روم کے بادشاہ کے دربار میں ایک دن حاتم طائی کی سخاوت کا تذکرہ تھا۔ ایک شخص نے بتایا کہ حاتم طائی کے پاس ایک بہترین عمدہ نسل کا گھوڑا ہے جو ہوا کی رفتار سے دوڑتا ہے، خوبصورت اتنا ہے کہ جو بھی اسے دیکھتا ہے اس کی تعریف میں رطب اللسان ہو جاتا ہے، حاتم طائی کی تعریف سن کر بادشاہ بولا:

جب تک کسی آدمی کو آزمایا نہ جائے اس وقت تک اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا خلافِ عقل وشعور ہے۔ بادشاہ نے وزیر سے کہا کہ تم خود جاؤ اور حاتم طائی کی سخاوت کے بارے میں ہمیں معلومات فراہم کرو اور کسی ایسی چیز کا مطالبہ کرو اس کی نظر میں سب سے زیادہ قیمتی ہو، دربار میں ایک درباری نے کہا۔ حاتم طائی کے لئے سب سے زیادہ عزیز اور سب سے زیادہ قیمتی صبار فتار ایک گھوڑا ہے بادشاہ کو درباری کی یہ بات پسند آئی اور اس نے وزیر سے کہا کہ تم خود حاتم طائی کے پاس جاؤ اور اس سے خود گھوڑا مانگو اگر وہ گھوڑے کا ایثار کر دیتا ہے تو حاتم طائی یقیناً سخی ہے۔

روم سے چلا ہوا یہ وفد منزلیں طے کرتا ہوا رات کے وقت حاتم طائی کے گھر پہنچا۔ جس وقت یہ وفد وہاں پہنچا موسلادھار بارش ہو رہی تھی۔ گھپ اندھیرے میں بادلوں کی گرج ماحول کو خوفناک بنائے ہوئے تھی ایسے خراب موسم میں گھر سے نکلنا بھی ممکن

نہیں تھا۔ مہمانوں کی تواضع کرنا امر محال اور مشکل تھا لیکن حاتم طائی نے میزبانی کا حق ادا کیا اور مہمانوں کی تواضع اور آرام و آسائش کا پورا پورا انتظام کیا۔

دستر خوان پر لذیذ بھنا ہوا گوشت کھا کر مہمان خوش ہوئے اور انہوں نے اپنے اندر سفر کی تکان کی جگہ توانائی محسوس کی اور گہری نیند سو گئے۔

صبح کے وقت بارش تھم چکی تھی۔ فضاء گرد و غبار سے صاف تھی۔ درخت دھلے ہوئے تھے۔ ہوا خنک آلود اور دل خوش کن تھا۔ لگتا تھا آکسیجن گھونٹ گھونٹ اندر اتر رہی ہے۔

ناشتہ کے دوران وزیر نے مہمان نوازی اور اظہار تشکر کے بعد اپنے آنے کا مقصد بیان کیا۔ کہا، ہمارے بادشاہ کو آپ کے گھوڑے کے بارے میں بہت کچھ بتایا گیا ہے۔ گھوڑے کی تعریف سن کر بادشاہ چاہتا ہے کہ آپ اپنا گھوڑا بادشاہ کی خدمت میں نذر کر دیں۔ وزیر کی بات سن کر حاتم افسوس کے ساتھ ہاتھ ملنے لگا اور بہت افسردہ ہو کر بولا۔ اگر آپ گھوڑا ہی لینے آئے تھے تو یہ بات آتے ہی مجھے بتا دینی چاہئے تھی لیکن اب میں مجبور ہوں اس لئے کہ میرا پیارا گھوڑا اس دنیا میں نہیں ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ پوری رات طوفانی بارش برستی رہی میرے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ چراہ گاہ یا گاؤں گوٹھ سے ضیافت کے لئے کوئی جانور منگوا سکتا لہٰذا میں نے گھوڑے کو ذبح کر دیا اور اس کا بھنا ہوا گوشت دستر خوان کی زینت بن گیا۔ وزیر حاتم طائی کی یہ بات سن کر حیران رہ گیا۔ بادشاہ کو جب یہ سارا واقعہ سنایا گیا تو اس نے بھی حاتم طائی کی سخاوت کی تعریف کی۔

قبیلہ بنی طے کے سردار حاتم طائی کے بارے میں یوں رقم ہے کہ ایک بادشاہ نے حاتم طائی کی اتنی شہرت سنی کہ بادشاہ نے محسوس کیا کہ اس کی شہرت اس کا نام اور اس کی عزت حاتم طائی سے کم ہے۔ بادشاہ کا دل بغض و عناد اور حسد سے بھر گیا۔ اس کے دل میں یہ وسوسہ در آیا کہ جب تک حاتم زندہ ہے مجھے حاتم سے زیادہ عزت و شہرت نہیں ملے گی۔ تخریبی ذہن کو استعمال کر کے اس نے ایک مفسد، چالاک، جنگ پسند، لالچی اور کینہ طنیت شخص کو اس بات پر معمور کیا کہ وہ حاتم کو قتل کر کے اس کا سر لے آئے۔

دہشت گرد کرائے کا قاتل یہ بے رحم شخص اپنے ترکش کو تیروں سے بھر کر اور تیز دھار تلوار کو میان میں رکھ کر اس ملک کی طرف روانہ ہو گیا جہاں حاتم طائی رہتا تھا۔ حاتم طائی کے علاقہ میں پہنچ کر اس شخص کی ایک خوش گفتار، خوش مزاج اور پر سکون شخص سے ملاقات ہوئی۔ یہ شخص کرائے کے قاتل کو مسافر سمجھ کر اپنے گھر لے گیا اور ایسی پیار اور خلوص سے اس کی تواضع کی کہ کرائے کا قاتل اس کا گرویدہ ہو گیا۔

دوسرے دن مہمان نے جب رخصت ہونا چاہا تو خوش گفتار و خوش اخلاق میزبان نے اصرار کیا کہ مہمان ابھی چند روز اور قیام کرے اور مزید خدمت کرنے کا موقع دے۔ کرائے کے قاتل کے دل میں میزبان کی تکریم اور بڑھ گئی۔ اس نے کہا کہ مجھے ایک

ضروری کام در پیش ہے اس لئے میں زیادہ دن نہیں ٹھہر سکتا۔ میز بان نے کہا کہ آپ مجھے وہ کام بتادیں شاید میں آپ کی کچھ مدد کر سکوں۔ کرائے کے قاتل نے رازداری سے کہا کہ بادشاہ نے مجھے حاتم طائی کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس کے سر پر بڑا انعام مقرر کر دیا ہے، اگر آپ حاتم طائی کو جانتے ہیں تو مجھے اس کا پتہ بتادیں۔ یہ سن کر میز بان مسکرایا اور خندہ پیشانی کے ساتھ جھ کر کہا۔ ''میں حاتم طائی ہوں، آپ اپنا کام شوق سے پورا کر سکتے ہیں کیونکہ اگر یہ کام اسی وقت نہ ہوا تو لوگ مزاحمت کریں گے اور آپ انعام سے محروم رہ جائیں گے۔''

حاتم کی یہ بات سن کر کرائے کا قاتل دہشت گرد اپنے میز بان کے پیروں میں گر گیا۔ اس نے اپنی تلوار اور تیروں سے بھرا ہوا ترکش پھینک دیا اور کہا ایسے معزز سردار کے جسم پر پھول مارنا بھی گناہ عظیم ہے۔

سخاوت کے بارے میں ایک مجلس میں حضور قلندر باباؒ اولیاءؒ نے فرمایا:

ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ اس نے عرض کیا:

یارسول اللہ ﷺ مجھے شہد چاہیئے۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

عثمانؓ کے پاس چلے جاؤ۔

جب یہ شخص حضرت عثمانؓ کی خدمت میں پہنچا تو وہاں بہت سارے اونٹ بیٹھے ہوئے تھے، گیہوں کی بوریاں لادی جا رہی تھیں۔ ایک بوری کا منہ کھل کر چند کلو گیہوں زمین پر گر گیا۔ حضرت عثمانؓ نے جب یہ دیکھا تو انہوں نے اپنے ملازم سے باز پرس کی اور اس کو ڈانٹا ڈپٹا کہ یہ گیہوں زمین پر کیوں گرا ہے۔ شخص مذکور یہ دیکھ کر واپس رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔

یارسول اللہ ﷺ شہد چاہیئے۔

حضور ﷺ نے پھر یہی ارشاد فرمایا:

عثمان کے پاس چلے جاؤ۔

اس نے ساری روداد سنادی۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

تم جاؤ تو سہی تم جا کر شہد مانگو تو،

یہ شخص دوبارہ حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوا۔اور ان کے ملازم سے شہد مانگا۔ملازم نے حضرت عثمانؓ سے کہا:

اس آدمی کو شہد چاہئے۔

حضرت عثمانؓ نے فرمایا:

اسے شہد دے دو۔

ملازم نے برتن مانگا۔ شخص مذکور نے کہا:

میرے پاس برتن نہیں ہے۔

ملازم نے پھر حضرت عثمانؓ سے عرض کیا:

حضور اس کے پاس شہد لینے کے لئے برتن نہیں ہے۔

حضرت عثمانؓ نے فرمایا:

شہد کا کپا اٹھا دو۔(ایک کپے میں تقریباً ڈیڑھ کنستر شہد آتا ہے۔)

سائل نے کہا:

میں کمزور آدمی ہوں۔اتنا زیادہ وزن نہیں اٹھا سکتا۔

ملازم پھر حضرت عثمانؓ کے پاس پہنچا اور عرض کیا:

ایک کپا اٹھانا سائل کے لئے ممکن نہیں ہے۔

حضرت عثمانؓ کو ملازم کی بار بار مداخلت پسند نہیں آئی،ذرا تیز لہجے میں فرمایا:

اونٹ پر لاد کر دے دو۔

اور سائل اونٹ پر شہد لے کر چلا گیا۔یہ واقعہ بیان کر کے حضور قلندر بابا اولیاءؒ نے فرمایا کہ:

"مجھے اس بات پر حیرت ہے کہ ہر مسلمان دولت مند بننا چاہتا ہے لیکن کوئی آدمی حضرت عثمانؓ کے طرز عمل کو اختیار کرنا نہیں چاہتا۔"

قلندر باباؒ اولیاءؒ فرماتے ہیں:

"یہ پیغمبرانہ اوصاف یا پیغمبرانہ طرز فکر جب بندے کے اندر متحرک ہو جاتی ہے تو وہ دیکھ لیتا ہے کہ کوئی شئے براہ راست موجود نہیں، ہر چیز کا وجود اللہ کی حاکمیت پر ہے، سارے جہانوں کا بادشاہ اللہ ہے۔"

انسان جس طرز فکر کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو شرط یہ ہے کہ اس طرز فکر کے حامل لوگوں کی قربت میسر آجائے، مگر ہم شیطان سے قربت کے کوگر ہیں تو شیطان کے اوصاف پسند کریں گے اور اگر ہم رحمٰن سے قریب ہونا چاہیں تو رحمٰن کی صفات اختیار کریں، شیطان دوری، تعصب، حقارت، کبر و نخوت اور خود نمائی کا پیکر ہے۔ رحمٰن محبت ایثار و خلوص، عفو و در گزر، سخاوت اور خدمت خلق کا نوری تمثل ہے۔ اگر آپ اللہ، اپنے خالق سے متعارف ہو کر اس کی قربت اختیار کر کے کائنات میں ممتاز ہونا چاہتے ہیں تو اللہ کی مخلوق کی خدمت کیجئے۔ بلاشبہ محبت رکھنے والے لوگ اللہ کے دوست ہوتے ہیں اور دوست پر دوست کی ہمیشہ نوازشات ہوتی ہیں۔

احسن تقویم

دل نے چاہا کہ اپنے محسن، اپنے سرتاج، اپنے جسم مثالی، اپنے ہمدرد و غم گسار، رحمت پروردگار، نور عین، آواز حق، مرشد کریم قلندر باباؤلیاء رحمتہ اللہ علیہ کی وہ باتیں آپ کو سناؤں گا جو میری زندگی بن گئی ہیں۔

یہ بات اب پردہ نہیں رہی کہ پانچ ہزار ایک سو دس دن رات کو اگر گھنٹوں سے ضرب دیا جائے اور بائیس ہزار چھ سو چالیس گھنٹوں کو منٹ سے ضرب دیا جائے اور ہر منٹ پر ایک بات چیلے نے گرو سے سنی ہو تو بہتر لاکھ اٹھاون ہزار چار سو (7258400) باتیں مرشد سے مرید کو منتقل ہوئی ہیں۔

یہ سب باتیں اس وقت علم بن جاتی ہیں جب گرو چیلے کے دماغ کی اسکرین کو واش (wash) کردے۔ اب اتنی ساری باتیں تو میں اپنے گرو کی آپ کو نہیں سنا سکتا کیونکہ سننے والے دماغ کی اسکرین پر اس سے بہت زیادہ صدیوں پہلے کے نقوش اور تصویریں بنی ہوئی ہیں۔ ہاں!

ایسی کچھ باتیں میں آپ کو ضرور سنانا چاہتا ہوں جو اسفل میں گرے ہوئے انسانوں کو ''احسن تقویم'' بنا دیتی ہے۔ مرشد نے فرمایا:

''جو کھوتا ہے وہ پاتا ہے اور جو پالیتا ہے وہ خود کھو جاتا ہے۔''

انسان ایک ایسا کمپیوٹر ہے جس میں بارہ کھرب خلئے (Cells) ہیں۔ موجودہ دور میں اس کمپیوٹر کو چلانے والے خلیوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد سوا دو سو ہے۔ جس کو ہم آسمان جانتے ہیں یہ آسمان نہیں خلاء ہے۔ زمین پر کوئی چیز بھی بے رنگ نہیں ہے۔ سمتیں چار نہیں چھ ہیں۔

آسمان پر آنکھ جو ستارے دیکھ سکتی ہے ان کی تعداد دس ہزار ہے۔ پوری کائنات طبقاتی تقسیم ہے۔ زمین بھی طبقات پر قائم ہے۔ ہر شئے خواہ ہو چھوٹی سے چھوٹی ہو یا بڑی سے بڑی روشنی کے غلاف میں بند ہے اور روشنی کے اوپر نور منڈھا ہوا ہے۔ ازل سے زمین تک آنے میں اور زمین سے ازل تک پہنچنے میں ہر انسان کو تقریباً سترہ مقامات (Zones) سے گزرنا پڑتا ہے۔ انسان کٹھ پتلی کی

طرح ہے ایک انسان میں بیس ہزار ڈوریاں بندھی ہوئی ہیں۔ ایک ایک ڈوری ایک ایک فرشتے نے سنبھالی ہوئی ہے۔ انسان عالم مثال میں الٹا لٹکا ہوا ہے۔ پیر اوپر سر نیچے ہے۔

زمین پہیتے کی طرح ہے اور Six Demension Screen ہے۔ آبادی زمین کے اندر نہیں زمین کے اوپر ہے۔ زمین محوری اور طولانی گردش میں لٹو کی طرح گھوم رہی ہے۔ زمین دس ہزار سال کے بعد اپنی پوزیشن تبدیل کر دیتی ہے۔ جہاں پانی ہے وہاں آبادیاں اور جہاں آبادی ہے وہ جگہیں زیر آب آجاتی ہیں۔

زمین دراصل آدم و حوا کا وہ شعور ہے جو ارتقاء کی طرف گامزن ہے۔ گوشت پوست کا جسم روح کا باس ہے جب لباس پرانا ہو جاتا ہے یا داغ دھبے پڑ جاتے ہیں تو روح لباس کو اتار کر پھینک دیتی ہے۔ اصلی اور حقیقی ماں زمین ہے۔ جب آدمی مر جاتا ہے تو اس کی سڑاند اور تعفن کو اپنے اندر چھپا لیتی ہے۔

گرو نے کہا کہ کسی کو بنانے کے لئے اپنا سب کچھ کھونا پڑتا ہے۔ سچا گرو وہ ہے جو چیلے کی طرز فکر اللہ کی طرز فکر کے مطابق بنادے۔ مال وزر، دولت و دنیا انسان کے لئے بنائی گئی ہیں۔ جب کہ انسان یہ باور کرانے میں مصروف ہے کہ مجھے دنیا کے لئے بنایا گیا ہے۔ سخاوت اعلیٰ ظرف لوگوں کا شیوہ ہے۔ دستر خوان وسیع ہونا چاہئے۔ کم ظرف لوگ دوسروں سے توقعات قائم کرتے ہیں۔ اعلیٰ ظرف لوگ مخلصانہ خدمت کرتے ہیں۔ ماں کی خدمت انسان کو حضرت اویس قرنیؓ بنا دیتی ہے۔ غصہ آگ ہے، آگ دوزخ ہے۔

بچے اللہ میاں کے باغ کے پھول ہیں۔ بچہ ماں باپ سے پیدا ہوتا ہے۔ استاد تراش خراش کر اسے ہیرا بنا دیتا ہے۔ دین سے دنیا سنبھالنی مشکل ہے۔ اس لئے کہ اللہ ستارالعیوب اور غفارالذنوب ہے۔ اللہ باہر نہیں ہر شخص کے اندر ہے۔ جو چیز باہر نہیں ہے اس کو باہر ہزاروں سال بھی ڈھونڈا جائے نہیں ملے گی۔

وسائل کے لئے کوشش اور جدوجہد کرو لیکن نتیجہ اللہ پر چھوڑ دو۔

انتقام ہلاکت اور بربادی ہے۔ عفو و درگذر اللہ کا انعام ہے۔

ہمارے بچے دراصل ہمارے اسلاف ہیں۔ ان کی تربیت اس طرح کرنی چاہئے کہ کل یہ بچے اسلاف کے مقام پر فائز ہو جائیں۔

اللہ صبر کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ صبر یہ ہے کہ درگزر کیا جائے۔ جس آدمی میں شک ہے، قرآن اس پر اپنی حکمت آشکار نہیں کرتا۔ زر و جواہر سے زیادہ کوئی شئے بے وفا نہیں ہے جس نے زر و جواہر سے محبت کی وہ ہلاک ہو گیا اور جس نے دولت کو پیروں کے نیچے رکھا دولت ہمیشہ اس کی کنیز بنی رہی۔

جنت اس کی میراث ہے جو خوش رہتا ہے۔ ناخوش آدمی جنت میں داخل نہیں ہو سکتا۔ اللہ کے دشمن کو جنت قبول نہیں کرتی۔ اللہ کے دشمن کی پہچان یہ ہے کہ اس کے اوپر خوف و غم مسلط رہتا ہے۔ گدھ کی طرح وسوسے اس پر منڈلاتے رہتے ہیں۔ مشاہداتی آنکھ دیکھتی ہے کہ موت سے خوبصورت کوئی زندگی نہیں ہے۔

ہر انسان کے اندر کم و بیش گیارہ ہزار صلاحیتیں ایسی ہیں کہ جن میں ہر ایک صلاحیت پورا علم ہے۔ ہر صلاحیت مادی دنیا کے مطابق پی ایچ ڈی ہے یعنی ہر انسان قدرت کا ایسا شاہکار ہے کہ وہ چاہے تو نئے نئے ماورائی علوم میں ساڑھے گیارہ ہزار پی ایچ ڈی کی ڈگریاں لے سکتا ہے۔ انسان ناقابل تذکرہ خلاء ہے۔ خلاء میں روح آئی تو حرکت پیدا ہوئی۔ روح اللہ کا امر ہے۔ اللہ کا امر یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کا ارادہ کرتا ہے تو کہتا ہے ''ہو جا'' اور وہ ''ہو'' جاتی ہے۔ انسان نے پہلی آواز اللہ کی سنی اور سب سے پہلے اللہ ہی سے بات کی اس کے بعد وہ پانچ حواسوں سے واقف ہوا۔

دنیا فریب ہے۔ فریب خوردہ انسان کی ہر بات فریب ہے۔ جو لوگ یہ بات جان لیتے ہیں ان کے لئے دنیا سکون کا گہوارہ بن جاتی ہے۔ باادب بانصیب، بے ادب بے نصیب۔ مرشد کریم نے فرمایا:

''متقی لوگوں پر غیب منکشف ہو جاتا ہے۔ یہ کیسی عجیب بات ہے اور حرماں نصیبی ہے کہ ہر مذہب کے پیروکار اللہ، رسول، عذاب، ثواب اور جنت، دوزخ کا تذکرہ کرتے ہیں مگر اللہ کے راستے پر متحد اور متفق نہیں ہوتے۔''

دنیا کانٹوں بھرا راستہ ہے اور پھولوں کی سیج ہے۔ یہ اپنا اپنا انتخاب ہے۔ کوئی کانٹوں بھری زندگی کو گلے لگا لیتا ہے اور کوئی خوشیوں بھری زندگی میں مگن رہتا ہے۔ ہر آدمی پر سکون اور پر مسرت زندگی اپنا سکتا ہے۔ فارمولا یہ ہے کہ:

جو چیز حاصل ہے اس کو شکر کے ساتھ خوش ہو کر استعمال کیا جائے اور جو چیز حاصل نہیں ہے اس پر شکوہ نہ کیا جائے۔ اس کے حصول کے لئے تدبیر کے ساتھ دعا کی جائے۔ اللہ سخی ہے۔ اللہ خود چاہتا ہے کہ مخلوق اللہ کے دسترخوان سے خوش ہو کر کھائے پیئے، ہر بیج ہر گٹھلی پر ازل تا ابد اپنی نوع، اپنے خاندان کا ریکارڈ ہے۔ انسان اللہ کا نائب ہے اور یہ ساری کائنات اللہ کا کنبہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ چاند، سورج، ستارے، زمین انسان کی خدمت گزاری میں مصروف ہیں۔ چونکہ کائنات ایک کنبہ ہے اس لئے سورج کو ہم جب دیکھتے ہیں وہ ہمیں اجنبی نہیں لگتا اور سورج ہمیں کنبے کے افراد سمجھتا ہے۔

سات آسمان سات لاشعور ہیں جو انسان کے اندر ہمہ وقت متحرک رہتے ہیں۔ بچہ جب خود کفیل نہیں ہوتا، ماں باپ کفالت کرتے ہیں، آدمی کتنا بھی بڑا ہو جائے اللہ کے سامنے بچہ بن کر رہے۔ ایسی صورت میں اللہ بندے کی کفالت کرتا ہے۔ جب ہم پرندوں کی طرف دیکھتے ہیں تو ان کی تعداد کھربوں سے تجاوز کر جاتی ہے اور جب کسان کی طرف دیکھتے ہیں تو کرم خوردہ اناج بھی جھاڑو سے سمیٹ لیتا ہے۔

صدالصدور حضرت قلندر باباؒ اولیاءؒ فرماتے ہیں:

''پرندے جب بھوک کا تقاضہ رفع کرنے کے لئے زمین پر اڑتے ہیں اس سے پہلے کہ پرندوں کے پنجے زمین پر لگیں قدرت زمین پر پرندوں کے لئے دانہ پیدا کر دیتی ہے۔''

اللہ خوبصورت آواز پسند کرتا ہے، خود قرآن میں فرماتا ہے کہ ''آواز تو گدھے کی بھی ہے۔'' میرے بچے عظیمی خوش گفتار، خوش اخلاق، خوش الحاج اور خوش باطن ہیں۔ عظیمی بچہ کبھی ایک نہیں ہوتا۔ جہاں وہ ایک ہوتا ہے وہاں دوسرا اللہ ہوتا ہے، جہاں دو عظیمی ہوتے ہیں وہاں تیسرا اللہ ہوتا ہے۔ عظیمی ایک اور ایک دو نہیں ہوتے، ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔

عامل اور معمول

قلندر باباؒ منادی کرتے ہیں:

”رب راضی۔ سب راضی۔“

محمود صاحب۔ میں کون ہوں؟

عامل

آپ کون ہیں؟

معمول

جو بولوں گا وہ آپ سنیں گے؟

جی ہاں! سنوں گا

جو کہوں گا وہ آپ کریں گے؟

عامل۔ ادھر جایئے۔

معمول۔ چلا گیا۔

عامل۔ اوپر دیکھئے۔

معمول۔ جی ہاں۔ اوپر آسمان ہے۔

عامل۔ نیچے دیکھئے۔

معمول۔جی ہاں۔نیچے زمین ہے۔

عامل۔آپ کون ہیں؟

معمول۔میں،میں ہوں۔

عامل۔میں کون ہوں؟

معمول۔آپ،آپ ہیں۔

عامل۔میں کہاں تھا؟

معمول۔کب کہاں تھا؟

عامل۔جب یہاں نہیں تھا۔

معمول۔اچھااب میں سمجھا۔آپ اس دنیاسے اس پار دوسری دنیاکاتذکرہ کررہے ہیں،آپ دوسری دنیامیں تھے۔

عامل اور معمول

السلام علیکم

وعلیکم السلام

آپ کانام؟

محموداحمد

یہ نام کب رکھاگیا؟

اس وقت جب میں چند گھنٹوں یاایک دن کا تھا۔

معاف کیجئے گا۔کیامیں آپ سے یہ پوچھ سکتاہوں،آپ کی عمر کتنی ہے؟

جی ہاں!میری عمر تقریباً ساٹھ سال ہے۔

کیا آپ وہی ہیں جو پیدائش کے وقت تھے؟

جی ہاں! میں وہی ہوں۔

اگر آپ کی پیدائش کے وقت کی یا چند سال کی عمر کی تصویر آپ کو دکھائی جائے تو کیا آپ اس تصویر کو پہچان لیں گے۔

یہ کیسی بے وقوفی کی بات ہے کہ کوئی آدمی بھی پیدائش کے وقت کی یا چند سال کی عمر کی تصویر کو کیسے پہچان سکتا ہے؟

محمد احمد صاحب! آپ کی ہر چیز تبدیل ہو گئی ہے تو یہ کیسے تسلیم کر لیا جائے کہ آپ وہی محمود احمد ہیں جو ساٹھ سال پہلے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ کی شناخت آپ کے نام سے اس لئے ہے کہ آپ کا نام آپ کے باپ دادا نے رکھا تھا یعنی آپ نے اپنے باپ کا معمول بن کر ساٹھ سال زندگی گزار دی ہے۔

کمال مقصود صاحب۔ آپ کی باتیں میری سمجھ میں نہیں آئیں۔

اچھا! آپ کی سمجھ میں نہیں آئیں؟ اگر میں آپ کو یہ بات سمجھا دوں تو آپ کو میرا معمول بننا پڑے گا۔

میں تیار ہوں۔

عامل۔ محمود صاحب آپ کہاں تھے؟

معمول۔ میں بھی اس دوسرے عالم میں تھا۔

عامل۔ وہ عالم کیا ہے؟ کیا وہاں کوئی رہتا ہے؟ وہ عالم تو ہے لیکن اس عالم میں مادی جسم نہیں ہے۔

معمول۔ حیرت کا مقام ہے کہ جسم نہیں ہے۔ جسم نہیں تھا تو وجود کیسے بنا۔

عامل۔ وجود کی تعریف کیا ہے؟

معمول۔ ہر ٹھوس چیز وجود ہے۔

عامل۔ ٹھوس پن کسے کہتے ہیں؟

معمول۔ ٹھوس چیز ٹھوس ہے۔

عامل۔ ٹھوس چیز خلاء ہے۔

معمول۔ خلاء کیا ہے؟

عامل۔ خلاء بساط ہے۔

معمول۔ جناب بساط کی کیا تعریف ہے؟

عامل۔ بساط ایک عالم ہے۔

معمول۔ عالم کی بساط کیا ہے؟

عامل۔ عالم کی بساط روشنی ہے۔

معمول۔ روشنی کیا ہے؟

عامل۔ روشنی نور ہے۔

معمول۔ کمال مقصود صاحب۔ گتھیاں نہ الجھایئے بات سیدھی اور صاف کیجئے۔ یہ بتائیں کہ میں جب "میں" نہیں ہوں تو میری ذات کس طرح قائم ہے؟

عامل۔ میرے عزیز! میرے معمول، میرے دوست۔ اس کے علاوہ آپ اور میں کچھ بھی نہیں ہیں۔ سب ایک دوسرے کے معمول ہیں۔

ایک فرد بیس ہزار نادیدہ مخلوق کا معمول ہے اور فرد بیس ہزار آدمیوں پر عامل ہے یعنی انہیں کنڑول کرتا ہے۔ اس بات پر اگر غور کیا جائے تو یہ نتیجہ سامنے آتا ہے کہ ہر آدمی یہاں دوسرے آدمی کو Re-act کر رہا ہے۔ Re-act کرنا ہی دراصل معمول بن جانا ہے۔ میں نے جب کہا۔ السلام علیکم، آپ نے میرا سلام سنا۔

سن کر کہا۔ وعلیکم السلام۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ ساری کائنات ایک ہستی جس نے "کن" کہا اس کی معمول ہے۔ اور اس ہستی کے بنائے ہوئے قوانین جیسے جیسے کسی نے سیکھ لئے وہ علم کی بنیاد پر عامل ہے اور دوسرے سب معمول۔

کمال مقصود صاحب۔ آپ نے جو راز میرے اوپر منکشف کیا ہے میں نے سن تو لیا ہے مگر اس کی گہرائی میں جانے کے لئے مجھے غور و فکر کی ضرورت ہے۔ کچھ وقت کے لئے مجھے اجازت دے دیجئے۔ میں اور زیادہ علم سیکھنے کے لئے آپ کی خدمت میں پھر حاضر ہوں گا۔

گھر گھر دستک

میں نے ایک ہزار تنکے جمع کئے۔ میرا ایک دشمن تھا۔ دشمن پر کاری ضرب لگانے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ ایک ایک کر کے ہزار تنکے مارے جائیں تو دشمن ملیامیٹ ہو جائے گا۔ مگر ہوا یہ کہ سارے تنکے ٹوٹ گئے، میں ٹوٹے ہوئے ٹکڑے زمین پر جمع کرتا رہا۔ ہوا کا جھونکا آیا اور سارے تنکے تتر بتر ہو گئے کیونکہ میں دشمن کو اپنی دانست میں ملیامیٹ کر چکا تھا۔ اس نے یہ موقع غنیمت جانا اور مجھ پر ٹوٹ پڑا۔ میں ابھی اس ناگہانی افتاد سے سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ میرا ہر ہر عضو بیکار ہو گیا۔ جیسے ہر عضو موت کی نیند سو گیا ہو۔

میں نے اپنی بکھری ہوئی توانائی کو سمیٹ کر اٹھنا چاہا تو اتنی دیر میں دشمن نے بچے کچھے تنکوں کو اکٹھا کر کے ان کو ایک دوسرے کے ساتھ رسی سے باندھ دیا اور میرے سر پر دے مارا، آنکھوں کے سامنے ترمرے آئے اور میں نہیں معلوم کون سے عالم میں چلا گیا۔

میرے ارد گرد گدھ جمع ہو گئے اور انتظار کرنے لگے کہ کب سانس کی ڈوری ٹوٹے اور وہ جسم کو نوچ کر اپنی غذا بنائیں۔ آنکھیں تو میری بند تھیں، سماعت بھی نہیں تھی لیکن پھر بھی پتہ نہیں کس طرح میں دیکھ رہا تھا۔ میں سن رہا تھا۔

بزرگوں سے سن رکھا تھا کہ باہر کی آنکھ کی طرح اندر بھی آنکھ ہوتی ہے۔ باہر کے کانوں کی طرح اندر بھی کان ہوتے ہیں۔ نظر آسمان کی طرف اٹھی تو مجھے فضا میں چیلیں اڑتی ہوئی نظر آئیں۔ کوئے کائیں کائیں کرتے سنائی دیئے۔ لمحے بھی نہیں گزرے تھے کہ چیلیں اور کوئے بھی میرے جسم کے پاس آ کر بیٹھ گئے، یہ بھی انتظار کے عالم میں تھے۔ شاید انہیں یہ انتظار ہو کہ جان کا رشتہ جسم سے ختم ہو تو ہماری بھوک رفع ہو۔ سرخ رنگ کے بڑے بڑے چیونٹوں کا قافلہ تیزی سے میری طرف بڑھ رہا تھا۔ کچھ چیونٹے میرے پیروں سے چمٹ گئے اور انہوں نے بڑی بے رحمی سے میرے پیروں کو زخمی کر دیا۔ خون رسنے لگا۔ میں نے دیکھا کہ میرے اندر سے ایک اور ''میں'' نکلا اور سرہانے کھڑا ہو گیا، اس میری ''میں'' نے مجھ سے سوال کیا۔ کیا کہتے ہو؟ یہ جسم گدھوں، کوؤں، چیلوں، کتوں، بلیوں اور بھیڑیوں کی خوراک بنا دیا جائے یا ابھی اور تماشہ دیکھنا ہے؟ ابھی اور مصیبت کی چکی پیسنی ہے؟ میں نے بھیگی آنکھوں، روشن دماغ اور گداز دل سے کہا۔

میں نے جو تجربہ کر لیا ہے اس تجربے سے میں ایک اور تجربہ کرنا چاہتا ہوں۔ افتراق و اختلاف کی جس بھٹی نے مجھے سوختہ کر دیا میں اس بھٹی کو ٹھنڈا کر دینا چاہتا ہوں۔ میری ''میں'' نے مجھے جواب دیا۔ کیا پھر ایک ہزار تنکے جمع کرو گے اور ایک ایک تنکے سے دشمن

پر کاری ضرب لگاؤ گے ؟ میں نے کہا، نہیں۔ میں اپنے لوگوں کو جمع کر کے انہیں اپنی بے ثباتی کی کہانی سناؤں گا۔ انہیں یہ باور کراؤں گا کہ نفرادیت موت ہے۔

اجتماعیت زندگی ہے۔ انفرادیت بٹوارہ ہے، اجتماعیت استحکام ہے۔ انفرادیت محکوم ہے اور اجتماعیت حاکمیت ہے۔ میں گھر گھر دستک دوں گا۔ اے لوگو! ہم ایک ہیں، ہم امت ہیں، ہم ایک قوم ہیں، ہم ایک برادری ہیں، ہم ایک کنبہ ہیں اور ہم ایک خاندان ہیں۔ وحدت آبشار ہے امت دریا ہے، قوم بڑی بڑی نہریں ہیں، برادری ندی ہے۔ کنبہ واٹر کورس ہے اور خاندان وہ نالیاں یا وہ شریانیں ہیں جن سے پانی گزر کر ہماری زمین کو لہلہاتے کھیتوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔ میں اعلان کرتا پھروں گا کوئی سنے یا نہ سنے، پکارتا رہوں گا۔ انفرادیت ہلاکت ہے، انفرادیت عذاب ہے، اس عذاب سے ہمیں نجات دلانے کے لئے وحدت نے ایک پیغمبر ﷺ عطا کیا ہے، جس نے بتایا ہے کہ جن قوموں کو انفرادیت اور ذاتی غرض کا عفریت ڈس لیتا ہے، وہ زمین پر ادبار بن جاتی ہے۔ ادبار کی علامت بن جاتی ہیں۔ ہمارے نبی ﷺ نے لاکھوں سال کے تجربے کو سامنے رکھ کر پروگرام بنایا کہ ہم اجتماعی حیثیت حاصل کر کے ہلاکت و بربادی سے محفوظ رہ سکیں گے۔ نبی ﷺ نے ہمیں بتایا کہ مسلمان کی ساری زندگی اجتماعی زندگی ہے۔

۱۔ کوئی بھی بچہ جب زمین پر آتا ہے تو اس کی حیثیت ایک نہیں، تین ہوتی ہے۔ ایک ماں، ایک باپ اور ایک وہ خود (بچہ)۔

۲۔ معاشرے میں مقام حاصل کرنے اور باعزت زندگی گزارنے کے لئے جب ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا معاہدہ ”نکاح“ کیا جاتا ہے تو یہ فیصلہ بھی اجتماعی ہوتا ہے۔ ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ ولیمے کی حیثیت اجتماعی نہیں ہوتی ہے۔

۳۔ محلے محلے مساجد میں پانچ وقت اکٹھے ہونا۔ شہر کی بڑی بڑی مساجد میں جمعہ کے لئے جمع ہونا۔

۴۔ رمضان المبارک کے روزے اس طرح رکھنا کہ ایک آواز پر ہزاروں لاکھوں لوگ اپنے اوپر جائز کھانا پینا حرام کر لیتے ہیں اور دوسری آواز پر سب اجتماعی طور پر کھانے پینے میں مشغول ہو جاتے ہیں۔

۵۔ عید کی نماز میں لاکھوں فرزندان توحید ایک جگہ جمع ہو کر اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ ہم ایک اللہ کی مخلوق اور ایک نبی کی امت ہیں۔

۶۔ بقر عید میں اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد اللہ اکبر اللہ اکبر لا الہ الا اللہ واللہ اکبر اللہ اکبر وللہ الحمد پڑھتے ہوئے عید گاہ میں جمع ہو کر یہ شہادت دیتے ہیں کہ ہماری حیثیت من حیث القوم انفرادی نہیں ہے۔ ہم ایک نہیں پوری امت مسلمہ ایک ہے۔

ے۔ حج کے ارکان پورے کر کے مسلمان قوم ہر سال یہ اعلان کرتی ہے کہ دین حنیف کے ماننے والے ایک ہی ہیں۔ ان میں کوئی تعصب نہیں ہے، ان میں کوئی تفرقہ نہیں۔ ان میں کوئی کالا نہیں، کوئی گورا نہیں، کوئی عجمی نہیں اور کوئی عربی نہیں۔

اے لوگو سنو!

اگر مسلمان نے انفرادی حیثیت کو ختم نہیں کیا تو پوری قوم، پوری امت ایک مردہ جسم یا لاش کی طرح ہے۔ جس کے چاروں طرف گدھ، کوے، چیلیں اس انتظار میں ہیں کہ اسکو اپنا لقمۂ تر بنا کر نگل لیں۔ نوچ نوچ کر گوشت کھا جائیں۔ جس طرح میرے اندر کے ''میں'' نے آگاہی بخشی ہے اسی طرح مسلمان قوم کے اندر ایک اور قوم ہے۔ ایک اور تشخص ہے، ایک روح ہے جو پکار رہی ہے، بتا رہی ہے کہ اگر مسلمان قوم نے انفرادیت کے عذاب سے نجات حاصل کر کے اجتماعیت کو گلے نہیں لگایا تو یہ قوم صفحہ ہستی سے مٹ جائے گی اور زمین پر اس کا کوئی نام لیوا نہیں ہو گا۔ آیئے! عید کی مبارک باد اس طرح قبول کریں کہ ہمارے اندر نفرتوں کے جہنم بجھ جائیں تو تفرقوں سے ہم آزاد ہو جائیں اور اللہ کی رسی کو متحد ہو کر مضبوطی کے ساتھ تھام لیں۔ مسلمان قوم کے لئے یہی عید کا پیغام ہے۔

پرندے

بچپن گزرا، جوانی گئی، بڑھاپا آیا، تیز گام بڑھاپا اب نہ معلوم مگر معین سمت میں بھاگ رہا ہے۔ آدھی صدی سے زیادہ سالوں سے جسے میری دنیا ماضی کے نام سے جانتی ہے میرا عدم وجود بنا۔ پھر اس وجود نے پھیلنا اور بڑھنا شروع کیا۔ ننھی سی جان، زور آور سمجھی جانے لگی۔ معصوم کومل تصویر کے نقوش میں تیکھاپن آ گیا۔ زبان نے تکلم کیا تو یہ سراپا کلیم بن گیا۔ منٹوں تک پلک نہ جھپکنے والی آنکھ بار بار جھپکنے لگی۔ سریلی آواز سے آشنا کان کرخت آواز سے مانوس ہو گئے۔ جسم میں پانی کی جگہ خون دوڑنے لگا۔

خوشبودار پسینہ بدبو میں تبدیل ہو گیا۔ لطیف نورانی غذا کثافت بن گئی۔ خوش روئی تند خوئی میں تبدیل ہو گئی۔ گوشت جو دراصل درندوں کی غذا ہے آدمی کے لئے مرغوب بن گیا۔ ایک آدمی تھا، ایک پرندہ تھا۔ آدمی نے پرندے کی زندگی کو پرکھا اور پرندے نے آدمی کی زندگی پر غور کیا۔ دونوں کی سوچ جب ایک نقطے پر آ گئی اور دونوں کی سوچیں باہم مل گئیں یعنی جان سے جان مل گئی۔ جان جان سے ملی تو پرندے اور انسان کی مشترک قدریں ایک دوسرے میں تحلیل ہو گئیں۔ ایک سوداگر تھا اس نے انسانی وقار مجروح کر کے آدمیت کے روپ میں دولت اور عقل کے زعم پر ایک طوطا خریدا۔ مشترک قدر، قوت و نطق سے دونوں کے اندر انتقال خیال کا عمل جاری ہوا۔ دونوں ایک دوسرے کی زبان سمجھنے لگے اور ایک دوسرے سے باتیں کرنا مشغلہ بن گیا۔

طوطا اپنا نسب نامہ سناتا تھا کہ میں آزاد پنچھی تھا اور قوم کے ساتھ فضاؤں اور آسمانی وسعتوں میں پرواز کرتا تھا۔ باغوں میں سے پھل کھاتا تھا۔

ہری بھری شاخوں پر جھولا جھولتا تھا۔

قسمت کا مارا اپنے قبیلے اور قوم سے بچھڑ گیا۔ بھوکا پیاسا ادھر سے ادھر اڑتا پھرتا تھا کہ ایک جگہ زمین پر دانہ پڑا ہوا دیکھا۔ بلندیوں کا مکین، اعلیٰ غذاؤں سے پیٹ بھرنے والا۔ میں پنچھی۔ دانہ دیکھ کر صبر نہ کر سکا اور اونچی پرواز بھول پر نیچی اڑان سے اسفل میں گرتا چلا گیا۔ ابھی زمین پر پوری طرح پنجے بھی نہیں لگے تھے اور میں نے شکم سیری کے لئے ایک نوالہ منہ میں نہیں ڈالا کہ دھوکے باز انسان نے رسی کو جھٹکا دیا اور میں جال میں قید ہو گیا۔ بہت پھڑ پھڑایا۔ آزاد ہونے کی کوشش کی مگر میرا کچھ بس نہ چلا۔ اس دھوکے باز انسان نے بھوکا رکھ کر پنجرے میں محبوس کر کے بالجبر مجھے اپنی زبان سکھائی اور جب میں نے اس بدنیت انسان کی زبان سیکھ لی تو

اس نے بڑے تول مول سے مجھے تیرے ہاتھ بیچ دیا۔اے میرے محسن! تونے میری قیمت لگائی ہے لیکن میں خوش نہیں ہوں۔اگر تجھے میری طرح قید کر دیا جائے تو کیا تو خوش ہو گا؟

سوداگر نے طوطے کی باتیں سنیں تو خوش ہوا اور اس کی قیمت اس کے ذہن میں دوچند ہو گئی۔ مہینوں کے بعد سال گزرا تو سوداگر کو ملک سے باہر جانا پڑا۔ سوداگر نے طوطے سے کہا کہ میں ملک سے باہر جا رہا ہوں، تیرا کوئی کام ہو تو بتا۔ طوطے نے کہا۔اے میرے محسن! جب تو کسی باغ سے گزرے اور وہاں طوطوں کو دیکھے تو ان سے میرا اسلام کہنا اور کہنا کہ تمہارا ایک بھائی قید و بند کی زندگی گزار رہا ہے اور تمہیں یاد کرتا ہے۔ سوداگر سفر میں جب ایک باغ سے گزرا تو اس نے وہاں بہت سارے طوطوں کو دیکھا جو آزادی کیساتھ اڑ رہے تھے اور طرح طرح کی بولیاں بول رہے تھے۔ سوداگر نے طوطوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ تمہارے ایک بھائی طوطے کا پیغام ہے اور اس نے طوطے کا پیغام من و عن سنا دیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے درخت سے ایک طوطا گرا اور پھڑ پھڑا کر موت کی نیند سو گیا۔ سوداگر کو بہت قلق ہوا اور وہ افسوس کرتا ہوا وہاں سے چل پڑا۔ سفر سے واپس آنے کے بعد سوداگر جب اپنے گھر پہنچا تو اس نے پنجرے میں بند طوطے کو ساری روداد سنائی روداد کا سننا تھا کہ طوطا پنجرے میں گرا اور پھڑ پھڑا کر مر گیا۔

سوداگر بہت رنجیدہ خاطر ہوا اور پنجرہ کھول کر نہایت افسوس کیساتھ طوطے کو باہر پھینک دیا۔ابھی سوداگر افسوس ہی کر رہا تھا کہ طوطا ٹیں ٹیں کرتا ہوا اڑا اور درخت پر جا بیٹھا۔ سوداگر نے حیرانی کے عالم میں کہا کہ تو بہت بے وفا نکلا، بتا کہ یہ ماجرا کیا ہے؟ طوطا بولا۔ جنگل میں میرے قبیلے کے ایک دانشور طوطے نے یہ پیغام بھیجا ہے کہ آزادی دو طرح سے نصیب ہوتی ہے۔

۱۔اس طرح کہ قبیلہ متحد رہے اور اجتماعی جدوجہد سے اپنی آزادی کا تحفظ کرے۔

۲۔اگر کوئی اپنے قبیلے سے بچھڑ جائے اور قید ہو جائے تو اس کے لئے آزادی کا طریقہ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کہ وہ اپنی جان ایثار کر دے اور آزادی کے تحفظ کے لئے مر جائے۔

میں نے اپنے قبیلے کے دانشور بزرگ کا پیغام سمجھ لیا اور میں اس نصیحت پر عمل کر کے آزاد ہو گیا۔ خدا حافظ۔ ٹیں ٹیں ٹیں ٹیں۔

بجلی آگئی

ہر انسان ہر وقت کچھ نہ کچھ سوچتا ہے۔ یعنی خیالات کی لہریں آدمی کے دماغ پر سے گزرتی رہتی ہیں۔ یہ لہریں ایک طرف انفرادی زندگی کو انسپائر کرتی ہیں اور ساتھ ساتھ ان لہروں کے اوپر کائنات میں موجود نوعی اشتراک کا عمل دخل بھی ہے۔ ان لہروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کائنات اور اس کے اندر تمام مظاہرات ہر آن ہر لمحہ ایک دائرے میں سفر کرتے ہیں۔ دائرے میں سفر بجائے خود اس بات کی شہادت ہے کہ ہر مظہر ایک دوسرے سے آشنا اور متعارف ہے۔ تعارف کا یہ سلسلہ لہروں کے اوپر قائم ہے اور لہروں کو خیالات کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ ساری کائنات دراصل لہروں کے تبادلے کے اوپر قائم ہے۔ کائناتی نظام اس سسٹم پر چل رہا ہے کہ لہر ہر وجود میں سے گزرتی ہے۔ وجود میں کسی مخصوص پرت یا کسی نوع کی قید نہیں ہے۔ آج کے دور میں ٹی وی، وی سی آر، ریڈیو، فریج اور اینٹینا اس کی روشن شہادت ہیں۔ زیادہ آسان لفظوں میں یوں کہا جاتا ہے کہ کائنات میں موجود ہر وجود میں ایک اینٹینا ہے۔ یہ اینٹینا ہر دوسرے وجود کی لہر کو قبول بھی کرتا ہے اور اپنی لہروں کو دوسرے وجود کے اینٹینا میں منتقل بھی کرتا ہے۔ جب تک وجود میں موجود نصب شدہ اینٹینا میں وصول کرنے اور منتقل کرنے کا عمل جاری نہ ہو کائنات کا کوئی ایک فرد نہ بول سکتا ہے اور نہ سن سکتا ہے۔ لہروں کی ایک وجود سے دوسرے وجود میں منتقلی کو سائنس نے توانائی کا نام دیا۔ سائنس کا کہنا ہے کہ مادہ مختلف ڈائیوں میں منتقل ہو کر توانائی بن جاتا ہے۔

دوپہر کا وقت تھا۔ دھوپ کی تمازت سے جسم جھلس رہے تھے۔ ہوا بند تھی حبس کا عالم تھا، بجلی لوڈشیڈنگ کے نام پر محو استراحت Humidity کی وجہ سے سبک خرام ہوا اتنی بوجھل تھی کہ درخت کے پتے بھی ساکت وجامد تھے۔ حبس کے اس عالم میں جسم دانوں سے بھر گیا تھا۔ لگتا تھا کہ مسامات میں مرچیں بھر گئی ہیں۔ نہایت اضطراب کی کیفیت تھی۔ دماغ ماؤف تھا۔ خیال آیا کہ جب زمین پر ان گرم لہروں نے ہر وجود کو بے قرار کر دیا ہے تو دوزخ میں کیا حشر ہو گا۔ پھر خیال آیا کہ دوزخی مخلوق کے لئے گرمی کی یہ تمازت تاب لہریں دراصل دوزخ میں رہنے کی پریکٹس ہے، ابھی دوزخ کا نقشہ اور بھڑکتی آگ کا عکس آنکھوں کے سامنے آیا ہی تھا کہ بارہ کھرب خلیوں میں سے ایک خلئے میں جھماکہ ہوا۔ پتہ نہیں اس جھماکہ میں کیا تاثیر تھی کہ دماغ میں ایک دروازہ کھلا۔ دروازہ کے اندر سے جو لہریں دماغ پر منتقل ہوئیں ان لہروں کا مفہوم یہ تھا۔ اللہ تعالیٰ کسی بندے کو اس کی سکت اور اس کی برداشت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا تھا۔ پاس بیٹھے ہوئے میرے بیٹے حکیم نور عجم نے سوال کیا، جیسے ہی سوال کیا بجلی آگئی پنکھا

چل پڑا۔ دماغ کو آرام ملا۔ سوال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ساری کائنات کو محبت کے ساتھ خلق کیا۔ اور ساری کائنات ''کن'' کہنے سے وجود میں آئی۔ مطلب یہ ہے کہ مختلف صلاحیتوں کے لئے الگ الگ کن نہیں کہا گیا۔

جب ایک ''کن'' سے پوری کائنات وجود میں آئی تو صلاحیتیں بھی سب میں مساوی تقسیم ہوئیں۔ لیکن ہمارا تجربہ یہ ہے کہ ہر آدمی میں صلاحیتیں مختلف ہیں اور جب ہر آدمی میں صلاحیتیں مختلف ہوتی ہیں تو مساوات کا قانون زیر بحث آ جاتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ افلاطون نے کہا کہ قدرت آزاد اور غلام الگ الگ پیدا کرتی ہے۔ اس نظریہ کی مخالفت میں سقراط کو زہر کا پیالہ پینا پڑا۔ بیٹے کے سوال کی گہرائی پر جب میں نے تفکر کیا تو اسکرین پر بجلی کی فلم چلتی نظر آئی۔

سمندر میں اٹھتی لہریں نظر آئیں۔ لہروں کے ٹکرانے سے عمل سے ہی بخارات بنے، ہوا نے انہیں اوپر اچھالا تو بادل بن گئے۔ بادلوں کو پھر ہوا نے دھکیلا۔ کارواں در کارواں اڑتے ہوئے شمال میں جا برسے۔

اونچی اونچی پہاڑیوں کہساروں پر برف جمی۔ سورج نکلا۔ سورج کی لہروں کی توانائی جب برف میں منتقل ہوئی تو برف پانی بن گیا۔ پانی فراز سے نشیب میں اترا دریا بن گئے۔ دریاؤں کو روک کر ڈیم بنے، ڈیم میں سرنگیں بنی۔ سرنگ کے ذریعے ٹربائن چلے اور بجلی کی ولادت ہوئی۔ گرڈ اسٹیشن تک بجلی کی لہروں کی رسائی ہوئی۔ وہاں سے ہائی ٹینشن تار میں ان لہروں کو منتقل کیا گیا اور سب پاور اسٹیشن بنے اور پھر وہاں سے گھروں کے سامنے کھمبے لگا کر گھر گھر بجلی کی لہریں منتقل کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ میں نے اپنے بیٹے نور عجم سے کہا۔ چھت پر دیکھو کیا نظر آتا ہے؟

اس نے بتایا پنکھا چل رہا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ٹیوب لائٹ کیوں نہیں جل رہی ہے۔ وہ بولا سوئچ آف ہے بیٹے کے باپ وضاحت کی۔ بیٹا! تمہارے گھر میں تھری فیز بجلی یا توانائی ہے اور یہ توانائی تاروں کے ذریعے مسلسل تاروں میں دوڑ رہی ہے۔ ان تاروں سے اگر تم چاہو تو دس پندرہ قمقمے اوپر نیچے منزل میں دو فریج، دو ٹی وی، دو وی سی آر، دو اسے سی چلا سکتے ہو۔ اور اگر تم نہیں چاہتے تو صرف پورے گھر میں پندرہ واٹ کا بلب ہی روشن کر سکتے ہو۔ تاروں کے اندر دوڑتی ہوئی توانائی تمہاری خدمت گزار ہے۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم توانائی سے کتنا کام لیتے ہو اور موجود تونائی کو کس حد تک نظرانداز کر دیتے ہو۔

جو اللہ تعالیٰ نے خدمت گزاری کے بے شمار شعبے بنائے ہیں یہ دراصل توانائی کی تقسیم ہے۔ ایک آدمی دھوپ میں بیٹھ کر جوتے گانٹھتا ہے۔

اس کا نام موچی ہے۔ دوسرا آدمی گھر میں بیٹھ کر جوتے سیتا ہے اس کا نام بھی موچی ہے۔ تیسرا جوتے کا کارخانہ کھول کر اس کا نام باٹا رکھ دیتا ہے اس کا نام بھی موچی ہے۔

مقصد یہ ہے کہ کس آدمی نے توانائی کو کتنا استعمال کیا۔ جس طرح بجلی تمہیں ہزار بلب روشن کرنے نہیں روکتی، اسی طرح تمہارے اندر ہزاروں، لاکھوں توانائیاں اپنے استعمال سے منع نہیں کرتی۔ یہی مساوات ہے۔ اس قانون کو تم موچی، بڑھئی، لوہار، انجینئر، فنکار، تاجر اور سائنس کے تمام شعبوں پر قیاس کر سکتے ہو۔ قدرت نے کبھی کسی کو منع نہیں کیا کہ وہ اس کی دی ہوئی علمی صلاحیتوں سے استفادہ کر کے سائنسدان بنے۔ قدرت نے صلاحیتوں کے استعمال کے لئے میٹریل تخلیق کیا ہے۔ بلا تخصیص ہر ملک، ہر قوم اور ہر فرد کیلئے یہ میٹریل مفت فراہم ہوتا ہے۔ سائنس دان ایٹم بم بناتا ہے۔ ایٹم بم میں کام آنے والی تمام اشیاء بھی قدرت کی پیدا کردہ ہیں۔ مثلاً زمین، یورنیم، الیکٹریسٹی اور وہ میٹریل جس سے بھٹیاں بنتی ہیں۔ اربوں، کھربوں سال کی تاریخ شاہد ہے کہ وسائل کا کوئی پیسہ ٹکہ آدم زاد نے اللہ کو نہیں دیا۔ تعمیری شعبوں پر نظر ڈالو، زمین فری، زمین کے اندر جو بیج ڈالا جاتا ہے وہ فری۔ بیج کروڑوں سال پہلے جب بھی پیدا ہوا۔ اس کی کوئی قیمت نہیں لی گئی۔

ہوا فری، دھوپ فری، چاندنی فری، آکسیجن فری، بارش فری، حد یہ ہے کہ جسم انسانی میں خون کو شریانوں اور وریدوں میں دوڑانے کی توانائی فری۔ چھ ارب آبادی میں ایک فرد واحد اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ جسم انسانی میں کام کرنے والی انرجی کی اس نے کبھی کوئی قیمت ادا کی ہو۔ دنیا میں موجود بے شمار صلاحیتیں دراصل توانائیاں ہیں۔ بجلی کی مثال سامنے رکھ کر یہ سمجھ لو کہ جتنی توانائی کوئی بندہ استعمال کرنا چاہتا ہے توانائی اس کی خدمت کرنے سے انکار نہیں کرتی۔

روٹی

آدمی چل رہا ہے۔ زمین چکر میں ہے۔ آسمان حرکت میں ہے۔ آسمان حرکت میں ہے تو چاند، سورج، ستارے اور کہکشاں بھی متحرک ہیں۔ زمین میں پانی اندر باہر اوپر نیچے نشیب میں بہہ رہا ہے۔ پانی جس کی فطرت نشیب میں بہنا ہے، درختوں میں ایک خاص پروسیس سے بظاہر اپنی فطرت تبدیل کر کے اوپر جا رہا ہے نہ صرف اوپر جا رہا ہے بلکہ نئے نئے روپ میں جلوہ گر ہو رہا ہے۔ پانی جس کو آسمانی کتابوں نے ''ماء'' کہا ہے۔ ہر ڈائی میں خدوخال کے ساتھ مظاہرہ کرتا رہتا ہے۔

پانی رب ذوالجلال کا عطیہ ہے۔ سمندر کا پانی کڑوا ہے تو کنویں کا پانی میٹھا ہے، دریا کا پانی مٹیالا ہے تو چشموں کا پانی موتی کی طرح شفاف اور چمکدار ہے۔ پانی کائنات کے ہر یونٹ کے لئے حیات ہے۔ شریانوں، وریدوں میں خون بن کر دوڑ رہا ہے۔ آدمی جو تناول کرتا ہے، شیر جو کھاتا ہے۔ چڑیا جو چگتی ہے۔ مچھلی جو پیتی ہے۔ سب میں تین حصے پانی ہے۔ پانی نطفہ ہے۔ پانی علق ہے۔ پانی مضغہ ہے۔ پانی لو تھڑا ہے۔ پانی عضو کی تشکیل ہے اور پانی جسم ہے۔ پانی زندگی ہے اور پانی سے قطع تعلق موت ہے۔

دستر خوان پر ایک باپ، تین بیٹے، ایک بیٹی کھانا کھا رہے تھے۔ انواع و اقسام کے کھانے دستر خوان پر چنے ہوئے تھے۔ کھانا کھاتے کھاتے باپ کو اُچھو لگا۔ روٹی کا ٹکڑا حلق میں پھنس گیا۔ آنکھیں ابل پڑیں۔ چہرہ لال ہو گیا۔ بیٹی دوڑی اور گلاس بھر لائی۔ پانی حلق میں انڈیلا۔ جان میں جان آئی۔ کھانے کی طرف سے ذہن ہٹ کر روٹی کے ٹکڑے میں اٹک گیا۔ ایک وقت تھا جب آدم نہیں تھا۔ لیکن روٹی تھی۔ حوا روٹی پکانا نہیں جانتی تھی۔ تب بھی روٹی تھی۔ آدم و حوا برسوں کی مسافت کے بعد ملے تو ایک سے دو ہوئے اور دو، دو میں جمع ہوئے تو ضرب کا فارمولا وجود میں آیا۔

ضرب در ضرب، حاصل ضرب سے آدم و حوا کے جھونپڑے کم ہو گئے تو تعمیرات کا سلسلہ شروع ہوا۔ تعمیرات سے ارتقائی مراحل سامنے آیا۔ حیوانات و آدم میں فرق وضع ہونے لگا۔ آدم کے بچوں نے گھاس پھونس چھوڑ دیا اور جڑیں کھانے سے انکار کر دیا۔ صورت خراب سے خراب تر ہوتی چلی گئی۔ ابا آدم اور اماں حوا سر جوڑ کر بیٹھے۔ طے پایا کہ گندم کاشت کی جائے۔ زمین کے چھوٹے چھوٹے حصے کر کے کھیت بنائے۔ زمین کرید کر آسمان سے اترا ہوا دانہ گندم زمین میں ڈال دیا گیا۔ گندم کو پیسنے کے لئے پتھروں کی چکی ایجاد ہوئی۔ گندم کے دانے نے کہانی سنائی۔ دنیا کا جب ظہور ہوا، گندم کو زمین پر پھینک دیا گیا۔ وہ تنہا تھا کوئی ہم نشین و غم گسار نہیں تھا۔ زمین جو سب کی ماں ہے اس نے اپنے ایک لخت جگر کی آہ و زاری سنی تو مما کے جوش سے باوا گندم کے لئے اپنی آغوش وا

کر دی۔ ماں کی گود کے لمس سے باوا گندم کو قرار آیا۔ سکون ملا۔ راحت سے آشنا ہوئے سکون کی لہروں میں جب زمین کے اندر دوڑنے والی رنگ رنگ لہریں ملیں اور ایک دوسرے میں پیوست ہوئیں تو باوا گندم کی نسل چل پڑی۔ ادھر گندم کی نسل پروان چڑھی ادھر باوا آدم کی اولاد دنیا میں پھیلتی چلی گئی۔ آدم کی نسل نے اپنی خوراک کے لئے گندم کا انتخاب کر کے دراصل گندم کی خدمت گزاری میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی۔ آدم کی طرح میرے آباؤاجداد گندم کا بھی خاندان ہے۔ اس خاندان میں ناٹے قد اور دراز قد ہوتے ہیں۔ میرے خاندان کا وصف یہ ہے کہ ہم سب گندم خاندان کے فرد آدم کی بہتر سے بہتر خدمت کے لئے اپنی صلاحیتوں کا برملا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ہماری ایک صلاحیت یہ بھی ہے کہ ہمارے اندر خود سپردگی کا عنصر موجود ہے۔ روٹی کو آپ قورمے سے کھائیں۔ چینی سے کھائیں۔ شب دیگ سے کھائیں۔ پیاز سے کھائیں یا پانی سے کھائیں، روٹی کبھی آپ کا ہاتھ نہیں روکے گی۔ پتھروں کی چکی ایجاد ہوئی۔ آٹا پس گیا۔ آٹے میں پانی گندھا، بچوں نے کھایا تو بیمار پڑ گئے۔ بیماریوں سے محفوظ رہنے کیلئے آگ روشن ہوئی۔ آگ کے بعد لوہا دریافت ہوا۔ توا بنا، آگ جلا کر آٹا توے پر ڈالا گیا تو روٹی پک کر تیار ہو گئی۔ روٹی ہی فساد کی جڑ ہے۔ جتنا فساد روٹی خور آدم کرتا ہے، گوشت کھانے والا شیر بھی نہیں کرتا۔ یہ روٹی بھی عجیب شئے ہے۔ ارتقاء کے ساتھ ساتھ ہر چیز تبدیل ہو گئی مگر روٹی روٹی ہی رہی۔ روٹی خور آدم نہیں بدلا۔

ایک فقیر ایک قاضی دونوں آپس میں گہرے دوست تھے۔ قاضی کہتے تھے اسلام میں پانچ رکن ہیں اور فقیر فرماتے تھے کہ رکن چھ ہیں۔

قاضی صاحب حج کو گئے۔ اس زمانے میں ہوائی جہاز تو ہوتے نہیں تھے۔ پانی کا جہاز طغیانی میں آگیا۔ سمندر کی لہروں نے تین منزلہ جہاز کو آسمان کی طرف اچھال دیا۔ دوسرے مسافروں کا کیا بنا یہ تو نہیں پتہ مگر قاضی صاحب ڈوبتے ابھرتے ساحل پر جا گرے۔ ہوش وحواس درست ہوئے تو بھوک پیاس لگی۔ سخت بے چینی اور اضطراب میں تھے کہ دور سے آتا ہوا ایک سایہ نظر آیا۔ قاضی صاحب ہمت کر کے اس سایہ کی طرف بڑھے۔ سایہ ان کے قریب آگیا۔ بے گوشت پوست آدمی نے قاضی صاحب سے پوچھا کیا بات ہے۔ کیا پریشانی ہے، کیوں پریشان وبے قرار ہو؟ قاضی صاحب بولے، پیاس لگی ہے۔ بھوکا ہوں۔ ماورائی وجود نے کہا۔ ساری عمر کی کمائی آدھی نیکیاں لکھ دو قاضی نے آدھی نیکیاں لکھ دیں اور پانی پی لیا۔ بھوک بڑھی تو روٹی مانگی، ماورائی شخص نے کہا۔ روٹی کھانی ہے تو باقی آدھی نیکیاں بھی لکھ دو۔ قاضی صاحب جب گھر لوٹے تو اپنے دوست فقیر کے پاس گئے، فقیر نے پوچھا۔ اے قاضی اسلام میں پانچ رکن ہیں یا چھ ؟ قاضی بولا ! اسلام کے رکن پانچ ہیں۔ فقیر نے اپنی گدڑی ٹٹولی اور قاضی کے لکھے ہوئے دونوں پرچے سامنے رکھ دیئے۔ روٹی کیا ہے ؟ روٹی بھوک کا تمثل ہے۔

اطلاع کی عکاسی ہے اور بھوک کی کیفیت کا مظہر ہے۔ ایسا مظہر جس کے اوپر تمام اخلاقیات کی بنیاد قائم ہے۔ اس کی وجہ سے حسیات زندہ یا مردہ ہیں۔

جو لوگ اس بات کو سمجھتے ہیں انہوں نے چالا کی سے ایک جال بن لیا ہے۔ خدا دشمنی کا جال، جب وہ کسی قوم پر پھینکتے ہیں اور قوم اس جال کو اپنا کر ان کی محتاج بن جاتی ہے اور پھر روٹی کے لئے انہیں وسیلہ ترقی سمجھ لیتی ہے تو ایک ایک روٹی کے لئے ان کی محتاج بن جاتی ہے اور پھر روٹی کے لئے محتاج قوم ان کی غلام بن جاتی ہے۔ ایسا ہو جانے سے قوم کا تشخص، کردار اور اپنی شناخت ختم ہو جاتی ہے۔ ذہن ماؤف ہو جاتے ہیں اور دلوں پر بے حسی طاری ہو جاتی ہے۔ ایسی قوموں پر ان کی اپنی زمین تنگ ہو جاتی ہے اور وسائل پر دوسری قومیں قابض ہو جاتی ہیں۔ زمین اپنے محور پر گھومتی رہتی ہے اور زمین پر رہنے والے اپنی بے حسی کی وجہ سے غلام بنتے رہتے ہیں۔ یہی وہ نامراد، اللہ کی محبت سے دور ہے جس کے لئے ارشادِ الٰہی ہے۔

''مہر لگادی ہے اللہ تعالٰی نے ان کے دلوں پر، ان کے کانوں پر اور دبیز پردے ڈال دیئے ہیں ان کی آنکھوں پر۔''

کیوں؟ اس لئے کہ یہ سب اللہ کی مملکت میں رہتے ہوئے اللہ کے باغی ہیں۔

''وہ لوگ جو سود لیتے ہیں، سودی معیشت میں زندگی گزارتے ہیں بلاشبہ اللہ کے دشمن ہیں۔''

اللہ کا نظام

نظام تکوین میں اللہ کے بندے کام کرتے ہیں اور ان بندوں کی معاونت فرشتے کرتے ہیں۔ دراصل یہ وہی بندے ہیں جو اللہ کے ارشاد کے مطابق ''فی الارض خلیفہ'' ہیں۔ تکوینی نظام میں اللہ تعالیٰ کے اختیارات استعمال کرنے والے بندوں میں سب سے اعلیٰ عہدہ سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس ہے۔ کسی صوفی نے کیا خوب فرمایا ہے:

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

رب المشرقین ورب المغربین کے محبوب رحمتہ اللعالمین، باعث تخلیق کائنات، سیدنا حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مقام محمود میں اس طرح قیام فرما ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات جب کن کا مظاہرہ کرتی ہیں تو پہلے تجلیات کا نزول رحمت اللعالمین ﷺ کے اوپر ہوتا ہے پھر یہ جلال تجلی حضور ﷺ کی رحمت سے جمال میں تبدیل ہو کر کتاب المبین پر نزول فرماتا ہے۔ یعنی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام، اللہ تعالیٰ اور کائنات کے درمیان واسطہ (Medium) ہیں۔ حضور ﷺ نے خود فرمایا:

''اللہ نے سب سے پہلے میرا نور تخلیق کیا۔''

موجودہ سائنس تلاش و جستجو کے اس راستے پر پہنچی ہے کہ پوری کائنات ایک ہی قوت کا مظاہرہ ہے۔ یہ انکشاف نیا نہیں ہے۔ ہمارے اسلاف میں کتنے ہی لوگ اس بات کو بیان کر چکے ہیں کہ کائنات کے تمام مظاہر کو ایک ہی توانائی کنٹرول کر رہی ہے اور اس قوت کا براہ راست اللہ تعالیٰ کے ساتھ ربط ہے۔ قرآن اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

''اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔''

ہم مادی سائنس اور اپنے اسلاف کے علوم کا موازنہ کرتے ہیں تو یہ دیکھ کر ہمارے اوپر حیرت کے باب کھل جاتے ہیں کہ اب سے تقریباً آٹھ صدی پہلے حضرت شاہ عبدالقادر جیلانیؒ ایک ایسے عظیم سائنس داں تھے جو فطرت کے قوانین کو جانتے تھے جن کے وجود مسعود سے آفاقی قوانین کے رازہائے سربستہ کا انکشاف ہوا ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر جیلانیؒ فطرت کے قوانین کے استعمال کا جو طریقہ بتا گئے ہیں اور انہوں نے ان قوانین کو سمجھنے کی جو راہ متعین کی ہے وہاں آج کی سائنس کھربوں ڈالر خرچ کر کے بھی

نہیں پہنچ سکتی ہے اور اب یہ بات سامنے آچکی ہے کہ ہر شئے میں برقی مقناطیسی Electromagnetic لہریں موجود ہیں۔ مختلف اشیاء میں یہ لہریں مختلف تناسب اور مقداروں میں کام کرتی ہیں جبکہ ان لہروں کو ایک بنیادی قوت زندگی مہیا کر رہی ہے۔ یہی لہریں ہیں جو زندگی اور زندگی کے تمام عوامل و حرکات کو قائم رکھے ہوئے ہیں۔

شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ نے بتایا ہے کہ زمین اور آسمان کا وجود اس روشنی پر قائم ہے جس کو اللہ کا نور فیڈ کرتا ہے۔ اگر نوع انسانی کا ذہن مادہ سے ہٹ کر اس روشنی میں مرکوز ہو جائے تو وہ یہ سمجھنے پر قادر ہو جائے گا کہ انسان کے اندر عظیم الشان ماورائی صلاحیتیں ذخیرہ کر دی گئی ہیں جن کو استعمال کر کے نہ صرف یہ کہ وہ زمین پر پھیلی ہوئی اشیاء کو اپنا مطیع و فرمانبردار کر سکتا ہے بلکہ ان کے اندر کام کرنے والی قوتوں اور لہروں کو حسب منشاء استعمال کر سکتا ہے۔ پوری کائنات اس کے سامنے ایک نقطہ یا دائرہ بن کر سامنے آجاتی ہے۔ اس مقام پر انسان مادی وسائل کا محتاج نہیں رہتا۔ وسائل اس کے سامنے سربسجود ہو جاتے ہیں۔ ہم جب قرآن کی تعلیم اور رسول اللہ ﷺ کی سیرت کو دیکھتے ہیں اور مسلمانوں کی حالت پر نظر ڈالتے ہیں تو سوائے افسوس کے کچھ حاصل نہیں ہوتا اس لئے کہ قرآن کی حقیقی تعلیم اور مسلمانوں کے عمل میں بہت بڑا تضاد واقع ہو چکا ہے۔ قرآن جس راہ کا تعین کرتا ہے۔ مسلمان جس راستہ پر چل رہا ہے یہ دونوں دو ایسی لکیروں کی طرح ہیں جو آپس میں کبھی نہیں ملتیں۔

اللہ نے انسان کو اپنا نائب بنایا ہے اس کے اندر اپنی صفات کا علم پھونکا ہے اس کو اپنی صورت پر تخلیق کیا ہے۔ نائب کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ اگر ایک مملکت کا صدر اپنے اختیارات کو استعمال کرنے میں کاغذ قلم کا محتاج نہ ہو تو اس کا نائب اختیارات استعمال کرنے میں کاغذ قلم کا محتاج ہو۔ اللہ وسائل کی محتاجی کے بغیر حاکم ہے تو اس کا نائب بھی وسائل کا دست نگر نہیں ہوتا جس طرح خدا نے کن کہہ کر کائنات کو وجود بخشا ہے خدا کا نائب بھی اپنے ذہن کو حرکت دے کر خدا کی تخلیق میں تصرف کر سکتا ہے۔ کیونکہ اللہ کا نائب اس بات سے واقف ہوتا ہے کہ کائنات میں موجود تمام مظاہر ایک ہی ذات سے ہم رشتہ ہیں۔

مسلمان کے پاس ماورائی علوم کا جتنا بڑا سرمایہ موجود ہے، وہ اسی مناسبت سے مفلوک الحال ہے۔ مسلمان کے اسلاف نے اس کے لئے حاکمیت اور تسخیر کائنات کے بڑے بڑے خزانے ترکہ میں چھوڑے ہیں لیکن یہ وہ بدنصیب قوم ہے جس نے ہیرے کو پتھر کہہ کر پھینک دیا ہے اور اس خزانے سے مستفیض ہونے کی صلاحیت کھو بیٹھی ہے۔ یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ مصلحتوں کے پیش نظر مسلمان کو تفکر کی راہ سے دور ہٹا دیا گیا ہے اور اس کے سامنے ایسی نہج آگئی ہے جہاں اس کا ہر عمل کاروبار بن گیا ہے۔ کتنی مضحکہ خیز ہے یہ بات کہ قرآن کائنات پر ہماری حاکمیت اور سرداری کو تسلیم کر رہا ہے، ہمارے اوپر حاکمیت اور سرداری کے دروازے کھول رہا ہے اور ہم قرآن کو محض برکت کی کتاب سمجھ کر طاقوں میں سجائے رکھتے ہیں۔ جب کوئی افتاد پڑتی ہے تو اس کی آیات کی تلاوت کر کے دنیاوی مصائب سے نجات کی دعائیں مانگتے ہیں مگر اس طرف ہماری توجہ مبذول نہیں ہوتی کہ قرآن میں تفکر اگر ہمارا اشعار بن جائے اور ہم اس تفکر کے نتیجے میں میدان عمل میں اتر آئیں تو ساری کائنات پر ہماری سرداری مسلم ہے۔ افسوس کہ ہم ان

خزانوں کو نظرانداز کر کے دوسروں کے دست نگر بنے ہوئے ہیں۔ قرآن کے ارشاد کے مطابق اللہ نے ہمیں شمس و قمر، نجوم، ارض و سماوات سب پر حاکم بنادیا ہے اور اس حاکمیت کو حاصل کرنے کے طریقے بھی بتائے ہیں۔

لیکن ہم ہیں کہ ہر شعبۂ زندگی میں دوسروں کے پس خردہ نوالوں کو اپنی زندگی کا حاصل مقصد سمجھ بیٹھے ہیں۔ ہماری زندگی محض دنیا کے حصول تک محدود ہو گئی ہیں۔ ہم اعمال کے ظاہری پہلو کو تو بہت اہمیت دیتے ہیں مگر باطن میں بہتے ہوئے سمندر میں سے ایک قطرہ آب بھی نہیں پیتے۔ آسمان علم و آگاہی کے خورشید منفرد اور تسخیر کائنات کے فارمولوں کے ماہر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں۔

اے منافقو!

کلام نبوت سنو۔ آخرت کو دنیا کے عوض فروخت کرنے والو! حق کو مخلوق کے عوض بیچنے والو! فانی کا باقی کے بدلے کاروبار کرنے والو! تمہارا بیوپار سراسر خسارے کا سودا ہے، تمہارا سرمایہ تمہیں بربادی کے گڑھے میں دھکیل رہا ہے۔ افسوس تم پر۔ تم اللہ کے غضب کا ہدف بن رہے ہو۔۔۔۔۔!

ایٹم بم

جب کوئی بندہ کسی ایک نقطہ پر اپنی پوری صلاحیتیں مرکوز کرکے غور کرتا ہے تو اس کی صلاحیتوں میں اتنی وسعت پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ اس نقطے کو جس کے اوپر جسم کی تمام صلاحیتیں مرکوز ہو گئی ہیں، پڑھ لیتا ہے۔ پڑھنے سے منشاء یہ ہے کہ نقطے کے اندر موجود اوصاف اور نقطے کے اندر موجود خفیہ صلاحیتیں اور صلاحیتوں کے اندر مخفی صلاحیتیں اس کے سامنے آ جاتی ہیں۔ جب زیادہ گہرائی میں دیکھتا ہے تو نقطہ اس کو اپنا استعمال بتا دیتا ہے۔ نقطے کے اندر مخفی صلاحیتیں اس بات کا مشاہدہ بن جاتی ہیں کہ پوری پوری کہکشائیں ہمارے ساتھ سفر کر رہی ہیں۔ ہم جان لیتے ہیں کہ دنیا میں موجود ہر شئے لہروں پر قائم ہے۔ ہم اور پوری کائنات لہروں کے تانے بانے سے مرکب ہے۔ دنیا کی ہر شئے چاہے وہ پانی ہو، درخت ہو، پتھر ہو، انسان ہو، چرند ہو، پرند ہو، انرجی ہو، آکسیجن ہو یا ایٹم مالیکیول، روشنیوں کے ہالے میں بند ہے یعنی ہر شئے کے اوپر روشنی کا غلاف ہے۔ نظر کے سامنے پہلا انکشاف طاقت کا ہوتا ہے۔ مزید گہرائی پیدا ہوتی ہے دوسرا انکشاف اس طاقت کے استعمال کا ہوتا ہے۔

جب اور زیادہ گہرائی میں دیکھتا ہے تو نقطہ اس کو اپنا استعمال بتا دیتا ہے۔ جب ہیروشیما اور ناگاساگی کے اوپر ایٹم بم گرایا گیا تو ایٹم کی طاقت کا مظاہرہ اس شکل میں ہوا کہ جن پہاڑوں پر بم گرایا گیا تھا تو وہ پہاڑ دھواں بن گئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ پہاڑ کھڑے ہیں لیکن جب پہاڑ کو چھوا گیا تو دھویں کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ سوال یہ ہے کہ طاقت کا کھوج کس نے لگایا۔ طاقت کا استعمال کس نے کیا اور طاقت کے استعمال سے کون متاثر ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ایٹم کا کھوج انسانوں نے لگایا اس کی طاقت کو انسانوں نے استعمال کیا اور اس طاقت کے تخریبی اور تعمیری پہلو سے بھی انسان ہی متاثر ہوا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایٹم کے اندر طاقت اللہ کی تخلیق ہے اور طاقت کو استعمال کرنے کا طریقہ اللہ نے انسان کو سکھا دیا ہے۔ لاشعور بتاتا ہے کہ اللہ نے انسان کے اندر اتنی سکت اور صلاحیت منتقل کر دی ہے کہ وہ ایٹم کو اپنے ارادے اور اپنی منشاء کے مطابق استعمال کر سکتا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ خالق ہر حال میں تخلیق سے زیادہ باصلاحیت واصف اور باہمت ہے۔ ایٹم کی طاقت کے خالق کی حیثیت سے جب ہم انسانی کردار پر نظر ڈالتے ہیں تو دراصل ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایسی مخفی صلاحیتیں اور قوتیں عطا کر دی ہیں، جس کے سامنے ایٹم کی قوت کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ فرق صرف ایٹم کے استعمال کا ہے۔ ہم ایٹم کے اندر لہروں کو تلاش کرتے ہیں، جب ہر چیز لہروں پر قائم ہے تو انسانی وجود بھی لہروں سے بنا ہوا ہے۔

جو تباہی یا بربادی کا پیش خیمہ ہیں یا ان صلاحیتوں کو تلاش کرتے ہیں جو نوع انسانی کی تعمیر لہروں میں قائم وجود میں تفکر انسان کے اوپر منکشف کر دیتا ہے کہ انسان میں تخلیق صلاحیت موجود ہے۔ جس طرح ایٹم ایک نقطہ ہے اور اس کے اندر ایسی طاقت محفوظ ہے کہ اگر انہیں تخریبی ذہن سے استعمال کیا جائے تو زمین الٹ پلٹ ہو جاتی ہے۔ پورے پورے شہر آناً فاناً تباہ و برباد ہو جاتے ہیں۔ اس ایٹم کو اگر تعمیر میں استعمال کیا جائے تو بجلی ایجاد ہو جاتی ہے۔ وہ بجلی جو سائنسی ترقی میں کسی نہ کسی طرح موجود ہے۔

انسان کے اندر بھی ایک ایٹم ہے اس ایٹم یا نقطے کے اندر بیشمار طاقتیں ذخیرہ ہیں۔ جب یہ ایٹم کھلتا ہے تو آدمی وسائل سے بے نیاز ہو کر روحانی طور پر ان فارمولوں کا مشاہدہ کر لیتا ہے جن فارمولوں سے سورج بنتے ہیں، چاند بنتے ہیں۔ جن فارمولوں اور کلیوں کے اوپر زمین گردش کر رہی ہے۔

مثال: ہم شربت بناتے ہیں ہمیں معلوم ہے کہ پانی چینی میں گھول دی جائے تو شربت بن جاتا ہے اور اس شربت میں خوشبو ملا دی جائے تو شربت خوش نما بن جاتا ہے۔ اسی شربت میں کوئی ایسی ٹھنڈی دوا شامل کر دی جائے جو خون کو ٹھنڈا کر دے تو یہ شربت گرمی سے ہونے والے مرض کا علاج بن جاتا ہے۔

روٹی پکانا ایک فارمولے کے اوپر قائم ہے۔ جب ہم روٹی کا تذکرہ کرتے ہیں تو روٹی سے متعلق جتنے اعمال ہیں وہ خود بخود زیر بحث آ جاتے ہیں۔

روٹی کا مطلب ہے زمین کے اندر گیہوں ڈالنا، زمین کی کوکھ میں دور کرنے والی روشنیوں اور لہروں کا گیہوں کے بیج پر اثر انداز ہوتا ہے۔ گیہوں کے بیج کے اندر موجود روشنیوں اور لہروں کا زمین کی لہروں اور روشنیوں سے باہم مل کر ایک دوسرے کا تاثر قبول کرنا، ایک دوسرے کے اندر لہروں کا جذب ہونے کے بعد گیہوں کے بیج میں کلہ پھوٹنا، بیج کی پیدائش کے بعد زمین کی کوکھ سے باہر آنا، سورج کی تپش سے پکنا، چاند کی چاندنی سے گیہوں کے اندر مٹھاس پیدا ہونا، گیہوں کے بیج کا جوان ہونا اور پھر اس کو چکی میں پیسنا، آٹا بننا، آٹے اور پانی کے ملاپ سے ایک نئی شکل اختیار کرنا، آٹے اور پانی کے ملاپ سے جو مرکب بنا ہے اس مرکب کو آگ پر پکانا، ان تمام عوامل سے گزر کر روٹی پکتی ہے۔ ایک عام آدمی کہتا ہے روٹی کھاؤ بات ختم ہو گئی لیکن تفکر کرنیوالا بندہ یہ تلاش کرتا ہے کہ روٹی کہاں ہے اور کیسے وجود میں آئی۔ اس ہی طرح انسان بھی ایک نقطہ ہے۔

نقطے کو توڑا جائے بالکل اس طرح جس طرح ایٹم کو توڑا گیا ہے تو اس کے اندر عجائبات نظر آتے ہیں جس کو اللہ تعالیٰ نے کائنات کہا ہے۔ انسان کی پوری نسل، انسان کی پوری نوع، جنات اور جنات کی پوری نوع، فرشتے، آسمان، جنت، دوزخ، عرش اور انتہا یہ کہ خود اللہ تعالیٰ بھی اس نقطے کے اندر موجود ہے۔ جب یہ نقطہ کھلتا ہے تو انسان مشاہداتی طرزوں میں قدم قدم سفر کر کے منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے اور مقصود اور منظور و مطلوب اللہ تعالیٰ ہے۔ تصوف میں اس نقطے کا نام ''فواد'' ہے جس کا ترجمہ دل ہے۔ یہ

وہی دل ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنا مسکن اور اپنا گھر قرار دیا ہے۔ یہ وہی دل ہے جو کبھی غلط بیانی نہیں کرتا، کبھی جھوٹ نہیں بولتا، جو کچھ دیکھتا ہے حقیقت دیکھتا ہے۔ دل خالق کائنات کو دیکھتا ہے۔ خالق کائنات دل کو دیکھتا ہے۔

دائرہ اور مثلث

دو آدمی جب ایک جگہ جمع ہوتے ہیں تو ان کی یہ مجبوری ہے کہ کوئی نہ کوئی بات کرتے ہیں۔ کیا بات کرتے ہیں؟ یہ ان کی دلچسپی پر منحصر ہے۔

سینما فلم دیکھنے کے شوقین فلم ہیرو، ہیروئن کی بات کرتے ہیں۔ مذہبی لوگ مذہب کی بات کرتے ہیں۔ سیاسی لوگ سیاست کی بات کرتے ہیں۔ ستارہ شناس ستاروں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ایک باغبان پھولوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ اگر کسی کو پرندے پالنے کا شوق ہے تو وہ پرندوں کی قسمیں بیان کرتا ہے۔ ہماری نظر میں ہر کبوتر، کبوتر ہے لیکن کبوتر باز سے جب بات ہوتی ہے تو وہ کبوتروں کی اعلیٰ اور اسفل نسلوں کے بارے میں بات کرتا ہے۔ ان کے ایسے نام بتا دیتا ہے جو کبھی عام آدمی نے نہیں سنے ہوتے۔ اس بات کو جتنا بھی بیان کیا جائے یہ پھیلتی چلی جاتی ہے۔ تذکرہ دو آدمیوں کے ایک جگہ ہونے کا تھا۔ سو دو آدمیوں نے بات شروع کر دی۔ ایک نے کہا" یہ دنیا گول ہے۔" دوسرے نے پوچھا۔ "کس طرح گول ہے؟" پہلے نے جواب دیا۔ وہ سامنے دیکھو! درخت کا تنا گول ہے۔ درخت کی ہر شاخ گول ہے۔ پہلا بولا۔ آدمی تو گول نہیں ہے۔ پہلے نے کہا آدمی گول نہیں تو آدمی سرکل ہے۔ جیسے ہی گفتگو میں سرکل Circle زیر بحث آیا۔ ٹرائی اینگل Triangle کا تذکرہ نکل آیا۔ دوسرے آدمی نے پہلے آدمی سے پوچھا اگر ہم سرکل کو بیچ میں سے کاٹ دیں تو کیا رہ جائے گا۔ دوسرے آدمی نے اس بات پر غور کیا اور وہ گویا ہوا۔ سرکل مثلث میں تقسیم ہو جائیگا۔ اس قسم کی گفتگو وہ لوگ کرتے ہیں جنہیں اپنے اِنر Inner سے دلچسپی ہوتی ہے، Inner کو ہم اس وقت تک نہیں جان سکتے جب تک انر کا متضاد پہلو "ظاہر" موجود نہ ہو۔ بات آگے بڑھی تو دو صورتیں نمایاں ہوئیں۔

۱۔ ظاہر صورت ۲۔ باطنی صورت

ہم ظاہری صورت کا نام مظہر رکھتے ہیں اور باطنی صورت کا نام مستور۔ بات سمجھنے اور سمجھانے کی ہے اور یہ مجبوری ہے کہ سمجھنے کے لئے نام ضروری ہے۔ اس لئے کہ دنیا میں کوئی شئے ایسی نہیں ہے جس کا نام نہ ہو۔ ہماری زندگی اربوں کھربوں ناموں کی محتاج ہے۔ یہ نام ہی دراصل علم ہے۔ یہ نام ہی حواس کی تقسیم ہے۔ یہ نام ہی دراصل ایک دوسرے کو پہچاننے کا ذریعہ ہیں۔ کتا، بکری، بھیڑ، سور ایک ہی طرح کی مخلوق ہے لیکن الگ الگ ناموں نے الگ الگ کر دیا ہے۔ کبوتر، فاختہ، مینا، کوئل ایک ہی طرح کی مخلوق

ہیں لیکن نام سب کے لئے الگ الگ پہچان کا ذریعہ ہیں۔ ہزاروں قسم کے رنگ بے رنگ خوشبو اور بغیر خوشبو کے پھول ہیں، ان ہزاروں پھولوں کے ہزروں نام ہیں۔

پانی، پیٹرول، مٹی کا تیل دیکھنے میں تو پانی ہی لگتے ہیں لیکن الگ الگ ناموں نے ان سب کی خاصیتیں الگ کر دی ہیں۔ ہر آدمی، آدمی ہے لیکن چار رنگوں نے آدمی کی نسلوں کو الگ الگ کر دیا ہے۔ یہ بھی ایک ایسی حقیقت ہے کہ اس پر جتنی سوچ بچار کی جائے نئے نئے فلسفے اور فلسفوں میں نئی نئی شاخیں، نئی نئی معلومات سامنے آتی رہتی ہے۔ آدمی ایک نام ہے لیکن آدمی بہت سارے ناموں سے مرکب ہے مثلاً دماغ، دل، پھیپھڑے، پتہ، لبلبہ، گردے، مثانہ وغیرہ وغیرہ۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ آدمی ہے تو دراصل ہم آدمی کے ان کل پرزوں کا تذکرہ کرتے ہیں جن سے آدمی بنا ہے اور جن کل پرزوں اور اعضاء پر حرکت کر رہا ہے بات کرنا بھی عجیب ہے، بات سے بات نکلتی رہتی ہے اور اتنی باتیں ہو جاتی ہیں کہ آدمی ٹٹولتا رہ جاتا ہے لیکن اس کے ہاتھ کچھ نہیں آتا۔ صدائے جرس کا مطلب ہے گھنٹی کی آواز۔ جب ہم آواز کے بارے میں سوچتے ہیں تو آوازوں کا ایک طوفان نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ گھنٹی کی آواز، گھنٹے کی آواز، طبلے کی آواز، ساز کی آواز، گھنگروں کی آواز، پانی کے جھرنوں کی آواز، آبشار کی آواز، مینا کی آواز، کوے کی آواز، کوئل کی کوک۔

آوازوں کے خالق اللہ نے قرآن پاک میں فرمایا:

"اور آواز تو گدھے کی بھی ہے۔"

آواز کا جادو بھی عجیب جادو ہے۔ اچھا لحن، سریلی آواز آدمی کو مسحور کر دیتی ہے۔ کرخت آواز آدمی کے اوپر بار بنتی ہے۔ شیریں آواز پر آدمی فریفتہ ہو جاتا ہے اور ایک آواز وہ آواز بھی ہے جو صورت سرمدی میں وہ آدمی جو انسانیت کی معراج حاصل کر لیتا ہے اللہ کی آواز سنتا ہے۔ بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ ذکر دو آدمیوں کا تھا۔ پہلے کا نام مظہر اور دوسرے کا نام مستور رکھتے ہیں۔ اس لئے کہ نام رکھے بغیر بات آگے نہیں بڑھتی۔ مسٹر مظہر کا کہنا ہے کہ دنیا میں ہر چیز گول جبکہ مستور کہتا ہے کہ دنیا کی ہر چیز مثلث ہے۔ میں نے آنکھیں بند کر کے ذہنی یکسوئی کے ساتھ اندر دیکھا تو مجھے یہ نظر آیا کہ آدمی اگر اندر دیکھے سرکل ہے اور یہی آدمی اگر باہر دیکھے تو مثلث ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو چیز مادی آنکھ سے نظر آتی ہے وہ مثلث ہے اور جو شئے مادی آنکھ کے برعکس اندر کی آنکھ سے نظر آتی ہے وہ سرکل ہے۔

آیئے تجربہ کریں!

ایک فل اسکیپ سفید بغیر لائنوں کا کاغذ لیں۔ پینسل اور پرکار سے ایک بڑا دائرہ Circle بنائیں۔ اس سرکل کو اسکیل سے بیچوں بیچ کاٹ دیں۔ یہ سرکل مثلث بن جائے۔ اس کاغذ کو کسی گتے پر اس طرح چپکائیں کہ کاغذ میں سلوٹیں نہ ہوں اور اس کو چار فٹ

فاصلے پر دیوار پر لٹکا دیں اور اس کو غور سے دیکھیں۔اور ہمیں بتائیں کہ بات مسٹر مظہر کی صحیح ہے یا مسٹر مستور جو کہتے ہیں وہ صحیح ہے۔

دیکھئے پردۂ غیب سے کیا ظہور آتا ہے۔

دنیا کی کہانی

کہا جاتا ہے کہ یہ دنیا سترہ بار ختم ہو کر دوبارہ آباد ہوئی ہے۔تاریخی شواہد سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ایک معین وقت کے بعد وہ معین وقت دس ہزار سال بھی ہو سکتا ہے۔خشک زمین پر آباد دنیا تہہ آب آجاتی ہے۔شعور زمین کے اندر غاروں سے شروع ہوتا ہے اور بتدریج شعور جوان ہوتا ہے اور جیسے جیسے شعور جوانی کی دہلیز پر قدم بڑھاتا ہے انسان ترقی یافتہ کہلاتا ہے لیکن یہ بات ہر زمانے میں موجود رہتی ہے کہ انسان شعوری تقاضے پورے کرتا ہے۔شعوری تقاضے کس طرح پورے کرتا ہے کہ ''کس طرح'' ہی ارتقاء ہے۔کسی زمانے میں انسان آگ کا استعمال دیکھ کر ترقی کرتا ہے اور کبھی لوہے کی دریافت ترقی کا ذریعہ بنتی ہے اور ارتقاء کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ انسان توانائی کے علم سے واقف ہو جائے۔غاروں کی زندگی کا دور ہو،دھات کی دریافت کا زمانہ ہو،آگ سے واقفیت ہو یا انسانی ذہن توانائی کے فارمولوں سے واقف ہو جائے۔بہر حال انسان گھٹتا،بڑھتا،مٹتا اور فنا ہوتا رہتا ہے۔ایسا بھی ہوتا ہے کہ بڑے بڑے بادشاہ جو لوگوں سے خراج وصول کرتے تھے جب زیر زمین دفن ہو جاتے ہیں تو یہ لوگ جو خراج دیتے تھے اس زمین کو جس میں وہ دفن ہیں پیروں میں روندتے پھرتے ہیں۔

آبادی کی توجیہہ کی جائے تو آبادی دراصل گھٹنے اور بڑھنے کے عمل کا نام ہے۔اس وقت زمین پر چھ ارب انسان آباد ہیں یقیناً یہ آبادی پہلے بہت کم تھی اور ہو سکتا ہے کہ چھ ارب کی آبادی اکیسویں صدی میں ایک ارب ہو جائے۔

زمین جس سسٹم System پر چل رہی ہے۔اس System میں بنیادی عنصر یہ ہے کہ ہر مخلوق ایک نقطہ ہے۔یہ سسٹم اس لئے ضروری ہے کہ نقطہ کا پھیلاؤ اگر تقسیم در تقسیم نہ ہو تو سسٹم میں ایسی خرابی واقع ہو جائے گی کہ سارا سسٹم تباہ و برباد ہو جائے گا اور جب سسٹم میں خرابی واقع ہوتی ہے۔زمین سمندر بن جاتی ہے اور سمندر زمین بن جاتا ہے۔

دانشور مساوات کا درس دیتے ہیں۔سائنسدان Human Rights کا نعرہ لگاتے ہیں۔زود وزیاں کا ایک سلسلہ ہے جو اس وقت سے قائم ہے جب سے دنیا آباد ہے اور اس وقت تک قائم رہے گا جب یہ سیارہ Collaps ہو گا۔

کسی نظام کو چلانے اور قائم رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ نظام چلانے کیلئے توانائی موجود ہو توانائی فراہم کرنے کیلئے ضروری ہے کہ توانائی کی تخلیق ہوتی رہے۔ضروری ہے کہ اسے فیڈنگ (Feeding) ملتی رہے اور جب ہم Feeding کا تذکرہ کرتے ہیں تو

لامحالہ ذہن اس طرف جاتا ہے کہ مقتدر اعلیٰ ہستی جب کچھ کہتی ہے تو مثالوں اور ٹکڑوں میں بیان کرتی ہے اس لئے کہ مخلوق کا شعور مٹر کے دانے سے بھی چھوٹا ہے۔اور بڑھتے بڑھتے یہاں تک پہنچا ہے کہ دو کھرب صلاحیتوں میں دو سو سے زائد صلاحیتوں پر عبور حاصل کرنے والا بندہ دنیا میں باشعور، باصلاحیت، دانشور، علامہ، مفکر اور سائنسدان کہلاتا ہے۔شعور کی یہ محدودیت اس بات کی متقاضی ہے کہ بہت بڑی بات کو چھوٹی بات میں بیان کیا جائے۔مقتدر اعلیٰ ہستی کہتی ہے:

''یہ نظام (سسٹم) نورالاعلیٰ نور ہے جس پر چاہے اسے کھول دیتا ہے اور اللہ لوگوں کو مثالوں سے سمجھاتا ہے۔'' (القرآن)

نوع انسانی کا ہر فرد یہ بات جانتا ہے کہ آدمی آدم کا بیٹا ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایک باپ آدم کی چھ ارب اولادیں ہیں۔یہ چھ ارب اولادیں وہ ہیں جو زمانے کی شکست وریخت سے بچ گئی ہیں اور جواب شکست وریخت کے بھنور میں آچکی ہیں۔یہ کون نہیں جانتا کہ آدم کا ہر بیٹا، ہر بیٹی حالات کے ہاتھ میں کھلونا ہے۔حالات اس میں جس طرح چابی بھر دیتے ہیں کھلونا چلتا ہے، کودتا ہے، روتا ہے، ہنستا ہے، سوتا ہے، جاگتا ہے، جیتا ہے اور مرتا ہے۔دنیا کا کوئی آدمی یہ نہیں چاہتا کہ بوڑھا ہو لیکن بوڑھا ہوتا ہے۔سنکھوں کی تعداد میں زمین پر آنے والے اور جانے والے لوگوں میں کوئی نہیں چاہتا کہ وہ مر جائے لیکن مرنا اتنا ہی یقینی ہے جتنا یقین پیدا ہونے پر ہے۔بات بہت بڑی ہے چھوٹی کر کے بیان کرنے کی ہو رہی تھی۔انسانی زماریات سے سنکھوں زیادہ بڑی تعداد میں سسٹم کے کل پرزوں پر غور کیا جائے تو اندھی آنکھ کو بھی نظر آتا ہے کہ یہ سارا سسٹم ٹکڑوں اور فنائیت پر تقسیم شدہ ہے۔جیسے جیسے آدم کی اولاد زمین پر پھیلتی گئی اسی مناسبت سے سسٹم تقسیم ہوتا رہا۔چار اولادوں کے لئے ایک مکان بنا، چار سے زائد اولادوں کے لئے دوسرا مکان بنا، جیسے جیسے تعداد میں اضافہ ہوتا رہا خاندان، کنبہ، برادری، قبیلے، قومیں تشکیل ہوتی رہیں۔حقیقت پر مبنی ان مثالوں سے ثابت ہیں کہ جب تک کوئی چیز ٹکڑے ٹکڑے ہو کر نہیں پھیلتی اس کا وجود مظہر نہیں بنتا۔زمین کی یہ ڈیوٹی ہے کہ ٹکڑوں کو ذرات میں تبدیل کرے یہ ذرات ہی زمین کا کنبہ ہیں۔مثال یہ ہے کہ ہم زمین کا ایک قطعہ تیار کریں اور قطعہ پر آم، بادام، امرود، انار، ناریل، چیکو، شریف، جامن، پپیتہ، سیب، گنا، پھول ترکاریاں وغیرہ کاشت کریں۔جیسے ہی کسی ایک نوع کا بیج جس کو ہم نطفہ کہہ سکتے ہیں، زمین کے رحم میں داخل ہو جاتا ہے۔زمین اسے توڑ دیتی ہے اور بیج زمین کے ذرات میں تبدیل ہو جاتا ہے۔بیج کا فنا ہونا بیج کا مٹ جانا بیج کی اپنی حیثیت ختم ہو جانا ہی دراصل زمین کے اوپر درختوں، پودوں، پھلوں اور پھولوں کا مظاہرہ ہے۔یہ بات شعور کی ہے۔

کس شعور کی؟ اس شعور کی جو دو کھرب خلیوں میں سے دو سو خلیوں پر قائم ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ ایک کھرب ننانوے کروڑ ننانوے لاکھ ننانوے ہزار آٹھ سو خلیئے کہاں گئے۔ہم ان سے واقف کیوں نہیں ہیں۔جب کہ وہ ہمارے اندر موجود ہیں۔ہم اتنی بڑی تعداد کو اس لئے بھولے ہوئے ہیں کہ ہم دو سو صلاحیتوں کے گرداب میں قید ہو چکے ہیں

اور قید سے آزادی کا قانون یہ ہے کہ جو چیز خود کو فنائیت میں منتقل کر دیتی ہے وہ چیز پھیلتی ہے، بڑھتی ہے۔ برگد کا درخت آپ کے سامنے ہے۔ مشہور ہے کہ برگد کے درخت کے نیچے باراتیں ٹھہرتی ہیں۔ تھکے ماندے مسافر بارش اور دھوپ میں برگد کا سایہ تلاش کرتے ہیں۔ آپ کیا سمجھے ؟

میں کیا عرض کر رہا ہوں؟ آپ کیا سمجھے ؟ کہ میں آپ کی توجہ کس طرف مبذول کرنا چاہتا ہوں؟ آپ کیا سمجھے کہ میں آپ کو کن گہرائیوں سے آشنا کرنا چاہتا ہوں؟ آپ کیا سمجھے کہ میں ''علم لدنی'' کا کونسا قاعدہ پڑھا رہا ہوں؟

برگد کا بیج خشخاش کے دانے سے چھوٹا ہوتا ہے۔ لیکن جب زمین کے اندر جا کر اپنے مادی جسم (شعوری نظام) کو فنائیت میں تبدیل کر دیتا ہے تو قدرت اس ایثار کو پسند کرتی ہے اور برگد کا بیج جو خشخاش سے چھوٹا ہوتا ہے بہت بڑا درخت بن جاتا ہے۔

اس طرح جب کوئی انسان اپنے مادی وجود (شعوری نظام) کو روحانی نظام میں فنا کر دیتا ہے تو وہ حضور قلندر بابا اولیاءؒ کے ارشاد کے مطابق: ''شجر سایہ دار بن جاتا ہے۔''